تزکیۂ نفس

تزکیۂ نفس

کامل

تالیف:

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

فاران فاؤنڈیشن

لاہور — پاکستان

سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۰

جملہ حقوق محفوظ

جدید ایڈیشن

ناشر: ـــــــــ ماجد خاور
مطبع: ـــــــــ مکتبہ جدید پریس۔ لاہور
طابع: ـــــــــ رشید احمد چودھری
اشاعت: ـــــــــ ترتیب نو طبع دوم۔ 500
تاریخ اشاعت: ـــــــــ دسمبر 2002ء۔ شوال 1423ھ
ادارہ: ـــــــــ **فاران فاؤنڈیشن**
122- فیروز پور روڈ، اچھرہ
لاہور- 54600 - پاکستان
فون: 042 - 7595200
E-mail: faran@wol.net.pk
قیمت: 285 روپے

فہرس

عرض ناشر 15
دیباچہ 17

تمہید

باب ۱ دین میں تزکیہ نفس کی اہمیت اور اس کی عمومی ضرورت 25
انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد 25
تزکیہ کا علم نہ راز ہو سکتا ہے نہ نا مکمل 30
بعض احادیث سے غلط استدلال 32

باب ۲ تزکیہ کا لغوی مفہوم، اس کا مقصد اور اس کی وسعت 42
تزکیہ کا اصطلاحی مفہوم 43
علم تزکیہ کی وسعت 44
علم تزکیہ کا اصلی کام 44
خوب سے خوب تر کی جستجو 45
تزکیہ کا اصل موضوع 47
نفس انسانی کے مختلف پہلو 48
تزکیہ علم و ادراک 49

تزکیۂ عمل 50

تزکیۂ تعلقات و معاملات 51

تزکیۂ علم

باب ۳ تزکیۂ علم 57

علم حقیقی کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے 57

خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم 61

معرفت الٰہی حاصل کرنے کا طریقہ 65

فلاسفہ کی رائے 65

متکلمین کی رائے 66

صوفیہ کی رائے 67

صوفیوں کے نزدیک علم اور معرفت کی حقیقت 68

علم کی حقیقت 69

معرفت کی حقیقت 72

فلاسفہ اور متکلمین کے نظریات پر تبصرہ 73

شیخ الاسلام کے نظریات پر تبصرہ 75

خدا کی معرفت کے بارہ میں صحیح مسلک 88

باب ۴ تدبرِ قرآن اور اس کے آداب و شرائط 96

نیت کی پاکیزگی 96

قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے 98

قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم 100

تدبر 102

تفویض الی اللہ 103

باب ۵ اسوۂ حسنہ 105

منصب رسالت سے متعلق چار بنیادی غلط فہمیاں 105

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت 110

ایمان 111

اطاعت 113

اتباع 116

محبت 118

اطاعت بلا محبت اور محبت بلا اتباع 120

باب ۶ حجاباتِ علم 124

حب عاجلہ 125

تکبر 129

عصبیت جاہلیت 132

غفلت اور لاابالی پن 133

باب ۷ آفاتِ علم 136

غفلت اور بے پروائی 137

خواہشاتِ نفس کی پیروی 141

عدم احتساب 146

بدعت 150

تحریف 152

کتمانِ حق 153

اشتغال بالادنیٰ 157

باب ۸ حجاباتِ علم اور آفاتِ علم کا علاج	160
اشتغال بالادنیٰ کے اسباب اور اس کا علاج	160
اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کے اسباب	161
وقت کی قدر و قیمت سے بے خبری	162
اپنے مرتبہ سے بے خبری	164
پست ہمتی و بے صبری	166
ادنیٰ پرستوں کی کثرت	168
اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کے اسباب کا علاج	170
باب ۹ کتمانِ علم کے اسباب اور اس کا علاج	176
معاشرہ کی ذمہ داری سے بے خبری	178
خوف اور طمع	186
بے حمیتی	189
مداہنت	194
باب ۱۰ بدعت، اس کے اسباب اور اس کا علاج	199
بدعت کی تعریف	199
دین اور دنیا کے حدود	200
بدعت کا دائرہ	205
بدعت کے دو بڑے سبب	207
غلو پسندی	208
خواہشاتِ نفس کی پیروی	216
بدعت کا علاج	220

تزکیۂ عمل

باب ۱۱ تزکیۂ عمل	225
عمل کے محرکات	228
مذکورہ محرکات کی حیثیت	231
خامیوں کا علاج	232
حدودِ الٰہی کی پابندی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت	235
ذکرِ الٰہی	237
فکرِ آخرت	238
حجاباتِ ذکر و فکر	238
باب ۱۲ نماز، آفاتِ نماز اور ان کا علاج	240
نماز کے شرائط	241
نماز کے اوقات	242
نماز کی ہیئت	244
نماز کی دعائیں	245
نماز کی آفات	249
کسل	249
وسوسہ	252
مدعا سے بے خبری	255
چوری	256
ریا	257
باب ۱۳ انفاق اور آفاتِ انفاق	259
انفاق کی برکات	260
اللہ تعالیٰ کے ساتھ حقیقی لگاؤ	260

معاشرے کے ساتھ حقیقی ربط 261
انفاق سے حکمت حاصل ہوتی ہے 263
مال میں برکت 264
باب ۱۴ آفاتِ انفاق اور ان کا علاج 267
چھدا اتارنے کی خواہش 267
احسان جتانا اور بدلہ چاہنا 270
سائلوں کے ساتھ بدسلوکی 273
انتقام وعناد کا جذبہ 275
احساس برتری 277
ریا اور نمائش 278
باب ۱۵ روزہ اور برکاتِ روزہ 280
روزے کی برکات 282
روح ملکوتی کی آزادی 282
سدِ ابوابِ فتنہ 285
قوت ارادی کی تربیت 287
جذبہ ایثار کی پرورش 288
قرآن مجید سے مناسبت 289
تبتل الی اللہ 289
باب ۱۶ آفاتِ روزہ اور ان کا علاج 291
لذتوں اور چٹخاروں کا شوق 291
اشتعالِ طبیعت 293
دل بہلانے والی چیزوں کی رغبت 294

ریا 296
باب ۱۷ حج اور برکاتِ حج 298
حج جامع عبادت ہے 298
حج انسان پر ہر راہ سے اثر انداز ہوتا ہے 302
حج کی برکات 304
روحانی کایا کلپ 304
جنت کی ضمانت 304
تجدید عہد 305
امت کی وحدت کا مظاہرہ 307
باب ۱۸ آفاتِ حج اور ان کا علاج 308
شہوانی باتیں 308
حدود اللہ اور شعائر الٰہی کی بے حرمتی 311
جنگ وجدال 315
فسادِ نیت 316
شعائر کی حقیقت سے بے خبری 318

تزکیۂ تعلقات

باب ۱۹ ایمان اور اسلام 323
ایمان اور اسلام لازم و ملزوم ہیں 323
ایک عام غلط فہمی کا ازالہ 324
ایمان اور اسلام جامد نہیں ہیں 327
ایک ضروری تنبیہ 331
اسلام کے کامل نمونے 332

باب ۲۰ تعلق باللہ اور اس کی اساسات 334
ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ 336
باب ۲۱ شکر 339
باب ۲۲ عبادت 343
باب ۲۳ اطاعت 347
باب ۲۴ اخلاص 352
باب ۲۵ محبت 358
ایک سوال اور اس کا جواب 359
خدا سے محبت کے لیے اس کی معرفت ضروری ہے 361
اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کا راستہ 364
محبت الٰہی کے حصول کا عملی راستہ 365
ایک تنبیہ 366
باب ۲۶ خوف 369
اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ 369
خوف الٰہی کے اصلی محرکات 371
زندگی پر خوف الٰہی کے اثرات 376
ایک ضروری تنبیہ 381
باب ۲۷ حیا 382
حیا کے اصل عوامل 384
اس خصلت کی تربیت کا طریقہ 388
باب ۲۸ وفا 390

عہد فطرت 390
میثاق شریعت 393
وفاداری بشرط استواری 395
آیت کی تفسیر 396
باب ۲۹ حمیت، حمایت اور جہاد 401
حمیت 402
حمایت 406
جہاد 410
باب ۳۰ انسان کا تعلق اپنی ذات سے 414
نفس کے حقوق 418
پہلا حق — معرفت نفس 419
دوسرا حق — تربیت نفس 420
تیسرا حق — عزت نفس 422
چوتھا حق — احتساب نفس 425
باب ۳۱ آدمی کا تعلق کنبہ، خاندان، معاشرہ اور ریاست سے 427
باب ۳۲ آدمی کا تعلق کنبہ اور خاندان سے 431
ماں باپ کے ساتھ آدمی کا تعلق 431
والدین سے متعلق اولاد کے فرائض 435
باب ۳۳ آدمی کا تعلق اپنے کنبہ اور بیوی بچوں سے 441
قوامیت کی ذمہ داریاں اور فرائض 444
پرورش اور کفالت 444

تعلیم و تربیت 447
گلہ کی حفاظت 448
مستقبل سے متعلق فکر مندی 449
بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز راہ 451
نصیحت اور وصیت 452
باب ۳۴ آدمی کا تعلق غرباء و یتامیٰ اور پڑوسیوں سے 455
پڑوسی کی تین قسمیں 457
پہلی قسم کا پڑوسی 457
دوسری قسم کا پڑوسی 458
تیسری قسم کا پڑوسی 458
پڑوسی کے حقوق کی اہمیت 459
مثبت پہلو سے اصولی ہدایت 460
منفی پہلو سے اصولی تلقین 461
باب ۳۵ آدمی کا تعلق معاشرہ سے 463
مرحلہ دعوت 465
مرحلہ ہجرت 470
مرحلہ جہاد 471
باب ۳۶ آدمی کا تعلق ریاست سے 482
حکومت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام 483
پہلی قسم کی حکومت 484
دوسری قسم کی حکومت 486
تیسری قسم کی حکومت 487
چوتھی قسم کی حکومت 493

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

فکر فراہی و اصلاحی میں تزکیۂ نفس کو گل سرسبد کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ کتاب قبل ازیں دو جلدوں میں شائع ہوتی رہی ہے۔ اس ایڈیشن سے اسے یکجا کر دیا گیا ہے۔ گویا موجودہ ایڈیشن اس کا کامل اور مستقل ایڈیشن ہے۔

اپنے منفرد مضمون اور معانی کے اعتبار سے حضرت الاستاذ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ گراں قدر تصنیف اپنے موضوع پر جداگانہ مقام رکھتی ہے اور طالبین علم حقیقی سے روز افزوں خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔ یہ بجا طور پر اس بات کی حقدار تھی کہ اسے مکمل نظر ثانی کے بعد اس کے شایان شان شائع کیا جائے۔ مضامین کے اعتبار سے کتاب کو درج ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ تمہید
۲۔ تزکیۂ علم
۳۔ تزکیۂ عمل
۴۔ تزکیۂ تعلقات

اس کتاب کے کامل اور جدید ایڈیشن میں — حسب روایت — مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کیا

گیا ہے:

۱۔ متن پر نہایت جامعیت کے ساتھ نظر ثانی کی گئی ہے اور ابواب اور فصلوں کو از سرِ نو — جہاں ضروری خیال کیا گیا ہے — ترتیب دیا گیا ہے اور عنوانات کو بھی جامع بنا دیا گیا ہے۔

۲۔ قرآن حکیم کے تمام حوالے مکمل نقل کیے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ تدبر قرآن کے مطابق کر دیا گیا ہے۔

۳۔ کتاب میں موجود تمام احادیث اور دیگر اقتباسات کو ان کے اصل ماخذوں سے تقابل کر کے درست کیا گیا ہے اور حوالے مکمل نقل کر دیے گئے ہیں۔ مزید برآں بعض جگہ اگر احادیث کا صرف ترجمہ دیا گیا تھا تو ان کی اصل عبارتیں بھی دے دی گئی ہیں۔

موجودہ پیشکش میں مجھ بندۂ حقیر و فقیر سے جو خدمت بن پائی یہ سرتاسر اس کی توفیق و نصرت کا کمال ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ!

لاہور | والسلام
20 ستمبر 2000ء | ماجد خاور

دیباچہ

فکری اعتبار سے یہ کتاب میرے دینی فکر کا لب لباب ہے۔ برسوں کے فکر و مطالعہ سے دین و شریعت کی جو روح میری سمجھ میں آئی ہے اس کو میں نے ان اوراق میں الفاظ کے جامہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے اس کتاب میں ان لوگوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے تزکیۂ نفس کے وہ اصول و مبادی ان شاءاللہ سامنے آجائیں گے جو کتاب و سنت میں بیان ہوئے ہیں اور ساتھ ہی وہ بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی جو غلط قسم کے تصوف کی راہ سے ہمارے اندر پھیلی ہیں۔

اس کتاب میں ایک خاص چیز جو ہر پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں محسوس کرے گا وہ یہ ہے کہ میں نے تزکیہ کو زندگی کے تمام اطراف پر حاوی کر دیا ہے۔ تصوف میں تزکیہ زندگی کے ایک نہایت محدود گوشہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن کتاب و سنت میں جس تزکیہ کا بیان ہے وہ ہماری زندگی کے ہر گوشہ سے بحث کرتا ہے۔ اس سے میری مراد صرف انفرادی زندگی ہی کا ہر گوشہ نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی کے نفس کے تزکیہ کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ خدا کے ساتھ اس کا تعلق چند متعین احساسات پر قائم ہو۔ جب تک ان اساسات پر اس کا تعلق خدا کے ساتھ نہ ہو اس کا تزکیہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایک شخص کے نفس کے تزکیہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ، حکومت اور بنی نوع انسان کے ساتھ بھی اس کے تعلقات چند متعین اساسات پر قائم ہوں، بغیر اس کے نفس کا تزکیہ ممکن نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی شخص کے صاحب تزکیہ ہونے کے لیے تنہا یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ ذاکر و شاغل اور زاہد و مرتاض ہو

بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے میرے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معاشرہ کا ایک خدمت گزار فرد اور اپنی ریاست کا اسلامی مفہوم میں ایک فرض شناس شہری بھی ہو۔

بعض لوگوں کو یہ باتیں ابتداءً کچھ انوکھی سی معلوم ہوں گی لیکن مجھے توقع ہے کہ اگر وہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو ان کا سارا تعجب رفع ہو جائے گا۔

تزکیہ نفس کے متعلق جو تصور صوفیہ کے واسطے سے رائج ہوا ہے اور جس سے عام طور پر لوگ واقف ہیں وہ انفرادی زندگی میں اپنی ذات کی اصلاح کا تصور ہے۔ اگر ایک شخص دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑتا، لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر اللہ اللہ کرتا اور بظاہر پاکیزہ زندگی گزارتا ہے تو اسے بہت بڑا عارف باللہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں میں اس کی بزرگی کا شہرہ ہو جاتا ہے، لوگ اس کی دعا اور نظرِ عنایت کے طالب بن جاتے ہیں اور اس کی ذات مرجع خلائق بن جاتی ہے۔ تزکیہ نفس کا یہ تصور ہمیں نہ قرآن مجید ہی سے ملتا ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگی ہی اس پر شاہد ہے۔ وہاں ہم تزکیہ کے جس مفہوم سے آگاہ ہوتے ہیں اس میں سب سے پہلے علم و عقیدہ کی اصلاح آتی ہے، عمل میں ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا حکم دیا جاتا ہے، عبادات خالی رسوم ہونے کے بجائے گہری حکمت پر مبنی اور بعض مقاصد تربیت کی حامل نظر آتی ہیں۔ آدمی کی زندگی کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے اس کو احکام دیے جاتے ہیں جن کی رو سے وہ اپنا تعلق ایک طرف خدا سے اور دوسری طرف انسان سے جوڑتا ہے۔ اس طرح تزکیہ نفس کوئی انفرادی اصلاح کا کام ہی نہیں رہ جاتا بلکہ اس میں انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں کا تصور بھی شامل ہو جاتا ہے اور سب سے بڑا عارف وہ شخص ہے جو دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو اس طرح ادا کرے جس طرح ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا اور جس کا کامل نمونہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں نظر آتا ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے وقت ہر شخص کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ایک کتاب زیادہ سے زیادہ جو خدمت انجام دے سکتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے موضوع پر قاری کے لیے ذہنی و فکری غذا فراہم کر دے۔ یہ کتاب اگر کسی حد تک بھی یہ خدمت انجام دے سکے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ رہا اس کے پیش کردہ نقشہ کے مطابق زندگی کو تبدیل کرنا تو یہ آدمی کے اپنے

ارادہ اور اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔

جو لوگ اس کتاب کو صرف پڑھ لینے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیں بلکہ اپنی زندگیوں کو سنوارنا بھی چاہیں تو انہیں تین باتوں کا اہتمام کرنا ضروری ہے:

پہلی چیز اصلاح اور تبدیلی کا سچا اور پکا ارادہ ہے۔ آدمی کا ارادہ اگر مضبوط نہ ہو اور وہ اس ارادہ سے کام نہ لے تو دنیا کی بہتر سے بہتر رہنمائی بھی اس کے لیے بالکل بے سود ہے۔ قرآن مجید سے بہتر کتاب دنیا میں اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن اس کا نفع بھی انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جو اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے عزم بالجزم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس سے کوئی بھی نفع نہیں پہنچ سکتا جو اس کی فصاحت و بلاغت کی تعریف میں تو بہت رطب اللسان رہتے ہیں لیکن اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا ارادہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا۔ تصوف کی اصطلاح میں جس کو مرید کہا جاتا ہے، میرے نزدیک اس سے بھی مراد در حقیقت وہی شخص ہے جو اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اس راہ میں ہر صعوبت خوش دلی کے ساتھ جھیلنے، ہر قربانی پیش کرنے اور جان و مال کی ہر بازی کھیل جانے کے لیے ہمہ تن مستعد ہے۔ جس مرید میں اس طرح کا ارادہ نہ پایا جاتا ہو وہ فی الحقیقت مرید ہی نہیں ہے۔

یہاں اس حقیقت کو خوب ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ارادہ اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ بعض لوگ خواہش ہی کا نام ارادہ رکھ لیتے ہیں اور اس سے وہی کچھ امیدیں باندھتے ہیں جو صرف ارادہ ہی سے باندھی جانی چاہئیں اور جو ارادہ ہی کی قوت سے پوری ہوتی ہیں۔ خواہش تمنا تو ہر مطلوب چیز کی کرتی ہے لیکن چوٹ کھانے کے لیے کسی چیز کے واسطے بھی تیار نہیں ہوتی۔ لیکن ارادہ جس چیز کا طلبگار ہوتا ہے اس کی راہ میں ہر جوکھم برداشت کرنے اور ہر رکاوٹ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو کر اس کا طلبگار بنتا ہے۔

دوسری چیز جو ضروری ہے وہ اللہ تعالیٰ سے ہر آن استعانت ہے۔ جو شخص خدا کی بندگی کے ارادہ کے ساتھ اٹھتا ہے اس کی ہر قدم پر آزمائش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس ارادہ میں مخلص ہے یا ریاکار۔ ان آزمائشوں سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق حاصل ہو۔ اگر خدا کی راہ پر چلنے کے لیے نکلے تو ہر قدم پر اس کی مدد کے لیے دعا کرتا رہے۔ سورہ فاتحہ

میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے ساتھ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ جو آیا ہے اس میں بھی یہی نکتہ ہے کہ خدا کی بندگی کا ارادہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل نہ ہو۔

تیسری چیز جس کا اہتمام ضروری ہے، وہ صحبت ہے۔ صحبت سے مراد یہ ہے کہ آدمی جب اس راہ پر چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اسے اپنے ہم سفر تلاش کرنے چاہئیں۔ ساتھیوں اور رفیقوں سے آدمی کی قوت و ہمت میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔

ہم سفر قوی بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی لیکن ان کی قوت اور کمزوری دونوں ہی آدمی کے لیے سہارا بنتی ہے۔ جب بھی وہ ہمت ہارنے لگتا ہے تو قوی کی عزیمت اس کی ہمت بندھاتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب اپنی خستگی اور ناتوانی کو دیکھ کر وہ مایوس ہونے لگتا ہے تو دوسرے خستگانِ راہ کو دیکھ کر اسے تسلی ہو جاتی ہے کہ تنہا وہی اس راہ کی صعوبتوں سے دوچار نہیں ہے بلکہ کچھ درماندگانِ راہ اور بھی ہیں۔ اور اس طرح وہ کبھی کسی کی قوت اور کبھی کسی کی کمزوری سے سہارا لیتا ہے اور دوسروں کو سہارا دیتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔

یہ رفاقت استاذ اور مرشد سے بھی حاصل ہوتی ہے اور ہم مسلک و ہم مشرب ساتھیوں سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ حاضر بھی اس معاملہ میں دستگیری کرتا ہے اور ماضی بھی آدمی کو سہارا دیتا ہے۔ زندوں اور مردوں میں جن کو بھی وہ اپنا درد آشنا پائے، ان کی معیت حاصل کرنے کی کوشش کرے، جن کو عملاً ساتھ لینا یا جن کے ساتھ چلنا ممکن ہو ان کو عملاً اپنے ساتھ لگائے یا ان کے ساتھ چلے اور جن کے صرف کارناموں اور سرگزشتوں سے روحانی غذا حاصل کرنا ممکن ہو ان سے ذہنی و روحانی ربط بڑھائے۔ اس طرح وہ کبھی تنہائی یا دل شکستگی نہیں محسوس کرے گا۔

یہ رفاقت و معیت اتنی ضروری چیز ہے کہ بسا اوقات اس کے لیے آدمی کو اپنوں سے کٹنا اور غیروں سے جڑنا بھی پڑتا ہے۔ یہ مرحلہ نفس پر بڑا شاق ہوتا ہے لیکن تزکیہ نفس کے جہاد میں کسی نہ کسی درجہ میں یہ ہجرت بھی ناگزیر ہے۔ تزکیۂ تعلقات کے مباحث میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہے کہ تعلقات کے تزکیہ میں اس ہجرت کو کتنی اہمیت حاصل ہے اور کس طرح یہ ہجرت ہر طالب تزکیہ کے لیے آج بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح کبھی پہلے تھی۔ اس کتاب میں میں

نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خدا اور بندوں کے ساتھ ایک آدمی کے تعلق کی بنیادیں قرآن و سنت کی رو سے کیا ہیں اور اس تعلق کے تقاضے کیا ہیں۔ صوفیہ کے رائج کردہ تصور کے مطابق تو آدمی کے مرتبہ کی معراج یہ ہے کہ وہ بھی غیب دان ہو جائے، اس کا فرمایا ہوا گفتۂ اللہ ہو جائے، اس کی پھونک دمِ مسیحا کا کام کرے اور اس کی ذات ذاتِ خداوندی ہی کا ایک پرتو بن جائے۔ میں نے قرآن و سنت کی رو سے بتایا ہے کہ آدمی کا خدا کا مطیع و فرمانبردار بندہ بننا اس کے تزکیہ کا منتہیٰ ہے۔ اسی طرح زندگی کے مسائل سے فرار کوئی نیکی نہیں بلکہ آدمی کا اپنے کنبہ میں والدین کا خدمت گزار اور وفادار ہونا، اعزہ و اقارب کے ساتھ احسان کرنا، بیوی بچوں کا خیال رکھنا اور ان کی اچھی تربیت کرنا، معاشرے کی اصلاح کرنا اور ریاست کا خیر خواہ ہونا تزکیہ نفس کے تقاضوں میں شامل ہے۔

تزکیہ تعلقات کی بحث میں میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق کو الگ سے بیان نہیں کیا اس لیے کہ اس موضوع پر تزکیہ عمل کے مباحث میں اسوۂ حسنہ کے تحت مفصل بحث ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے تزکیہ نفس کے تمام اہم نظری و عملی مباحث مکمل ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد ضرورت اس امر کی ہے کہ صبر، شکر، توکل، خوف، رجا، رضا وغیرہ صفات کو اہل تصوف نے جو معنی پہنا دیے ہیں ان کا جائزہ قرآن و سنت کی روشنی میں لیا جائے۔ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ صوفیہ ان اصطلاحات سے جو کچھ مراد لیتے ہیں وہ اس سے بہت کچھ مختلف ہے جو دین نے ہمیں سکھایا ہے۔

چونکہ اس کتاب کا موضوع وہ ہے جو تصوف کا موضوع ہے اس وجہ سے مجھے جگہ جگہ اس میں مروجہ تصوف پر تنقید بھی کرنی پڑی ہے۔ ممکن ہے یہ تنقید ان لوگوں کو کچھ ناگوار ہو جو اپنے اپنائے ہوئے کسی طریقہ پر کسی تنقید کے برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں لیکن ایک غیر جانبدار قاری ان شاء اللہ میری کسی تنقید کو بھی تحقیق حق اور حمایت کتاب و سنت کے جذبہ اور کوشش سے خالی نہیں پائے گا۔ اگر تحقیق حق کی اس کوشش میں کہیں میرا قلم حق سے منحرف ہو گیا ہے تو مجھ سے زیادہ اس کی اصلاح کا خواہش مند کوئی اور نہیں ہو گا۔ جو صاحب علم بھی میری اس طرح کی کسی لغزش سے آگاہ فرمائیں گے میں ان کا دل سے ممنون ہوں گا اور اس کتاب کے بعض مباحث پر اب تک

بعض لوگوں نے جو اعتراضات کیے ہیں وہ میں نے توجہ سے پڑھ لیے ہیں، ان میں کوئی بات مجھے ایسی نہیں ملی جو قابل لحاظ ہو۔ بعض لوگ تصوف کی حمایت میں تو بڑے سرگرم ہیں لیکن ان کو نہ تصوف کی خوبیوں کا پتا ہے نہ اس کی کمزوریوں کا۔ اس طرح کی بے خبرانہ تنقیدوں سے تحقیق حق کے مقصد میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کے مولف کو بھی اپنے نفس کی اصلاح کی توفیق حاصل ہو اور دوسرے پڑھنے والوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچے اور وہ اس کو لوگوں کی اصلاح اور ان کے اندر ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ بنائے۔ اور اگر اس میں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے تو اس کے ضرر سے اس کے مولف کو بھی محفوظ رکھے اور اس کے قارئین کو بھی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ!

والسلام

امین احسن اصلاحی

تمہید

باب ۱

دین میں تزکیۂ نفس کی اہمیت اور اس کی عمومی ضرورت

انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد

اگر یہ سوال کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کا حقیقی مقصود کیا ہے، وہ کیا غرض ہے، جس کے لیے اس نے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا اور شریعت اور کتابیں نازل فرمائیں؟ تو اس کا صحیح جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ — نفوسِ انسانی کا تزکیہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے لیے جو دعا فرمائی، اس میں آپؐ کی بعثت کی اصلی غایت یہی بیان فرمائی ہے کہ آپؐ لوگوں کا تزکیہ کریں:

> رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ O (البقرۃ۔۲:۱۲۹)
>
> اور اے ہمارے رب! تو ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما، جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مطابق جب آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی بعثت اور اس کے مقاصد کا حوالہ ان الفاظ میں دیا:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ۔۲:۱۵۱)

چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تمہی میں سے، جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اسی طرح سورہ جمعہ میں آنحضرت ﷺ کی بعثت اور اس کے اغراض ومقاصد کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل پر ان الفاظ میں احسان جتایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الجمعۃ۔۶۲:۲)

اسی نے اٹھایا ہے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیات میں نبی ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں جہاں تزکیہ کا ذکر آیا ہے وہیں تلاوت آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کا بھی ذکر آیا ہے تو ہم نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کا اصلی مقصد صرف تزکیہ ہی کو کیسے قرار دے دیا؟ آخر دوسری چیزیں بھی تو اسی اہمیت کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں، وہ کیوں اصلی مقصد قرار پانے کی مستحق نہیں ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید کے اسلوب بیان نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ مذکورہ آیات میں نبی ﷺ کے اصلی مقصد بعثت کی حیثیت سے جس چیز کا ذکر ہوا ہے وہ تزکیہ ہے۔ باقی اس کے ساتھ دوسری چیزیں — تلاوت آیات اور تعلیم کتاب وحکمت — جو مذکور ہوئی ہیں تو وہ اصلی مقصد کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اصلی مقصد کے وسائل وذرائع کی حیثیت سے مذکور ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں سے ایک آیت (۱۲۹) میں تزکیہ کا لفظ سب سے آخر میں آیا ہے اور دوسری آیت (۱۵۱) میں سب کے شروع میں آیا ہے۔

ایک غور کرنے والا شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہی بات کے بیان کرنے میں اسلوب کا یہ ردو بدل کم از کم قرآن مجید میں بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ اب غور کیجیے کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ہماری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اس تقدیم وتاخیر سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نبی کی تمام جدو جہد اور اس کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصود دراصل تزکیہ ہی ہے کیونکہ اصل مقصد ہی کی یہ اہمیت ہوتی ہے کہ وہ شروع میں بھی ایک کام کرنے والے کے پیش نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی۔ وہی اس کی تمام سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز بھی ہوتا ہے اور وہی نقطۂ اختتام بھی۔ وہیں سے وہ اپنا سفر شروع بھی کرتا ہے اور وہیں اس کو ختم بھی کرتا ہے۔

کسی سکیم کے اندر جو چیز مقصدی اہمیت کی حامل ہوتی ہے وہ عمل میں اگرچہ موخر ہوتی ہے لیکن ارادہ اور خیال میں مقدم ہوتی ہے۔ آپ ایک مکان کی تعمیر سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سکونت کی راحت ہے اور یہ چیز عین اس وقت بھی آپ کے سامنے ہوتی ہے جبکہ آپ ایک مکان کا نقشہ ابھی کاغذ کے صفحہ پر بنا رہے ہوتے ہیں۔ حالانکہ عملاً یہ چیز حاصل اس وقت ہوتی ہے جب مکان بن چکتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو مکان کی تعمیر سے جو اصل مقصد ہے یعنی — سکونت کی راحت — وہ شروع میں بھی آپ کے پیش نظر ہے اور آخر میں بھی پیش نظر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شروع میں آپ نے اس کو فکراً اور ارادتاً سامنے رکھا ہے اور آخر میں نتیجتاً۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ ایک مکان کی تعمیر کے لیے پہلی اینٹ زمین پر جماتے ہوئے بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس سے سکونت کی لذت وراحت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس وقت بھی کہہ سکتے ہیں جبکہ تمام مراحل تعمیر سے گزر کر اس کے کونے کی آخری اینٹ بھی رکھی جا چکی ہو کیونکہ درحقیقت یہی چیز ہے جو آپ کی تمام تعمیری سرگرمیوں میں شروع سے آخر تک پیش نظر رہی ہے۔ ظاہر میں آپ نے پھاوڑے بھی چلائے، اینٹیں بھی پکائیں، آرے بھی چلائے، چونا اور گارا بھی فراہم کیا، دیواریں بھی چنیں اور چھتیں بھی پاٹیں لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز فی نفسہٖ آپ کا مقصود نہیں رہی ہے۔ اس تمام کھکھیڑ سے اصلی مقصد درحقیقت آپ کا یہ تھا کہ آپ کو سکونت کی آسائش حاصل ہو۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر آپ اگر انبیاء کی بعثت کے مقصد کو سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ سکتے ہیں

کہ ان کا اصلی مقصد تو لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی ہوتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے وہ اپنی تمام دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا آغاز کرتے ہیں لیکن اس مقصد کی خاطر انہیں بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو اس مقصد کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کے لیے وہ اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ حکمت کا درس دیتے ہیں۔ مگر مقصود ان سارے کاموں سے صرف تزکیہ ہوتا ہے جو شروع میں بھی ان کے پیش نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی وہی ان کی تمام جدوجہد کی غایت بنتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے مذکورہ بالا آیات میں سے ایک آیت میں اس کو نبی ﷺ کی تمام سرگرمیوں کے نقطۂ آغاز کی حیثیت سے نمایاں کیا ہے اور دوسری آیت میں اس کی غایت اور منتہیٰ کی حیثیت سے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں اس بات کی بھی صاف تصریح موجود ہے کہ تزکیہ ہی وہ اصل کام ہے جس کے لیے لوگوں کو نبی سے رجوع کرنا چاہیے اور نبی کا فرض ہے کہ جو لوگ اس غرض کے لیے اس سے رجوع کریں، ان کو وہ ہرگز مایوس نہ کرے۔ چنانچہ ایک موقع پر بعض اسباب سے نبی ﷺ سے ایک طالب تزکیہ کے معاملے میں تھوڑی سی غفلت ہوگئی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مندرجہ ذیل الفاظ میں تنبیہ فرمائی گئی:

عَبَسَ وَتَوَلّٰى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ۝
(عبس۔۸۰:۱۔۳)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ آیا اس کے پاس نابینا۔ اور تمہیں کیا معلوم شاید وہ اپنی اصلاح کرتا؟

ان آیات سے بالکل صاف واضح ہو رہا ہے کہ نبی خلق خدا کی جس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ ان کے نفوس کا تزکیہ ہے، اس وجہ سے لوگوں کو یہ حق ہے کہ اس غرض کے لیے اس سے رجوع کریں اور نبی کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ لوگوں کی یہ ضرورت پوری کرے۔

جس طرح آنحضرت ﷺ کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کا تزکیہ قرار دیا گیا ہے' اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا بھی اصلی مقصد اسی چیز کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝
(النازعات۔۷۹:۱۷۔۱۸)

تم فرعون کے پاس جاؤ' اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔ اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ اپنے کو سدھارنے کا جذبہ ہے؟

پھر یہ حقیقت بھی قرآن مجید سے ثابت ہے کہ تزکیہ ہر شخص کی فلاح و نجات آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ تزکیہ کی یہ اہمیت بھی تقاضا کرتی ہے کہ یہی چیز انبیاء کی بعثت کی غایت اور ان کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصد قرار پائے۔ چنانچہ قرآن مجید اس بات پر شاہد ہے کہ آخرت میں انسان کی نجات و فلاح منحصر ہے تمام تر اس بات پر کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ فرمایا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس۔۹۱:۹۔۱۰)

کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا!

اسی طرح دوسری جگہ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ (الاعلیٰ۔۸۷:۱۴)

کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا!

ظاہر ہے کہ جب آخرت میں انسان کی نجات و فلاح تزکیہ حاصل کرنے پر منحصر ہوئی تو انبیاء علیہم السلام کا، جو انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اصلی کام یہی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں اور ان کو تزکیہ حاصل کرنے کے طریقے بتائیں۔

اوپر کے مباحث سے تین باتیں واضح ہوئیں:

ایک یہ کہ تزکیہ تمام دین و شریعت کی غایت اور تمام انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصود ہے۔ دین میں جو اہمیت اس کو حاصل ہے وہ اہمیت دوسری کسی چیز کو بھی حاصل نہیں ہے۔ دوسری ساری چیزیں وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ چیز غایت و مقصد کی حیثیت رکھتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی سرگرمیاں، خواہ ظاہر میں کتنے ہی مختلف پہلو رکھتی ہوں لیکن باطن میں ان کا ہدف انسان اور انسانی معاشرہ کے تزکیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا سرچشمہ اور اس کا منبع و مصدر کتاب اللہ ہے، اسی کی تعلیم سے تزکیہ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اسی کے اسرار و حقائق ہیں جو نبی ﷺ کے ذریعہ سے واضح ہو کر اس تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی نکتہ ہے کہ سورہ بقرہ اور سورہ جمعہ کی جو آیتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں، ان میں تزکیہ کو تلاوت آیات کے ساتھ اس طرح وابستہ کیا ہے کہ یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ تزکیہ درحقیقت تلاوت آیات ہی کے ثمرات و نتائج میں سے ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ (البقرۃ۔۲:۱۵۱)
جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ... وَيُزَكِّيْهِمْ (البقرۃ۔۲:۱۲۹)
جو ان کو تیری آیتیں سنائے... اور ان کا تزکیہ کرے۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا عمل انسانی معاشرہ کے کسی خاص گروہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام افراد اور تمام گروہوں بلکہ پورے معاشرہ سے یکساں طور پر ہے۔ کوئی شخص بھی اس کے بغیر آخرت میں نجات اور فلاح حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی حیثیت دین میں صرف ایک فضیلت کی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ایک ناگزیر انفرادی ضرورت کی ہے۔ یہ نجات اور فلاح آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے، جس کو پورا کیے بغیر کوئی شخص جنت میں نہیں داخل ہو سکتا۔

تزکیہ کا علم نہ راز ہو سکتا ہے نہ نامکمل

اگر یہ تینوں باتیں اپنی جگہ پر ثابت ہیں (اور کوئی شخص بھی ان کے ثابت ہونے سے انکار نہیں کر سکتا) تو ان سے دو نتیجے لازمی طور پر نکلتے ہیں:

ایک یہ کہ نبی ﷺ تزکیہ کے علم کو نامکمل چھوڑ کر دنیا سے تشریف نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیہ کو آپ کے مقاصد بعثت میں محض ایک ضمنی جگہ حاصل نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، اصل مقصد بعثت یہی ہے۔ پھر جو چیز اصل مقصد بعثت ہو اس کو پیغمبر نا تمام اور ناقص

چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟ تزکیہ کی اس اہمیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح شریعت کے تمام اصول کتاب و سنت کے اندر منضبط کر دیے گئے ہیں، اسی طرح تزکیہ کے تمام اصول بھی کتاب و سنت کے اندر منضبط ہوں۔ جس طرح شریعت کے اندر کسی بے راہ روی کے لیے گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی کسی بے راہ روی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ جس طرح شریعت کے اندر ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود کسی شخص کو اس بات کا موقع حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے ذوق یا ذاتی رجحانات یا اپنے شخصی تجربات کو اس کے اندر گھسا دے، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود ایسی حد بندیاں ہونی چاہئیں کہ اشخاص و افراد کے اپنے میلانات و رجحانات کی دراندازیوں کے لیے کوئی منفذ باقی نہ رہے۔ جس طرح شریعت کے اندر ہر مجتہد اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو کتاب و سنت ہی کے اشارات کی کسوٹی پر پرکھتا اور پرکھواتا ہے اور اس کے بغیر اس کا اجتہاد بھی لائق قبول نہیں ٹھہرتا، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی اگر کوئی شخص کوئی بات اپنے اجتہاد سے کہے تو اس کے لیے ناگزیر ہو کہ وہ کتاب و سنت کے اشارات اور نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طرز عمل سے کوئی دلیل لائے۔ محض اپنے ذوق و وجدان کا حوالہ نہ دے ورنہ اس کے اجتہاد کا کوئی وزن نہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تزکیہ کا علم کوئی راز نہیں ہو سکتا جو صرف خاص خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو اور انہی سے سینہ بسینہ وہ دوسروں کو منتقل ہو۔ تزکیہ ایک عام ضرورت کی چیز ہے، ہر شخص آخرت کی نجات و فلاح کے لیے اس کا محتاج ہے۔ انبیاء آتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ افراد کا بھی تزکیہ کریں اور معاشرہ کا بھی تزکیہ کریں۔ پھر جو چیز اس قدر عمومی ضرورت کی ہو اس کو صرف چند خاص خاص افراد کے سینہ کا راز بنا کے کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص ہر علم کا اہل نہیں ہوا کرتا، اس وجہ سے اگر ایک شخص اس علم کا ذوق رکھنے والا نہ ہوگا تو وہ اس سے محروم رہے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اہل علم میں فرق مراتب بھی ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کے سارے جاننے والے ایک درجہ کے نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ کوئی پراسرار علم ہے جس کے جاننے والے صحابہؓ کے زمانہ میں بھی چند ہی افراد تھے اور بعد میں بھی خال خال افراد ہی ہوئے۔ جو چیز ہوا اور پانی کی طرح ہر شخص کے لیے ضروری ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ

نبی ﷺ اس کو بس ایک دو آدمیوں کے کانوں میں پھونک کر چلے جائیں، دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہونے پائے اور یہ دو ایک آدمی بھی اس کو عام کرنے کی بجائے، اس کو راز بنا کر رکھ چھوڑیں اور صرف انہی اشخاص پر اس راز کو کھولیں جو ان کے محرم راز بن جائیں؟ علم کیمیا کی تعلیم میں تو یہ رازداری چل سکتی ہے لیکن تزکیہ اگر عام ضرورت کی چیز ہے (اور اس کے عام ضرورت کی چیز ہونے سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے) تو اس میں اس رازداری کا چلنا نہ ممکن ہے اور نہ قرین مصلحت!

ہمارے حنفی علماء عام ضرورت کی چیزوں میں عموماً خبر آحاد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس چیز کا تعلق عام ضرورت سے ہے اس کے بارہ میں ایک دو طریقوں سے روایت کے کیا معنی؟ لیکن یہی حضرات جب تصوف کے کوچے میں آتے ہیں تو تزکیہ کے علم کو ایک راز ثابت کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان باتوں کو اہل ظاہر کیا جانیں؟ یہ **اسرار و موجید** ہیں۔ وہ اس فخر کے نشہ میں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ اگر تصوف کا منشا تزکیہ نفس ہے تو تزکیہ نفس تو ایک عام ضرورت کی چیز ہے، پھر ایک عام ضرورت کا تقاضا ایک ایسے علم سے کیسے پورا ہو سکتا ہے جو صرف چند سینوں کا ایک راز ہو؟

بعض احادیث سے غلط استدلال

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس سے وہ نتائج نہایت بدیہی طور پر نکلتے ہیں جو ہم نے نکالے ہیں اور عقل عام بھی انہی کی تائید کرتی ہے۔ لیکن ہمارے اہل تصوف حضرات اس علم کو ایک پراسرار علم ثابت کرنے پر نہایت مصر ہیں۔ وہ اپنے اس دعوے پر جہاں بہت سے مشائخ تصوف کے اقوال سے دلیل لاتے ہیں وہاں بعض احادیث اور بعض آثار بھی پیش کرتے ہیں۔ مشائخ تصوف کے اقوال و اشارات سے تو یہاں بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن جن احادیث و آثار سے انہوں نے استدلال کیا ہے، ان کی حقیقت واضح کرنا ہمارے لیے ضروری ہے ورنہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں کھٹک باقی ہی رہے گی۔

ان حضرات کا سب سے بڑا استدلال حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے ہے جو بخاری شریف میں مندرجہ ذیل الفاظ میں وارد ہے:

عن ابی هریرة قال: حفظت من رسول الله صلی الله علیه وسلم وعائین. فاما احدهما بثثته. واما الآخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم.

(صحیح البخاری: کتاب العلم باب ۴۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو ظرف اکٹھے کیے تھے: ایک ظرف کا علم تو میں نے (تمہارے اندر) پھیلا دیا۔ رہا دوسرا ظرف تو اگر اس کے علم کو میں تمہارے اندر پھیلاؤں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔

اس حدیث سے یہ حضرات ثابت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کے پاس نبی ﷺ سے اخذ کردہ ایک ایسا ذخیرۂ علم بھی تھا جس کی حیثیت بالکل ایک **سر مخفی** کی تھی۔ جس کے حقائق اور باریکیوں کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہ تھا بلکہ صرف خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے تھے۔ یہ علم، ان حضرات کے خیال کے مطابق، جمہور کے فہم اور ان کے مذاق و رجحان سے اس قدر مختلف بلکہ اس کے مخالف تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ ڈرتے تھے کہ اگر اس علم سے وہ پردہ اٹھا دیں تو لوگ ان کو جیتا نہ چھوڑیں۔

یہ نتائج نکال کر ان سے جو اثر یہ حضرات پیدا کرتے ہیں وہ ان نتائج سے بھی زیادہ اہم اور دوررس ہے جن کی آڑ لے کر یہ حضرات تصوف اور ائمہ تصوف کی ان ساری باتوں کو عین دین ثابت کرنا چاہتے ہیں جن کا کتاب و سنت سے کوئی جوڑ نہیں لگتا اور جن پر اہل حق ہمیشہ نکیر کرتے رہے ہیں۔ اس کی مثالیں مناسب مواقع پر آگے ملاحظہ فرمائیے۔ ظاہر ہے کہ اہل تصوف کے **اسرار و کشوف** کے لیے دین میں بڑی گنجائش نکل آتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ علم دین صرف اتنا ہی نہیں ہے جتنا قرآن و حدیث میں نظر آتا ہے بلکہ علم دین کا بہت بڑا حصہ عوام کے اندیشوں سے خواص کے سینوں ہی میں محفوظ رہا اور اگر ان سے منتقل ہوا بھی تو صرف خواص ہی تک محدود رہا، عام اہل علم کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے پائی، عام اہل علم جنہوں نے قرآن و حدیث کے الفاظ و کلمات کے واسطے سے دین کو سیکھا ہے وہ تو صرف **علم بالا حکام** کے وارث ہوئے ہیں۔ اصلی علم تو **علم باللہ** ہے اور اس کی وراثت صرف ان لوگوں کو منتقل ہوئی ہے جنہوں

نے اس **علم سینہ** میں سے کوئی حصہ پایا ہے۔

یہاں سے یہ حضرات ایک قدم اور آگے بڑھا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ **اہل حقیقت** اور **اہل ظاہر** کے معیارات بالکل الگ الگ ہیں، اس وجہ سے ایک کی باتوں کو دوسرے کی کسوٹیوں پر جانچنا اصولی طور پر غلط ہے۔ اہل ظاہر جو کچھ کہتے ہیں وہ الفاظ کو دیکھ کر کہتے ہیں اور اہل حقیقت کی نگاہیں معانی کی رازداں ہوتی ہیں:

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے یہ اثرات جو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خاصے سنگین ہیں اور ان کی زد ہماری پوری شریعت پر پڑتی ہے، اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ ہم اس کا صحیح مطلب واضح کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے نزدیک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس قول کے تین پہلو ہو سکتے ہیں:

ایک پہلو تو یہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو جب یہ باتیں بتائی ہوں تو ساتھ ہی ان کو یہ ہدایت فرمائی ہو کہ یہ دوسروں کو بتانے کی نہیں ہیں بلکہ پوشیدہ رکھنے کی ہیں۔ اگر تم نے ان کو ظاہر کیا تو یہ اندیشہ ہے کہ تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔

دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ نے یہ باتیں بطور راز کے تو نہ بتائی ہوں، بلکہ تعلیم و تبلیغ ہی کے لیے بتائی ہوں لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی زندگی ہی میں ماحول اس قدر بدل چکا ہو کہ وہ باتیں لوگوں کے لیے بالکل اوپری بن کے رہ گئی ہوں اور ان کو پیش کرنا پیش کرنے والے کے لیے خطرے سے خالی نہ رہ گیا ہو۔

تیسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں ایسی ہوں جن کے بیان و اظہار میں وقت کے ارباب اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں، اس وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کو اندیشہ ہو کہ اگر وہ باتیں وہ بیان کرنی شروع کر دیں تو وقت کے ارباب اقتدار کے ہاتھوں ان کی جان کی خیر نہ رہے۔

اب عقل و نقل اور روایت و درایت سے ان تینوں پہلوؤں کو جانچیے اور پرکھیے کہ ان میں سے کون سا پہلو واضح نظر آتا ہے۔

(۱) ان میں سے پہلی صورت تو بداہتہً غلط معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ اسی طرح کی پراسرار باتوں کا کوئی ذخیرہ آنحضرت ﷺ کو محفوظ کرنا ہی ہوتا تو اس امانت کے لیے موزوں تر سینہ ان فقہا صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کا ہو سکتا تھا جو فہم و فقاہت اور رازداردین ہونے کے لحاظ سے تمام صحابہؓ میں ممتاز تھے۔ اس کے لیے موزوں شخص حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہو سکتے تھے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہو سکتے تھے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہو سکتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہو سکتے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہو سکتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ہو سکتے تھے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ہو سکتے تھے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہو سکتی تھیں۔ یہ لوگ صحابہؓ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے اور دین و شریعت کی باریکیوں کے سمجھنے اور مختلف چیزوں کے مدارج و مراتب کے امتیاز میں نمایاں درجہ رکھتے تھے، اس وجہ سے بجا طور پر اس علم کے حامل اور امین ہونے کے زیادہ اہل تھے جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ:

بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ایک محدث اور کثیر الروایہ صحابی ہونے کے لحاظ سے جو درجہ ہے اس سے کسی کو مجال انکار نہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ دین کی باریکیاں سمجھنے میں ان کا وہ مرتبہ نہیں ہے جو طبقۂ اول کے صحابہؓ کا ہے اور اس حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ جاننے پہچاننے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہؓ کو جو تعلیم و تلقین بھی فرمائی وہ چھپانے اور راز رکھنے کے لیے نہیں بلکہ سیکھنے اور سکھانے کے لیے ہی فرمائی۔ ہمیں قرآن یا حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے آنحضرت ﷺ کی زندگی میں یا دوسرے انبیاء کی زندگی میں اس قسم کی صوفیانہ رازداری کا پتا چلتا ہو۔ خصوصاً نبی کریم ﷺ نے تو بار بار صحابہؓ کو اس بات کی تاکید فرمائی کہ وہ جو کچھ آپؐ کی صحبت میں سنیں اور دیکھیں، اس کو دوسروں کو بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہی ہو۔ آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میرے منہ سے جو کچھ سنو اس کو محفوظ کر لو کیونکہ میرے منہ سے کوئی بات غلط نہیں نکلا کرتی۔ آنحضرت ﷺ

بنوامیہ کا دور دیکھا تھا۔ ان کی وفات سن ۵۹ ھ میں ہوئی ہے جبکہ مسلمان بنوامیہ کے جبر واستبداد کے شکنجے میں اچھی طرح کسے جا چکے تھے اور بنوامیہ تلوار کے زور سے ان تمام اہل حق کے دبا لینے کے در پے تھے جو ان کے استبداد اور ان کی سیاسی و اجتماعی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذخیرۂ علم میں ایسی بہت سی حدیثیں تھیں جن میں اسلامی امراء و حکام کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں یا جن میں بنوامیہ کے دور کے فتنوں ان کے ملک عضوض (استبداد) اور ان اغیلمۃ (بنوامیہ کے چھوکروں) کی ستم رانیوں اور ان کے ہاتھوں دین اور اہل دین کی بربادی کی بابت آنحضرت ﷺ نے پیش گوئیاں فرمائی تھیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس قسم کی روایات کے ذخیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں روزہ و نماز اور حج و زکوۃ کی حدیثوں کی طرح اجتماعی و سیاسی معاملات سے متعلق حدیثیں بھی کھلم کھلا بیان کرنا شروع کر دوں تو مستبدین وقت مجھے جیتا نہ چھوڑیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کے قول کا یہ مطلب عقل و نقل اور روایت و درایت کے بالکل مطابق معلوم ہوتا ہے اور صرف میں نے ہی اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا ہے بلکہ دوسرے شارحین حدیث بھی اس مطلب کی طرف گئے ہیں۔ چنانچہ لمعات میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے:

> وقیل: ارادبہ اخبار الفتن وفساد الدین علی ید اغیلمۃ من قریش. و کان ابوھریرۃ یکنی عن بعض ولا یصرح بہ خوفاً علی نفسہ کقولہ: اعوذ باللہ من امارۃ الصبیان.
>
> اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے حضرت ابوہریرہؓ کا اشارہ ان احادیث کی طرف ہے جو فتنوں سے متعلق ہیں اور جن میں قریش (بنوامیہ) کے چھوکروں کے ہاتھوں دین کی بربادی کی پیشین گوئیاں ہیں۔ اور حضرت ابوہریرہؓ ان میں سے بعض کی طرف اپنے اقوال اور دعاؤں میں اشارہ بھی کرتے تھے لیکن اندیشہ جان کے سبب سے نام لے کر ان کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہا کرتے تھے: میں چھوکروں کی امارت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں!

دوسری حدیث جس سے یہ حضرات اپنے باطنی علم کی تائید میں استدلال کرتے ہیں وہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے:

> عن ابن مسعود قال: قال لی رسول اللہ ﷺ: اُنزل القرآن علی سبعۃ احرف. لکل ایۃ منھا ظھر و بطن.
>
> حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ قرآن سات قراءتوں پر نازل ہوا ہے۔ ان میں سے ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔

اسی حدیث کے ہم معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول بھی ہے جس میں انہوں نے قرآن کے ایک دریائے معانی ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن ایک دریائے معانی ہے، قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے، قرآن میں تمام علم اولین اور تمام علم آخرین ہے، قرآن کی تازگی پر کبھی باسی پن نہیں آئے گا، قرآن سے اہل علم کبھی آسودہ نہیں ہوں گے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر حقیقت ہیں اور ان لوگوں سے منقول ہیں جو قرآن کے رازداں رہے ہیں۔ لیکن اس مضمون کی احادیث و آثار اور اس کے ہم معنی اقوال و اشارات سے یہ استدلال کرنا کہ قرآن نے ایک ایسا علم باطن بھی دیا ہے جس کے حامل ہر دور میں صرف چند نفوس قدسیہ ہی رہے ہیں اور انہی کے ذریعہ سے یہ علم ہر دور کے مخصوص حاملین کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے، ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے لیکن اس کا کوئی باطن نہیں ہے جس کی رہنمائی خود اس کا ظاہر نہ کرتا ہو۔ قرآن کے اندر اسرار حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن کے ہی الفاظ و اشارات ہیں، قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں ہے۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے، ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبر کرتے ہیں وہ بقدر استعداد اس سے فیض پاتے ہیں اور وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں، اس معاملہ میں مجرد ذوق یا کشف یا مشاہدہ کو دلیل راہ نہیں بناتے۔ ایک فقیہ جس طرح قرآن حکیم سے ایک فقہی

نے حجتہ الوداع کے موقع پر سامعین کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو یہ ساری باتیں بتائیں جو موجود نہیں ہیں کیونکہ بہت سے لوگ دوسروں سے سن کر براہ راست سننے والوں سے زیادہ محفوظ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ حق بات جانتے ہوئے دوسروں کو اس کے بتانے سے گریز کریں گے قیامت کے دن ان کے منہ میں آگ کی لگام لگائی جائے گی۔

اسی طرح کی متعدد تاکیدات مختلف پہلوؤں سے ہمیں احادیث میں آپؐ کی طرف سے ملتی ہیں لیکن کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ آپؐ نے کسی ایک صحابی سے بھی کوئی بات فرمائی ہو اور پھر یہ تاکید کی ہو کہ اس کو اپنے ہی تک راز رکھنا، دوسروں پر اس کو نہ کھولنا، ورنہ لوگ تمہاری جان کے دشمن بن جائیں گے۔ اس کے برخلاف بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ آپؐ نے کوئی بات بتائی ہے اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرمائی ہے کہ اس کو بتانا اور کہنا اگرچہ اس کے سبب سے لوگ تمہارے دشمن ہی بن جائیں اور تمہیں نقصان ہی پہنچائیں۔ صرف آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگیوں ہی میں نہیں بلکہ دوسرے انبیاء اور ان کے صحابہ کی زندگیوں میں بھی ہمیں اس طرح کی ہدایات وتاکیدات کم وبیش انہی الفاظ میں ملتی ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنے شاگردوں کو کچھ ہدایات دیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ:

> مگر آدمیوں سے بے خبر رہو کیونکہ وہ تم کو کوڑے ماریں گے O اور تم میرے سبب سے حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے تا کہ ان کے اور غیر قوموں کے لیے گواہی ہو O لیکن جب وہ تم کو پکڑوائیں تو فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح کہیں یا کیا کہیں کیونکہ جو کچھ کہنا ہوگا اسی گھڑی تم کو بتایا جائے گا O کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کی روح ہے جو تم میں بولتا ہے O (انجیل متی: باب ۱۰: ۱۸۔۲۰)

(۲) اب دوسری صورت کو لیجیے۔ یعنی اس بات کو کہ آنحضرت ﷺ نے یہ باتیں حضرت ابو ہریرہؓ کو سکھائی اور بتائی تو ہوں تبلیغ وتعلیم کے عام مقصد ہی کے تحت لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی زندگی ہی میں لوگوں کے حالات اس قدر متغیر ہو چکے ہوں کہ ان باتوں کو بتانا اور سکھانا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی زندگی ہی میں زمانہ کے حالات بہت کچھ بدل چکے تھے۔ اُن کی وفات خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد بنی امیہ کی حکومت کے زمانہ میں ہوئی ہے جبکہ مسلمانوں کے اندر طلب دین کا جوش سرد پڑ رہا تھا اور طلب دنیا کی سرگرمیاں اس کی جگہ پر غالب آنی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن اس انقلاب حال کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنی امیہ کے دور میں (کم از کم شروع میں) عوام کا مزاج اس قدر نہیں بگڑا تھا کہ لوگ دین کی باتوں سے اس درجہ نامانوس اور بیگانہ ہو جائیں کہ ان کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سنانا بھی ایک پر خطر کام بن جائے۔ اس دور میں جلیل القدر صحابہؓ کا ایک گروہ موجود تھا، ان کے شاگرد لوگ ہر جگہ موجود تھے، ان کا اعزاز واحترام بھی اچھا خاصا لوگوں میں پایا جاتا تھا، احادیث کے نقل وروایت کی گرما گرمی بھی ہر جگہ موجود تھی، بہت سی خرابیوں کے پیدا ہونے کے باوجود فضا ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی کہ دین کی باتوں کو بتانا اور سیکھنا دشوار ہو جائے۔ اس دور میں عجمی تمدن اور عجمی علوم کا گھن بھی طبائع کو نہیں لگا تھا کہ لوگ اس فطری سادگی اور دلکشی سے بالکل ہی نامانوس ہو جائیں جو نبی ﷺ کے ارشادات واقوال میں پائی جاتی تھی۔ ذہنی اعتبار سے کچھ لوگ متغیر ضرور ہو گئے تھے لیکن اتنے پست نہیں ہو گئے تھے کہ ان میں اسلامی باتوں کے سمجھنے یا اسلامی اقدار کے احترام کی صلاحیت ہی سرے سے باقی نہ رہ گئی ہو۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں دین کی سادہ اور عام تعلیمات کے سمجھنے والے موجود تھے اور دین کی گہری باتیں سمجھنے والے بھی ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ دین کی گہری باتوں کو سمجھنے کے اہل جس طرح ہر دور میں تھوڑے ہی پائے گئے ہیں، اسی طرح اس دور میں بھی ان کی تعداد تھوڑی تھی۔ پس یہ بات کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے محض عوام کے فساد مذاق کے سبب سے نبی ﷺ کے دیے ہوئے علم کو ظاہر کرنے سے اپنے آپ کو بے بس اور مجبور محسوس کیا ہو۔

(۳) اب رہ گئی تیسری صورت۔ یعنی حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ ذخیرۂ علم ایسی حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے نقل وروایت اور جن کے پھیلنے میں وقت کے ارباب اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

ہم کو یہی بات قرین قیاس اور عقل ونقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ نے

حکم مستنبط کرتا ہے اور اس پر قرآن کے الفاظ یا اشارات سے کوئی دلیل پیش کرتا ہے اور اگر وہ اس طرح کی دلیل نہ پیش کرے تو اس کی بات بالکل بے وزن ہو کے رہ جاتی ہے، اسی طرح ایک صاحب اسرار کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہر سر پر جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے قرآن سے سمجھا ہے، قرآن سے دلیل لائے اور اگر وہ قرآن سے دلیل نہ لا سکے تو اس کے اس نکتہ کی کوئی وقعت نہیں اگرچہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس نے یہ نکتہ خانہ کعبہ کے اندر قرآن کی روحانیت کی طرف توجہ کے ذریعے سے حاصل کیا ہے۔ اس قسم کے اسرار کی دلچسپ مثالیں ہم آگے مناسب مواقع پر پیش کریں گے۔

پس جہاں تک قرآن کے اندر اسرار و حکم کے موجود ہونے کا تعلق ہے اس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں ہے لیکن اسرار و حکم کے اس خزانہ پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اس خزانہ میں سے بقدر صلاحیت و استعداد وہ لوگ حصہ پاتے ہیں جو کتاب الٰہی پر تدبر کرتے ہیں اور ان شرائط کے ماتحت تدبر کرتے ہیں جو قرآن پر تدبر کے لیے مقرر ہیں۔ حضرات صوفیائے کرام نے جو اسرار و معارف دریافت کیے ہیں ان کا وہ حصہ بے شک صحیح ہے جو انہوں نے قرآن کے تدبر کے ذریعے سے حاصل کیا ہے اور جس پر وہ قرآن سے کوئی دلیل رکھتے ہیں مگر مجرد اس بنا پر کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے، علم باطن کا ایک پورا نظام کھڑا کر دینا اور اس کی حمایت میں مذکورہ بالا حدیثوں سے دلیل لانا صریح زیادتی ہے۔

باطن نماز کا بھی ہے، باطن روزہ کا بھی ہے، باطن حج کا بھی ہے، باطن زکوٰۃ کا بھی ہے اور قرآن نے صاف صاف اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں سے ہر چیز کا ایک باطن ہے اور وہی باطن مقصود حقیقی ہے لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ کوئی شخص اٹھ کر ان عبادات کی ساری صورت و ہیئت بالکل بدل ڈالے اور جب کوئی شخص اس پر اعتراض کرے تو وہ جواب دے کہ یہ باتیں باطن سے تعلق رکھنے والی ہیں، ان کو اہل ظاہر کیا جانیں! قرآن نے جہاں یہ بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ظاہر کا ایک باطن ہے وہیں اس نے یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ فلاں ظاہر کا باطن یہ ہے تاکہ کسی بے راہ روی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

---

1 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس قول کا مطلب تو بلاشبہ یہی ہے لیکن اس سے کسی کو یہ

غلط فہمی نہ ہو کہ اس طرح جان کے اندیشہ سے صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے دیے ہوئے علم کے ایک بڑے حصہ کو ضائع کر دیا اور وہ امت کی طرف منتقل ہونے سے رہ گیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ان روایات کو سرے سے بیان ہی نہ کرتے۔ بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ ان چیزوں کے بیان کرنے میں محتاط ہو گئے ہیں۔ ان کو آزادی کے ساتھ اپنے اہل اور لائق شاگردوں ہی سے بیان کرتے تھے، انہی کے ذریعے سے ان کا علم بعد والوں کو منتقل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی حدیثوں کی شہرت پہلے دور میں نہیں ہوئی بلکہ دوسرے اور تیسرے دور میں ہوئی۔ لیکن بہر حال رسول اللہ ﷺ کا علم ضائع نہیں ہوا بلکہ اسلاف سے اخلاف تک منتقل ہو گیا اور یہی ہمارے سلف صالحین کی ذمہ داری تھی۔

باب ۲

تزکیہ کا لغوی مفہوم، اس کا مقصد اور اس کی وسعت

عربی زبان میں تزکیہ کا مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشوونما دینا اور اس کو پروان چڑھانا ہے۔

تزکیہ کا عمل مختلف چیزوں پر ظاہر میں تو مختلف شکلوں میں نمایاں ہوگا — مادی چیزوں پر یہ عمل کسی اور شکل میں نمایاں ہوگا اور معنوی چیزوں پر کسی اور صورت میں — لیکن یہ فرق محض ایک ظاہری فرق ہوگا، حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی فرق نہیں ہوگا۔ لفظ کے اندر صاف ستھرا بنانے، نشوونما دینے اور پروان چڑھانے کی جو روح ہے وہ اس کے عمل میں ہر جگہ نمایاں رہے گی۔

اس بات کو مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ تزکیہ کا عمل زمین کے ایک ٹکڑے پر بھی کیا جا سکتا ہے اور ایک انسان کے نفس پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان دونوں چیزوں پر اس عمل کی صورت ظاہر میں مختلف ہوگی، اس لیے کہ میدان عمل الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت اور مقصد کے لحاظ سے دونوں عملوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔ زمین کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس کو پہلے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا جائے، اس کی ناہمواریوں کو ہموار کیا جائے پھر اس پر ہل چلا کر اس کو نرم بنایا جائے۔ پھر کھاد اور پانی دے کر اس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کسی صالح بیج کو نشوونما دے سکے اور اس سے پھل اور پھول حاصل ہو سکیں۔

نفس کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر جو غلط افکار و نظریات جڑ پکڑ گئے ہیں، ان کی جڑیں

اکھاڑی جائیں۔ جاہلی عادات و اخلاق نے اس کے اندر جو کجیاں اور ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں، ان کو درست اور ہموار کیا جائے۔ تقلیدوں اور رسموں کی پرستش نے اس کو بے حسی اور جمود کے جو روگ لگا رکھے ہیں، ان کو دور کیا جائے۔ فانی اور نفسانی لذتوں کی چاٹ نے اس پر جو پست ہمتی اور بزدلی طاری کر رکھی ہے، اس کا علاج کیا جائے تاکہ اس کی آنکھیں کھل سکیں، اس کا دماغ سوچ سکے، اس کی ہمت ابھر سکے، اس کی عادتیں سنور سکیں اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق اپنی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے اس بلند مرتبہ تک پہنچ سکے جس مرتبہ تک پہنچنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر قابلیت رکھی ہے۔

تزکیہ کا اصطلاحی مفہوم

اسی مفہوم سے ملتا جلتا تزکیہ کا اصطلاحی مفہوم بھی ہے۔ اس کا لغوی مفہوم، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا اور اس کو پروان چڑھانا ہے اور اس کا اصطلاحی مفہوم نفس کو غلط رجحانات و میلانات سے موڑ کر نیکی اور خدا ترسی کے راستہ پر ڈال دینا اور اس کو درجہ کمال پر پہنچنے کے لائق بناتا ہے۔

تزکیہ کا یہ اصطلاحی مفہوم خود قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہوتا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (الشمس ۔۹۱: ۷۔۱۰)

اور شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا! پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

اس آیت سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات ودیعت کر دیے ہیں اور اس کو یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان امتیاز کر سکے۔ پھر انسان کے لیے فلاح و کامرانی کا راستہ یہ ٹھہرایا ہے کہ وہ نیکی اور بدی کی اس کشمکش میں نیکی کا ساتھ دے اور اس کو بدی پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔

صحیح شعور کے ساتھ نیکی کو غالب کرنے اور بدی کو مغلوب کرنے کا یہ جہاد قرآن مجید کی اصطلاح میں تزکیہ ہے۔

علم تزکیہ کی وسعت

تزکیہ کے اس مقصد و مفہوم کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو علوم ہمارے نفس سے براہ راست بحث کرنے والے ہیں ان میں علم طب ہی ایک ایسا علم ہے جو تزکیہ کے علم سے کسی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ علم طب ہمارے جسم کی بیماریوں اور ان کے علاج سے بحث کرتا ہے اور علم تزکیہ ہماری روح کے امراض اور ان کے علاج سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس مشابہت کے باوجود دونوں میں بہت بڑا فرق بھی ہے۔ علم طب کا دائرۂ بحث نہایت محدود ہے۔ وہ صرف ہمارے نفس کے ایک پہلو یعنی جسم اور اس کے امراض سے بحث کرتا ہے۔ اس کے برعکس علم تزکیہ ہمارے نفس کے تمام ظاہری و باطنی گوشوں سے بحث کرتا ہے۔ ہمارا نفس جن جن قوتوں اور قابلیتوں سے بھی مرکب ہے، یہ ان سب پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے اور ان سب کی تربیت کرتا ہے۔ ہمارے اندر جتنے احساسات و جذبات پائے جاتے ہیں، یہ سب کو زیر بحث لاتا ہے اور ان سب کی اصلاح کرتا ہے۔ ہمارا نفس جن گوناگوں اور مختلف النوع روابط و تعلقات کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے، یہ ان سب کا جائزہ لیتا ہے اور سب کو ایک خاص اصول و ضابطہ کے تحت منظم کرتا ہے۔ ہمارے دل کے خیالات، ہمارے ذہن کے وسوسے، ہماری طبیعت کے میلانات اور ہمارا اٹھنا بیٹھنا، ہمارا کھانا پینا، ہمارے مشاغل اور ہماری دلچسپیاں اور ہمارے روز و شب کے معمولات، غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس سے یہ بحث نہ کرتا ہو۔

علم تزکیہ کا اصلی کام

پھر صرف یہی نہیں کہ یہ ہمارے نفس کے ہر پہلو سے بحث کرتا ہے۔ یا ان کی خرابیوں کو دور کر کے ان کی جگہ پر جو کچھ صحیح ہے اس کو پیش کرتا ہے، بلکہ اس کا اصلی کام اس بحث و تحمیص اور اس تعلیم و تلقین سے آگے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے نفس کی ہر پہلو سے ایسی تربیت بھی کرتا ہے جس

سے ہمارا نفس **نفس مطمئنہ** بن جائے۔

نفس مطمئنہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے علم کی بنیاد ایسے مضبوط یقین پر قائم ہو جائے کہ رنج و راحت اور دکھ اور سکھ کی کوئی حالت بھی خدا کے بارے میں ہمارے اعتماد اور ہمارے حسن ظن کو بدل نہ سکے بلکہ ہر حالت میں ہم خدا سے راضی اور مطمئن رہیں۔ اسی طرح ہمارے عمل کی بنیاد ایک ایسی مستحکم سیرت پر قائم ہو جائے کہ تنگی و فراخی اور خوف و طمع کی کوئی آزمائش بھی ہم کو اس مقام سے نہ ہٹا سکے جہاں اللہ کی شریعت نے ہمیں کھڑا کیا ہے تاکہ اللہ تعالٰے نے ہم سے جو کچھ چاہا ہے، ہم اس کو پورا کر کے اس کے پسندیدہ بندے بن سکیں۔ یہی نفس مطمئنہ تزکیہ کا اصل مقصود ہے۔ قرآن میں اس **نفس مطمئنہ** کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے:

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۝
(الفجر۔۸۹:۲۷۔۲۸)

اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جما رہا! چل اپنے رب کی طرف — تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔

خوب سے خوب تر کی جستجو

اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ تزکیہ میں ایک آرٹ کی شان بھی پائی جاتی ہے کیونکہ تزکیہ کا مطمح نظر صرف اسی قدر نہیں معلوم ہوتا کہ ہمارا نفس کسی نہ کسی شکل میں راہ پر لگ جائے بلکہ تزکیہ اس سے آگے بڑھ کر نفس کو خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ تزکیہ صرف اتنا ہی نہیں چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کی شریعت کا کچھ علم حاصل ہو جائے بلکہ وہ اس سے بڑھ کر یہ بھی چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کی صفات کی سچی اور پکی معرفت حاصل ہو جائے۔ تزکیہ صرف یہی نہیں پیش نظر رکھتا ہے کہ ہماری عادتیں کسی حد تک سنور جائیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم تمام مکارم اخلاق کے پیکر مجسم بن جائیں۔ تزکیہ صرف اتنے پر ہی قناعت نہیں کرتا کہ ہمارے جذبات میں ایک ہم آہنگی اور ربط پیدا ہو جائے بلکہ وہ اس پر مزید ہمارے جذبات کے اندر رقت و لطافت اور سوز و گداز کی گھلاوٹ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ تزکیہ کا مطالبہ صرف اسی قدر نہیں ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی

طرح ہمارا نفس احکام شریعت کے تحت آ جائے بلکہ اس کا اصلی مطالبہ یہ ہے کہ ہمارا نفس خدا اور اس کے رسول کے ہر حکم کو اس طرح بجا لائے جس طرح اس کے بجا لانے کا حق ہے۔ اس کا مطالبہ ہم سے صرف خدا کی بندگی ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس بات کے لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم خدا کی اس طرح بندگی کریں گویا ہم اسے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مختصر الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ تزکیہ ایمان، اسلام اور احسان تینوں کے تقاضے بیک وقت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے خدا کو اس کی تمام صفتوں کے ساتھ مانیں، پھر وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم اس کے تمام احکام کی زندگی کے ہر گوشہ میں اطاعت کریں اور پھر اس کا مطالبہ ہم سے یہ بھی ہے کہ یہ ماننا اور اطاعت کرنا محض رسمی اور ظاہری طریقہ پر نہ ہو بلکہ پورے شعور اور گہری للّٰہیت کے ساتھ ہو جس میں ہمارے اعضاء و جوارح کے ساتھ ہمارا دل بھی پورا پورا شریک ہو۔

اس چیز نے تزکیہ کو ایک مستمر جدوجہد اور ایک مسلسل تگ و دو کی چیز بنا دیا ہے۔ اس میں کوئی وقفہ یا ٹھہراؤ نہیں ہے۔ اس سفر میں کوئی موڑ یا مقام ایسا نہیں آتا ہے جہاں پہنچ کر آدمی یہ سمجھ سکے کہ بس اب یہ آخری منزل آ گئی ہے، یہاں پہنچ کے ذرا ستا لینا چاہیے یا یہیں کمر کھول دینی چاہیے۔ یہ ایک خوب سے خوب تر کی جستجو ہے، اس خوب سے خوب تر کی جستجو میں نگاہ کو کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ جس رفتار سے اعمال و اخلاق اور ظاہر و باطن میں جلا پیدا ہوتا جاتا ہے، اسی رفتار سے مذاق کی لطافت، حس کی ذکاوت اور آنکھوں کی بصارت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دامن کے پچھلے دھبے دھو کے ابھی فارغ نہیں ہوئے کہ نگاہ کچھ اور ڈھونڈ کے سامنے رکھ دیتی ہے کہ اب انہیں دھوئیے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

عمل تزکیہ کی اس فطرت نے اس کو نہایت مشکل اور دشوار کام بنا دیا ہے۔ اگر ایک شخص اس کی وسعتوں کو دیکھ کر بالفرض نہ بھی گھبرائے تو بھی ڈر رہتا ہے کہ مبادا یہ تسلسل اس کی کمر ہمت توڑ کے رکھ دے۔ لیکن اگر یہ عمل فطری طریقہ پر اس تدریج و ترتیب کے ساتھ کیا جاتا رہے جو اس کے لیے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں بتایا گیا ہے تو اس وسعت اور اس لاانتہائیت کے باوجود ایک

طالب حق کے لیے اس سے زیادہ لذیذ اور پرکشش کام کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس کی وسعتوں کو دیکھ کر دل پر ہراس ضرور طاری ہوتا ہے لیکن اس راہ میں ہر قدم پر غیب سے جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے وہ رہنمائی اس قدر تسلی بخش ہوتی ہے کہ ہمت برابر بندھی رہتی ہے اور دل بھی بے حوصلہ نہیں ہونے پاتا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت۔ ۲۹:۶۹)

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔

اس طرح اس راہ کے تسلسل سفر سے جو تکان لاحق ہوتی ہے اس کا ازالہ ان نئے نئے حقائق و لطائف کے انکشاف سے ہوتا رہتا ہے جو برابر تازہ زندگی بخشتے رہتے ہیں:

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

جدوجہد کے تسلسل کے ساتھ اگر تازہ بتازہ فتوحات برابر حاصل ہوتی رہیں اور ہر نئی کامیابی پچھلی تمام کامیابیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہو تو محنت کی یکسانی اور اس کے تسلسل کے باوجود طبیعت کند نہیں ہونے پاتی بلکہ ہر نیا مرحلہ نئے ذوق و شوق کے ساتھ شروع کرنے کا حوصلہ برابر از خود پیدا ہوتا رہتا ہے۔

تزکیہ کا اصل موضوع

اوپر کی تفصیل سے اگرچہ عمل تزکیہ کی فطرت اور اس کی وسعتوں اور مشکلوں کا اندازہ ایک حد تک کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے سارے پہلوؤں کو نگاہ کے سامنے لانے کے لیے مناسب طریقہ یہ ہوگا کہ تزکیہ کے اصل موضوع کو سامنے رکھ کر اس کے سارے اطراف کو احاطہ میں لینے کی کوشش کی جائے کیونکہ جتنے پہلو اس موضوع کے ہوں گے، لازماً اتنے ہی پہلو اس تزکیہ کے بھی ہوں گے۔ لباس ہمیشہ قامت کو سامنے رکھ کر تراشا جاتا ہے، اس وجہ سے اگر قامت کا اندازہ ہو جائے تو لباس کے طول و عرض کا اندازہ آپ سے آپ ہو جائے گا۔

تزکیہ کا موضوع ظاہر ہے کہ نفس انسانی ہے لیکن خود نفس کیا ہے؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے۔ اس سوال کو اسلام کے فلسفہ میں بھی اہمیت دی گئی ہے اور جاہلیت کے فلسفہ میں بھی اس کو خاص

اہمیت دی گئی ہے۔ ایتھنز کے معبد کے دروازہ پر سقراط کا یہ مقولہ کندہ تھا کہ: اے انسان! تو اپنے آپ کو پہچان! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی حکمت میں معرفت نفس کو حصول تزکیہ کی راہ میں بنیادی چیز خیال کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ مقولہ مشہور ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ. (جس نے اپنے نفس کو پہچانا تو گویا اس نے اپنے رب کو پہچانا)۔

اس وجہ سے ضروری ہے کہ خود نفس کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ یہ کن صفات اور کن تقاضوں سے مرکب ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا تزکیہ کن کن باتوں کا مقتضی ہوگا۔

نفس کے تجزیہ سے ہمارا مطلب یہاں اس طرح کا تجزیہ نہیں ہے جس طرح کا تجزیہ فلسفی لوگ کسی چیز کی ماہیت وحقیقت معلوم کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک نہ تو نفس کی حقیقت وماہیت معلوم ہو سکتی ہے اور نہ ہمارے مقصد کے لیے اس کی ماہیت وحقیقت کا معلوم ہونا کچھ ضروری ہے۔ ہم صرف نفس کی صفات اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور اس کے صرف ان عقلی واخلاقی پہلوؤں کو سامنے لائیں گے جو علم تزکیہ میں زیر بحث آتے ہیں یا آنے چاہئیں۔

نفسِ انسانی کے مختلف پہلو

اب آیئے غور کیجیے کہ ہمارے نفس کے — جس کو ہم عربی میں انا اور اردو میں میں سے تعبیر کرتے ہیں — کیا کیا پہلو ہیں جن پر تزکیہ کا عمل واقع ہو سکتا ہے اور جن کے تزکیہ کے بغیر اس کا اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھنا ناممکن ہے۔

ہم اپنے نفس پر جب غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے جو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں اور جو بدیہی طور پر عمل تزکیہ کے تحت آتے ہیں، وہ دو ہیں:

ایک یہ کہ ہمارا نفس ادراک کرتا ہے۔

دوسرا یہ کہ ہمارا نفس عمل کرتا ہے۔

ادراک ہمارے نفس کا اصلی جوہر ہے، یہ نہ ہو تو انسان اینٹ پتھر سے زیادہ وقعت دیے جانے کے لائق نہیں ہے۔ پھر یہ ادراک، جیسا کہ ظاہر ہے، صرف جزئیات ہی کا ادراک نہیں ہے

بلکہ کلیات اور حقائق کا ادراک بھی ہے اور ہمارے نفس کی یہی وہ صفت ہے جو در حقیقت اس کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے ورنہ وہ ایک جانور سے زیادہ اہمیت دیے جانے کا مستحق نہ قرار پاتا۔ یہ کلیات کا ادراک اس کے لیے تعقل وتفکر کی وسیع راہیں کھولتا ہے، اسی سے اس کے تمام علوم وافکار اور تمام عقائد ونظریات وجود میں آتے ہیں، اسی کی مدد سے وہ ظاہر سے باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچتا ہے، اسی کی رہنمائی میں وہ مخلوق سے خالق اور مصنوع سے صانع تک رسائی حاصل کرتا ہے، اسی کی روشنی میں وہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کی صفتوں اور اس کی پسند اور ناپسند کا اندازہ کرتا ہے اور پھر اسی کی مدد سے وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے لیے زندگی کی صحیح روش کیا ہے اور اس پر بحیثیت ایک انسان کے کیا فرائض اور کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو اسے کس احساس مسئولیت اور کس مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

اندازہ کیجیے کہ ہمارے نفس کا یہ پہلو کس قدر اہم ہے۔ بدیہی طور پر نظر آتا ہے کہ نفس کے دوسرے تمام پہلو اسی کے تابع ہیں، اگر اس کی اصلاح ہو تو پورے نفس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اگر اس کے اندر کوئی ادنیٰ خرابی بھی موجود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ یہ انسان کی فکر ہی ہے جو اس کو گمراہ یا راہ یاب بناتی ہے۔ اگر فکر کا ایک قدم بھی غلط اٹھ جائے تو سارا فلسفہ ہی غلط ہو کے رہ جائے اور نتائج نکالنے میں کوئی معمولی فروگزاشت بھی ہو جائے تو علم کی ساری عمارت ہی دھڑام سے زمین پر آ رہے اور پھر اس خرابی کے نتیجہ کے طور پر لازماً زندگی کے ہر گوشہ میں فساد پھیل جائے۔

تزکیہ علم وادراک

علم وادراک کی اس اہمیت کے سبب سے تزکیہ میں علم وادراک کے تزکیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں مقدم شے یہ ہے کہ پہلے وہ بنیادی سوالات طے کر دیے جائیں جو فکر کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ ہم خالق ہیں یا مخلوق؟ مختار ہیں یا مجبور؟ غیر مسئول ہیں یا کسی کے آگے جوابدہ؟ اگر کسی کے آگے جوابدہ ہیں تو اس کی صفات کیا ہیں؟ ہماری زندگی کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟ وہ کیا پسند کرتا ہے،

کیا ناپسند کرتا ہے؟ اگر کسی روش کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے اختیار کرنے والے کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے؟ ان سارے سوالوں کا نہایت قطعی اور حتمی جواب نفس کو علمی کجرویوں اور گمراہیوں سے بچانے کے لیے ناگزیر ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان سوالوں کے جو صحیح اور قطعی جوابات مہیا کیے جائیں ان پر تقلید و جمود اور غفلت و نسیان کا گرد و غبار نہ جمنے پائے اور اگر خدانخواستہ کسی گوشہ میں زنگ لگتا ہوا نظر آئے تو اس کو مانجھ کر برابر صاف کیا جاتا رہے۔

تزکیۂ عمل

اسی طرح دوسرے پہلو یعنی عمل کو لیجیے۔ یہ پہلو بھی علم ہی کی طرح وسیع ہے۔ انسان کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا ہے جس میں وہ کوئی نہ کوئی عمل نہ کرتا ہو، اور اس کا یہ عمل اس کے نفس پر کوئی بھلا یا برا چھاپ نہ چھوڑتا ہو۔

ان اعمال کے متعلق صرف جائز اور ناجائز کا ہی سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ جائز و ناجائز سے زیادہ اہمیت رکھنے والا سوال ان کے محرکات سے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ انسان کے اعمال کی محرک کوئی ایک ہی شے نہیں ہوتی، بلکہ مختلف محرکات ہیں جو اس کو عمل کے لیے اکساتے ہیں اور ان سے ہر محرک کا عمل کے مزاج پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ ایک ہی عمل ایک محرک کے تحت نیکی کا عمل بنتا ہے اور وہی عمل دوسرے محرک کے تحت بدی کا عمل بن جاتا ہے۔

پھر ہمارے اندر جتنے بھی محرکات ہیں، ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کن پر اعتماد کیا جائے، کون ہیں جن کی ترغیب و تحریک قبول کی جائے اور کون ہیں جن کی ترغیب و تحریک آنکھ بند کر کے قبول کرنے میں اندیشے اور خطرے ہیں؟

کبھی ہم کوئی عمل کسی ضرورت کی تحریک سے کرتے ہیں۔ مثلاً بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتے ہیں، پیاس لگتی ہے تو پانی پیتے ہیں، تکان محسوس ہوتی ہے تو آرام کرتے ہیں۔

اسی طرح ہم بہت سے عمل خواہشوں کی تحریک سے کرتے ہیں۔ مثلاً شہرت و ناموری کے حصول کے لیے بہادری کے کام کرتے ہیں، ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لیے رفاہِ عام کے کارنامے انجام دیتے ہیں اور دولت مند بننے کے لیے صنعت و حرفت اور تجارت کے کاروبار

پھیلاتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس ہمارے بہت سے کام جذبات کے تحت ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی سے محبت اور کسی سے نفرت کرتے ہیں، کسی پر حسد اور کسی پر مہربانی کرتے ہیں، کسی پر احسان کرتے ہیں اور کسی سے انتقام لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہم گہرے تجزیہ نفس سے یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بہت سے اعمال ایسے بھی ہیں جن کا محرک مذکورہ تمام محرکات سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہمارے تعقل و تفکر اور ایثار و بے غرضی کے وہ سارے کام آتے ہیں جن کے اندر اپنے باریک ترین تجزیہ سے بھی ہم کسی نفسانی شائبہ کا سراغ نہیں پاتے ہیں۔ اس محرک کو ہم **روح ملکوتی یا نفس ناطقہ** کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ چاروں قسم کے محرکات ہمارے اندر کبھی الگ الگ کام کرتے ہیں اور کبھی ملے جلے ہوئے ہوتے ہیں۔ نیز یہ اپنے فعل میں افراط و تفریط کے بھی مرتکب ہوتے ہیں، اس وجہ سے ہر عمل میں ان کا تجزیہ کرتے رہنا اور ان کی افراط و تفریط پر ان کا محاسبہ کرتے رہنا اور ان کو ان کے فطری و شرعی حدود کا پابند بنانا ایک بڑا طویل سلسلہ ہے۔ اس سارے سلسلہ کو ایک خاص نظم کے تحت منظم کرنا بھی تزکیہ کے فرائض میں داخل ہے۔

تزکیۂ تعلقات و معاملات

علم و عمل اور جذبات و محرکات کے بعد ہمارے نفس کا دوسرا پہلو اس کے تعلقات و معاملات کا ہمارے سامنے آتا ہے اور یہ بھی اپنی وسعت میں کسی طرح مذکورہ پہلوؤں سے کم نہیں ہے بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

نفس کے تعلقات میں سب سے پہلے جو تعلقات زیر بحث آتے ہیں وہ نفس کا تعلق خدا کے ساتھ اور خود اپنے ساتھ ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو خالق نہیں بلکہ مخلوق تسلیم کرتے ہیں تو یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ خالق کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ اور وہ بالکل صحیح بنیادوں پر کس طرح قائم ہو سکتے ہیں؟

اس کے بعد دوسرے درجہ میں خود اپنے نفس کا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہم جس چیز کو انا یا میں سے تعبیر کرتے ہیں وہ بدیہی طور پر بہت سی چیزوں کا مالک یا امین ہے۔ اس کے قبضہ میں ایک جسم ہے، دل و دماغ ہیں، قوتیں اور قابلیتیں ہیں، احساسات اور جذبات ہیں، آخر وہ ان ساری چیزوں کے ساتھ کس طرح معاملہ کرے گا؟ کیا وہ ان ساری چیزوں کا مالک ہے اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کو جس طرح چاہے استعمال کرے یا وہ ان چیزوں کا امین ہے اور ان کو وہ صرف ان حدود کے اندر ہی استعمال کرسکتا ہے جو امانت رکھنے والے کی طرف سے ان کے استعمال کے لیے مقرر کردی گئی ہیں؟ اگر دوسری شکل ہے تو پھر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ وہ حدود کیا ہیں جن کی نگہداشت اس سلسلہ میں لازمی ہے؟ اور پھر انہی کے ساتھ ان ظاہری اور باطنی صفات کا جاننا بھی ناگزیر ہوگا جو اس نگہداشت کے فرض سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں۔

خدا اور اپنی ذات کے بعد نفس کا تعلق اپنے ماحول سے جڑتا ہے۔ انسان کے متعلق یہ حقیقت محتاج بحث نہیں ہے کہ وہ ایک اجتماعی وجود ہے۔ وہ جب بھی پایا جاتا ہے اور جہاں کہیں بھی پایا جاتا ہے، کسی خاندان کے فرد، کسی معاشرہ کے رکن، کسی ریاست کے شہری ہی کی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔ ایک بیل جس طرح اپنے پھیلنے، اپنے پروان چڑھنے اور اپنے پھلنے پھولنے کے لیے لازماً کچھ سہاروں کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنے نشوونما اور اپنی ترقی اور کمال کے حصول کے لیے ان سہاروں کا محتاج ہے۔ ان سہاروں سے الگ ہوکر اول تو اس کا وجود پایا ہی نہیں جاتا اور اگر پایا جاتا بھی تو اس طرح کہ اس کی ساری صلاحیتیں بالکل ٹھٹھر کے رہ جاتی ہیں۔ اس وجہ سے تزکیہ ہمارے نفس کے سارے تعلقات کا جائزہ لے کر ان کو صحیح بنیادوں پر استوار کرتا ہے تاکہ وہ اس معراج کمال تک پہنچ سکے جہاں تک وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے پہنچ سکتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تزکیہ کوئی مفرد اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے اطراف دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے نفس کا ہر گوشہ اور ہماری زندگی کا ہر پہلو — خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، عقلی ہو یا عملی، اخلاقی ہو یا اجتماعی و سیاسی — اس کے تحت آتا ہے۔ ہمارے نفس کے تزکیہ کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ اس کے کسی ایک گوشہ میں اجالا ہوگیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے

ہر گوشہ میں روشنی پھیل گئی، ہمارا علم بھی جگمگا اٹھا، ہمارا عمل بھی پاکیزہ ہوگیا اور ہمارے تعلقات و معاملات بھی درست ہوگئے۔

اب ہم تزکیہ کی ان تینوں قسموں — تزکیہ علم، تزکیہ عمل اور تزکیہ تعلقات پر الگ الگ حصوں میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

تزکیۂ علم

باب ۳

تزکیۂ علم

علم کے تزکیہ پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مختصراً یہ بتائیں کہ حقیقی علم کیا ہے اور اس علم کے حصول کے وسائل و ذرائع کیا ہیں۔

علمِ حقیقی کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے

علم خواہ کسی معمولی سے معمولی بات کا بھی ہو، بہرحال علم ہے اور **جہل** کے مقابل میں وہ انسان کو فطرتاً عزیز و مرغوب ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس علم کی پیاس انسان کے اندر سب سے زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہے، جس علم کو وہ سب سے پہلے ڈھونڈتا ہے اور جس علم کو وہ دوسرے تمام علموں پر ترجیح دیتا ہے یہ علم محض اس کائنات کے چند طبیعی قوانین و ضوابط کے جان لینے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم چند مابعد الطبیعی سوالات کے اطمینان بخش حل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سوالات اگرچہ مابعد الطبیعی ہیں، اگرچہ ان سوالات کا تعلق انسان کے بالکل قریبی ماحول سے براہِ راست نہیں ہے اور اگرچہ ان کے حل ہونے سے بظاہر انسان کی کوئی مادی ضرورت بھی پوری نہیں ہوتی تاہم ہر معقول انسان کے فکر و ذہن پر ان کا اس قدر غلبہ ہوا کرتا ہے کہ آدمی اپنے بالکل پاس کے سارے سوالات کو چھوڑ کر سب سے پہلے انہی مابعد الطبیعی

سوالات کے حل کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

بادی النظر میں یہ بات کچھ عجیب سی ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن اگر گہری نگاہ سے انسان کا ذہنی وفکری تجزیہ کیا جائے تو اس واقعہ سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اسباب خواہ کچھ ہی ہوں لیکن انسان اسی ترتیب سے سوچتا ہے اور اسی ترتیب سے وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے سامنے پہلے یہ سوال نہیں آتا کہ اس کا جو جسم ہے وہ کن اجزا سے بنا ہوا ہے؟ بلکہ پہلے وہ اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کو پیدا کس نے کیا ہے؟ اسی طرح اس کے ذہن میں پہلے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جو پانی وہ پی رہا ہے، اس میں کن کن اجزا کی کتنی کتنی مقدار شامل ہے اور جو غذا وہ کھا رہا ہے وہ کن کن وٹامنی جوہروں پر مشتمل ہے؟ بلکہ ان سوالات کے پیدا ہونے سے پہلے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذات کون ہے جس نے اس کے لیے بلا کسی استحقاق کے یہ خوانِ کرم بچھایا ہے اور اس ذات کی صفتیں کیا ہیں اور اس کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ علیٰ ہٰذا القیاس اس کے ذہن کو پہلے اس تحقیق کی خواہش پریشان نہیں کرتی کہ جس زمین پر وہ چل پھر رہا ہے وہ گول ہے یا چپٹی، ساکن ہے یا متحرک، بلکہ سب سے پہلے اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس وسیع زمین کو اتنے عجائب کے ساتھ وجود میں کون لایا ہے؟ اور وہ اس کو وجود میں لا کر خود کہاں چھپ کے بیٹھا ہوا ہے؟ وہ اپنے اوپر اس سقف نیلگوں کو، اور اس کے ساتھ ان اربوں ستاروں اور چاند اور سورج کو دیکھ کر نہ تو اس بات کے دریافت کرنے کے درپے ہوتا ہے کہ یہ جو ایک چھت سی نظر آرہی ہے فی الواقع یہ چھت ہی ہے یا یہ محض ایک خلائے لامتناہی ہے؟ وہ دوربین لے کر نہ چاند کے اندر نظر آنے والے دھبوں کی تحقیقات کے لیے دوڑتا ہے، نہ سورج اور زمین کے درمیان کے فاصلہ کی پیمائش کی فکر میں سرگرداں ہوتا ہے۔ بلکہ سب سے پہلے اگر اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے حل کے لیے بے چین ہوتا ہے تو وہ یہ سوال ہے کہ وہ کون ہے جو اتنی حیرت انگیز چیزوں کو وجود میں لایا ہے اور ان چیزوں کے وجود میں لانے سے اس کا مقصد کیا ہے؟ [1]

انسان کے سوچنے کا یہ انداز اس کے وہمی پن کا یا محض اس کی ذہنی اپج کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ اس کو پاس کی چیزیں چھوڑ کر دور کی کوڑی لانے کا کچھ شوق ہے۔ بلکہ

فی الواقع سوچنے کی صحیح ترتیب ہی یہی ہے۔ یہی سوال درحقیقت وہ سوال ہے جس کے حل ہونے سے اس کی روح اور اس کی عقل کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ سرا ہے جو مل جائے تو اس کائنات کا سارا الجھاؤ لمحہ بھر میں سلجھ سکتا ہے اور اگر نہ ملے تو انسان قیامت تک سر مارتا رہے لیکن وہ کسی ایک گرہ کو بھی نہیں کھول سکتا اور اگر کوئی گرہ کھولتا بھی ہے تو پھر اس گرہ کے اندر سے ہزاروں گرہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سوال کو حل کیے بغیر اس دنیا میں انسان ہوائی جہازوں پر اڑتے اور ایٹمی آلات جیسی خطرناک چیزیں ایجاد کرنے کے باوجود بھی اس کائنات کے متعلق بالکل اندھیرے ہی میں رہتا ہے۔ وہ ایک گھر کے اندر ہے لیکن اس کو کچھ پتا نہیں کہ یہ گھر کس کا ہے؟ وہ اس گھر کی مختلف چیزوں کو توڑ پھوڑ رہا ہے، ان کو الٹ پلٹ رہا ہے، ان کو اپنے استعمال میں لا رہا ہے لیکن اس کو کچھ خبر نہیں کہ اس کے یہ سارے تصرفات اس گھر والے کی مرضی کے مطابق بھی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کی بے شمار نعمتوں سے آزادانہ متمتع ہو رہا ہے لیکن اسے کچھ معلوم نہیں کہ ان تمام نعمتوں کے جواب میں اس گھر والے کی طرف سے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد کی گئی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کے ہر حصے میں دندنا رہا ہے لیکن اسے کچھ علم نہیں کہ اس گھر والے کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس گھر کو گھر والے نے اس کو ہمیشہ کے لیے سونپ دیا ہے یا اس میں صرف اس کو چند دنوں کی عارضی سکونت کی اجازت دی ہے؟ اگر عارضی سکونت کی اجازت دی ہے تو اس کے ساتھ کچھ شرطیں بھی ہیں یا یہ حق تصرف بالکل بے قید و شرط ہے؟ اگر کچھ شرطیں ہیں تو وہ شرطیں کیا ہیں؟ اور اگر شرطیں پوری نہ ہو سکیں تو گھر والا ان کے متعلق کوئی باز پرس بھی کرے گا یا نہیں؟

غور کیجیے کہ کیا کسی کودن سے کودن آدمی کی نسبت بھی یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی عالیشان اور آراستہ و پیراستہ محل کے اندر جا اترے گا، اس کی ہر چیز سے بے تکلف فائدہ اٹھانا شروع کر دے گا، اس کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک کونے کی تحقیق و تفتیش شروع کر دے گا، اس کے مخفی خزانوں اور پوشیدہ دفینوں تک کی چھان بین کرنے لگ جائے گا اور یہ سب کچھ کرنے سے پہلے وہ یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرے گا کہ اس محل کا مالک کون ہے؟ وہ اس کو اپنے محل میں گھسنے دینے کا روادار بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر بالفرض وہ اس کو اس میں کچھ تصرف کرنے کی اجازت بھی دے رہا ہے تو اس پر اس نے کچھ پابندیاں اور شرطیں بھی عائد کی ہیں یا بغیر کسی پابندی

اور بغیر کسی شرط ہی کے اس نے اپنا پورا محل اس کے حوالے کر دیا ہے؟ ایک چور اور ایک نقب زن تو بلا شبہ کسی تحقیق و تفتیش کے چکر میں پڑے بغیر اس طرح کے کسی محل میں جا گھسے گا اور اس میں من مانے تصرفات بھی شروع کر دے گا لیکن کسی شریف آدمی کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کبھی اس قسم کی جسارت کر سکے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عاقل آدمی کے اندر سب سے پہلے اس کائنات کے متعلق یہ مابعد الطبیعی سوالات جو پیدا ہوتے ہیں وہ عین اس کی فطرت کی جڑ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی سوالات ہیں جو پیدا ہونے چاہئیں اور انہی کے صحیح جواب سے دراصل اس کے روح و دل کو حقیقی طمانیت و مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور انہی سے علم حقیقی کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔

جب آدمی کو اس کائنات کے خالق و مالک کا سراغ مل گیا تو اس کو گویا وہ کلید مل گئی جس سے علم حقیقی کے تمام دروازے کھولے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے فکر کے لیے وہ نقطۂ آغاز مل جاتا ہے جہاں سے تحقیق و تفتیش کا صحیح قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد انسان یہ سوال طے کر سکتا ہے کہ یہ دنیا کہاں سے آ گئی ہے۔ اس کے بعد وہ خود اپنی حیثیت اور اپنے مرتبہ کو بھی متعین کر سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ آفاق و انفس کے مطالعہ سے اس خالق و مالک کی صفتوں کا بھی علم حاصل کر سکتا ہے اور ان صفتوں کو خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے کسوٹی بھی بنا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے یہ سوال حل کر لینا بھی کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ اس کے لیے زندگی بسر کرنے کی پسندیدہ روش کیا ہے اور ناپسندیدہ روش کیا ہے؟ بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی سعادت و شقاوت اور قوموں کے عروج و زوال سے متعلق کیا اصول جاری ہیں؟

انسان کی انفرادی و اجتماعی سعادت سے متعلق یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جو سب سے پہلے حل ہونے چاہئیں۔ ان کے حل ہو جانے کے بعد جہاں تک انسان کی عقلی و روحانی طمانیت کا تعلق ہے وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔ رہی اس کی مادی و جسمانی آسائش تو وہ اپنی سعی و کوشش اور اپنے تجربی علم کے ذریعے سے قدرت کے قوانین کے دریافت کرنے اور ان کو اپنے معاشی و تمدنی مصالح کی ترقی میں استعمال کرنے کا سلیقہ جس قدر بڑھاتا جائے گا اسی قدر اپنی معاشی خوشحالیوں

میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔

خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم

اس تفصیل سے ایک حد تک یہ بات تو واضح ہو گئی کہ حقیقی علم، جس سے انسان کی روح اور اس کے دل کو طمانیت و تسلی حاصل ہوتی ہے اس کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے۔ لیکن یہاں ہمیں مختصراً یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس مسئلہ کی وضاحت خاص طور پر اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ ہمارے ارباب تصوف کے یہاں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے معاً آدمی کا ذہن خدا کی ذات اور اس کے انوار و تجلیات کے مشاہدہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم اس لفظ سے ہرگز اس قسم کی کوئی چیز مراد نہیں لے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سے خدا کے متعلق صرف ان باتوں کا جاننا مراد ہے جن کو انسان جان سکتا ہے اور جن کو جان لینے کے بعد اس کی عقل مطمئن ہو جاتی ہے کہ معرفت الٰہی سے متعلق جس حد تک اس کے حیطۂ ادراک میں ہے وہ یہی ہے۔ اس سے آگے نہ اس کی رسائی ہے اور نہ اس سے آگے کا علم اس کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً:

(۱) تفصیلی دلائل کے ساتھ اس بات کا علم کہ خدا ہے۔

(۲) پوری وضاحت کے ساتھ خدا کی صفات کا علم۔

(۳) اس بات کا علم کہ فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو وہ پسند کرتا ہے اور فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو ناپسند کرتا ہے۔

(۴) اس بات کا علم کہ وہ افراد اور جماعتوں کے ساتھ فلاں فلاں قوانین کے تحت معاملہ کرتا ہے۔

(۵) اس بات کا علم کہ مرنے کے بعد بھی اسی سے سابقہ پڑنے والا ہے، اور وہ اپنے نیک اور بد بندوں کے ساتھ اس اس طرح کا معاملہ کرنے والا ہے۔

خدا کے متعلق اگر مذکورہ بالا باتیں ایسے دلائل کے ساتھ معلوم ہو جائیں جو دل کے اندر اطمینان پیدا کر دیں تو پھر اس کی معرفت کے لیے کسی اور بات کے جاننے کی ضرورت باقی

نہیں رہ جاتی اور اگر یہ باتیں ایک شخص کو معلوم نہ ہوں تو اگرچہ وہ اپنے خیال میں ہر آن تجلیات و انوار کا مشاہدہ ہی کر رہا ہو لیکن درحقیقت وہ خدا سے بالکل بے خبر ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس معرفت کے مدارج ہوا کرتے ہیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ کیت و کیفیت کے اعتبار سے مختلف عارفین کی معرفت میں فرق ہوا کرتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ معرفت کسی شخص کے لیے محض قال ہوا کرتی ہے اور کسی کے لیے حال بھی بن جایا کرتی ہے۔ لیکن معرفت کی دسترس میں بہر حال وہی چیزیں آتی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ ان سے آگے بڑھ کر اگر انسان خدا کی ذات کا مشاہدہ یا اس کی ذات کی معرفت حاصل کرنا چاہے یا ذاتِ بحت کی تجلیات اور اس کے انوار دیکھنا چاہے تو یہ چیز اس کے امکان سے باہر ہے۔ انسان کو جو عقل ملی ہوئی ہے اس کی رسائی صرف خدا کی صفات ہی تک ہے، خدا کی ذات کا وہ کوئی تصور کر ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح انسان کو جو حواس عطا ہوئے ہیں وہ صرف خدا کی نشانیوں اور اس کی آیتوں ہی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، خدا کی تجلیات اور اس کے انوار کا مشاہدہ ان کی قوت برداشت اور ان کے تحمل سے باہر ہے۔ قرآن مجید میں یہود کے متعلق بیان ہوا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک وہ ان کو ذاتِ الٰہی کا کھلم کھلا مشاہدہ نہیں کرائیں گے، اس وقت تک وہ ان کی یہ بات ہرگز باور نہیں کریں گے کہ خدا ان سے کلام کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبہ کو پسند کرنے اور اس کو قبول کرنے کی بجائے اس کو ان کی سرکشی اور حماقت کا نتیجہ قرار دیا اور بجائے اس کے کہ ان کی یہ خواہش معرفتِ الٰہی کی جستجو کا درجہ پاتی اور اس کے جواب میں ان کے لیے تجلیات و انوار کے دروازے کھلتے، ان کی یہ خواہش گستاخی قرار پائی اور اس کی سزا میں وہ جلال خداوندی کی ذانٹ سے بے ہوش کر دیے گئے:

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝

(البقرۃ۔۲:۵۵۔۵۶)

اور (یاد کرو) جبکہ تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم تمہارا یقین کرنے والے نہیں ہیں جب تک ہم خدا کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں۔ تو تم کو کڑک نے آ دبوچا اور تم دیکھتے رہ گئے۔ پھر ہم نے تمہاری

موت کے بعد تمہیں اٹھایا تاکہ تم شکر گزار ہو۔

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ انسان کے لیے خدا کی ذات کا مشاہدہ بالکل محال ہے، وہ خدا کو صرف اس کی نشانیوں اور اس کے کرشموں کی اوٹ ہی سے دیکھ سکتا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن مجید میں مذکور ہے کہ انہوں نے بھی خدا کی ذات کا مشاہدہ کرنے کی تمنا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا کہ تم میری ذات کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ میری تجلّیٔ ذات کی تاب تو پہاڑ بھی نہیں لاسکتا تو تم کس طرح لاسکو گے؟ تم صرف میری نشانیوں کا اور میری صفات کے مظاہرہ کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ظاہر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَ کَلَّمَہٗ رَبُّہٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَکَ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (الاعراف۔۷:۱۴۳)

اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب! مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ فرمایا: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے! البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ سکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب ہوش میں آیا، بولا: تو پاک ہے! میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

یہی بات احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

حجابہ النور. لو کشفہ لاحرقت سبحات وجھہ ما انتھی الیہ بصرہ من خلقہ. (صحیح مسلم: کتاب الایمان باب ۷۹)

اس کا حجاب نور ہے۔ اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو اس کے چہرہ کے انوار سے وہ ساری مخلوق جل کے رہ جائے جہاں تک اس کی نظر پہنچے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ذات الٰہی اور اس کی تجلیات کے مشاہدہ کی تاب حضرات انبیائے کرام بھی نہ لا سکے چہ جائیکہ عام لوگ! اس وجہ سے جو لوگ خدا کی ذات اور اس کی تجلیات کے مشاہدہ کے درپے ہوتے ہیں اور اس غرض کے لیے مجاہدے اور مراقبے کرتے ہیں' ہمارے نزدیک وہ ایک سعیٔ لاحاصل میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کے بارے میں یہ کہنا بھی کچھ بے جا نہ ہوگا کہ یہ لوگ درحقیقت اسی گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں جس گستاخی کے مرتکب بنی اسرائیل ہوئے۔

بعینہٖ یہی حقیقت مختلف طریقوں سے حدیثوں میں بھی سمجھائی گئی ہے کہ اپنی عقل کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور کرنے کی چھوٹ آدمی اسی وقت تک دے جب تک وہ اس کی صفات و آیات اور اس کی شانوں اور اس کے کرشموں پر غور کرے۔ جب وہ حد سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات سے متعلق سوالات اٹھانے شروع کر دے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ وہیں رک جائے اور شیطان کے فتنوں سے خدا کی پناہ مانگے کیونکہ یہ سوالات اس کے ذہن میں شیطان کی وسوسہ اندازی ہی کے سبب سے پیدا ہو رہے ہیں اور اس کا نتیجہ حیرانی و درماندگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ شیطان اس چکر میں اس کو صرف اس لیے ڈال رہا ہے کہ اس طرح اس کو کفر اور الحاد میں مبتلا کر دے۔ اسی حقیقت کو مندرجۂ ذیل حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

قال رسول اللہ ﷺ: یاتی الشیطان احد کم فیقول من خلق کذا؟ من خلق کذا؟ حتٰی یقول من خلق ربک؟ فاذا بلغہ فلیستعذ باللہ فلینتہ۔

(صحیح البخاری: کتاب بدء الخلق باب ۱۱)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور یہ سوال شروع کر دیتا ہے کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی؟ فلاں چیز کس نے بنائی؟ یہاں تک کہ یہ سوال کرنے لگتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو اس کو چاہیے کہ شیطان کے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگے اور آگے سوچنا بند کر دے۔

معرفت الٰہی حاصل کرنے کا طریقہ

معرفت الٰہی کی اہمیت اور اس کا اصلی مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس معرفت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب اس مسئلہ پر غور کرنے والے مختلف گروہوں نے مختلف دیا ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے، اس وجہ سے ہم صرف تین گروہوں سے بحث کریں گے: ایک فلاسفہ، دوسرے متکلمین، تیسرے صوفیہ۔ ان گروہوں کے اندر بھی اس سوال کے جواب میں بہت کچھ اختلاف ہے اور اس اختلاف کے سبب سے ان میں سے ہر گروہ مختلف فرقوں میں بٹ گیا ہے۔ ہم ان اختلافات سے قطع نظر کر کے اس بارہ میں عام فلاسفہ، عام متکلمین اور عام صوفیہ کی جو رائے ہے وہ اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

فلاسفہ کی رائے

فلاسفہ خواہ قدیم ہوں یا جدید، ان میں سے جو کسی نوعیت سے بھی خدا کے قائل ہیں — اور انہی سے یہاں بحث ہے — وہ خدا کی معرفت کے لیے انسان کی فطرت اور اس کی عقل کو بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیدا کرنے والے نے انسان کو عقل اور فطرت کی رہنمائی دے کر اس کو کسی مزید غیبی رہنمائی کی ضرورت اور اس کی مداخلت سے بالکل مستغنی کر دیا ہے۔ عقل کا چراغ ہر تاریکی میں اجالا کرنے کے لیے ان کے نزدیک کافی ہے۔ اس اندرونی ہادی کی رہنمائی حاصل ہو جانے کے بعد کسی معاملہ میں بھی انسان ان کے خیال میں اس بات کا محتاج نہیں رہا کہ وہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے اپنے سے کسی خارج رہنما کی طرف متوجہ ہو۔ ان کے نزدیک عقل انسان کے سارے طبیعی اور مابعد الطبیعی سوالات حل کر سکتی ہے اور اگر وہ نہیں حل کر سکتی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری عقل ان سوالات کو حل کرنے کے قابل ہی نہیں ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ابھی وہ ترقی کے اس درجہ پر نہیں پہنچی ہے کہ ان سوالات کو حل کر سکے۔ عقل کی رہنمائی پر یہ اعتماد صرف انہی فلسفیوں نے نہیں ظاہر کیا ہے جو رسالت اور نبوت کے سلسلہ کے منکر ہیں بلکہ

سلسلہ نبوت و رسالت کے قائل فلسفیوں نے بھی عقل پر یہی اعتماد ظاہر کیا ہے۔ وہ بھی فلسفہ کے زیر اثر عقل کے ساتھ اس قدر حسن ظن رکھتے ہیں کہ اس کو انسان کی رہنمائی کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور اگر مذہب کے زیر اثر دبی زبان سے کسی حد تک نبی اور رسول کی رہنمائی کی ضرورت تسلیم کرتے بھی ہیں تو محض عوام کالانعام کے لیے، فلاسفہ اور حکماء کو انبیاء کی رہنمائی کی ضرورت سے مستغنی کر دیتے ہیں۔

متکلمین کی رائے

اس کے بالکل برعکس نظریہ ہمارے متکلمین کی اکثریت (بالخصوص اشاعرہ) کا ہے۔ یہ لوگ انسان کی عقل اور فطرت کو ان مابعد الطبیعی سوالات کے حل کے لیے، جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بالکل ناکارہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک عقل صرف انہی سوالات کا کچھ الٹا سیدھا حل معلوم کر سکتی ہے جن کا تعلق اس عالم محسوس سے ہے۔ اس عالم محسوس سے ماوراء حقائق تک پہنچنے کے لیے ان کے نزدیک عقل کے پاس کوئی ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ان معاملات میں انسان ایک عاقل مخلوق ہونے کے باوجود، ان لوگوں کے نزدیک، بالکل ایک مادر زاد اندھے سے مشابہ ہے جو چند قدم چلنے کے لیے بھی کسی عصاکش کا محتاج ہوا کرتا ہے اور اگر عصاکش نہ ہو تو ہر قدم پر یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑے۔ چنانچہ عام فلاسفہ انسان کو کسی مافوق عقل رہنمائی سے جس شدت کے ساتھ بالکل مستغنی ثابت کرتے ہیں، ان کے نزدیک، ان سارے سوالات کو جو انسان کی زندگی سے حقیقی تعلق رکھنے والے ہیں، صرف خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء ہی حل کر سکتے ہیں۔ عقل سے یہ لوگ اس قدر بدگمان ہیں کہ عقل نہ صرف یہ کہ ان سوالات کا کوئی حل دریافت نہیں کر سکتی بلکہ ان سوالات کے جو حل انبیاء بتاتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک، عقل ان کی قدر و قیمت بھی نہیں بتا سکتی۔ واضح تر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک انبیاء کی بتائی ہوئی باتوں میں عقل کو سرے سے کوئی دخل ہے ہی نہیں۔ یہاں تک کہ خود نبی کے پہچاننے کے لیے بھی ان لوگوں کے نزدیک کوئی عقلی کسوٹی موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ نبی کو صرف اس کے معجزات کے ذریعہ سے پہچانتے ہیں، اس کی تعلیم، اس کی حکمت، اس کے کارناموں اور اس کے اخلاق کو اس کے

حجت ماننے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلم اخلاقی اصولوں کے بارہ میں بھی عقل اور انسان کی فطرت کو کوئی فیصلہ کن معیار تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نظریہ کے لحاظ سے سچ کی اچھائی اور جھوٹ کی برائی بھی کوئی عقلی اور وجدانی شے نہیں ہے۔ انبیاء نے سچ کو اچھا کہا اس وجہ سے وہ اچھا ہے، اور جھوٹ کو برا کہا اس وجہ سے وہ برا ہے۔ اگر وہ اس کے بالکل برعکس فیصلہ دے جاتے تو عقلی حیثیت سے جھوٹ کے اچھے ہونے اور سچ کے برے ہونے میں بھی کوئی قباحت، ان کے خیال میں، نہیں تھی۔

صوفیہ کی رائے

صوفیہ کے نزدیک خدا کی معرفت حاصل کرنے کا اصلی ذریعہ وجدان، کشف اور مشاہدہ ہے۔ ان لوگوں نے معرفت کا معیار، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس قدر اونچا رکھا ہے کہ وہاں تک عقلی اور استدلالی علم کے پہنچنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ جس علم کی بنیاد استدلال پر ہو وہ ان حضرات کے نزدیک ایک پائے چوبیں ہے اور اس پائے چوبیں کے ذریعے سے معرفت کی منزل نہیں طے کی جا سکتی:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی میں عقل کی نارسائیوں پر جو کچھ لکھا ہے اور جس زور سے لکھا ہے یہ ان کے اکیلے کی آواز نہیں ہے بلکہ انہوں نے درحقیقت صوفیہ کے ہر طبقہ کی ترجمانی کر دی ہے۔

حضرات صوفیائے کرام کی یہ رائے صرف فلاسفہ اور حکماء ہی کے علم کے بارہ میں نہیں ہے کہ وہ معرفت کے مقصد کے نقطۂ نظر سے ناکارہ ہے اور اس کی حیثیت ایک پائے چوبیں کی ہے بلکہ وہ علم شریعت بھی جس کی بنیاد وحی پر ہے، ان حضرات کے نزدیک، حقیقی معرفت کے مقصد کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ اکابر صوفیہ کھلم کھلا شریعت کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ بہر حال اس کی حیثیت ان کی نظر میں محض علم ظاہر کی ہے اور یہ علم ظاہر ان کے

نزدیک العلم باطنکے برابر نہیں ہے جس کو وہ علم حقیقی سمجھتے ہیں اور جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ شریعت سے بالکل الگ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیوں نے ترنگ میں آ کر علم شریعت کے بارہ میں ایسے الفاظ استعمال کر دیے جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم باطن کے مقابلہ میں اس کو کوئی خاص وقعت نہیں دیتے۔

مثلاً ایک شیخ تصوف کا ارشاد ہے کہ:

'ہم اپنا علم ایک ذات سے حاصل کر رہے ہیں جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والی نہیں اور تم اپنا علم ایسے زندہ سے حاصل کر رہے ہو جسے ایک دن بہر حال مرجاتا ہے۔'

ایک بزرگ سے کہا گیا کہ 'آپ عبدالرزاق سے حدیث حاصل کرنے کے لیے کیوں سفر نہیں کرتے؟' جواب میں ارشاد فرمایا: 'جو خود خلاق سے حاصل کر رہا ہو وہ عبدالرزاق سے کیا حاصل کرے گا؟'

ایک اور شیخ کا ارشاد ہے کہ:

العلم حجاب بین القلب و بین اللہ عز و جل.

علم' دل اور اللہ عز و جل کے درمیان ایک حجاب بن جاتا ہے۔

ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے:

اذا رأیت الصوفی یشتغل بحدثنا فاغسل یدک منہ.[۲]

جب تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ حدثنا (اور اخبرنا) کے چکر میں پڑ گیا ہے تو بس اس سے ہاتھ دھو لو۔

صوفیوں کے نزدیک علم اور معرفت کی حقیقت

صوفیوں کے نزدیک علم اور معرفت کے جو مدارج ہیں اور جس علم کو وہ علم اور جس معرفت کو وہ معرفت کہتے ہیں، ہم یہاں مختصراً اس کی وضاحت کریں گے، تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ دوسروں کے معیار علم و معرفت اور ان کے معیار علم و معرفت میں کیا فرق ہے اور اس علم و معرفت کے حاصل

کرنے کے ان کے ہاں ذرائع کیا ہیں؟ اس وضاحت کے لیے ہم پانچویں صدی ہجری کے مشہور امام تصوف، شیخ الاسلام ابو اسماعیل ہروی حنبلیؒ (متوفی ۴۸۱ھ) کی یادگار تصنیف منازل السائرین سے پہلے علم کی حقیقت اور اس کے مختلف مدارج کی تفصیل پیش کرتے ہیں، اس کے بعد ہم معرفت کی حقیقت اور اس کے مراتب پر ان کی رائے نقل کریں گے۔[۳]

علم کی حقیقت

شیخ الاسلام نے علم کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) وہ بدیہی علم جو آدمی کے حس و مشاہدہ میں آتا ہے یا جس کی بنیاد قابل اعتماد نقل و روایت پر ہے یا جو سابق تجربات کی صحت پر مبنی ہے۔

(۲) وہ علم خفی جو پاکیزہ جسموں کی پاکیزہ روحوں کے اندر نشو و نما پاتا ہے، جو بے ریا ریاضت کے پانی سے سیرابی حاصل کرتا ہے، جو بلند ہمت اشخاص انفاس صادقہ کے اندر خلوت کے اوقات اور دنیا کے ہنگاموں سے نا آشنا کانوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۳) وہ علم لدنی جس کا وجود ہی اس کی سند ہے، جس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے' جس کا حکم ہی اس کی تعریف ہے۔

ان میں سے پہلے درجہ کے علم کی صوفیوں کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے بھی اس کا ذکر بالکل ایک ابتدائی درجہ کی چیز کی حیثیت سے کیا ہے اور ایک لفظ بھی اس کے متعلق ایسا نہیں لکھا ہے جس سے ذرا بھی اس کی اہمیت محسوس ہوتی ہو حالانکہ علم شریعت بھی ان حضرات کے نزدیک اسی درجہ میں داخل ہے، اس لیے کہ وہی علم ہے جس کی بنیاد قابل اعتماد نقل و روایت پر ہے۔

دوسرے درجہ کے علم کے بارہ میں شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ:

ھو علم یظہر الغائب و یغیب الشہادۃ و یشیر الی الجمع.

یہ علم غیب کو ظاہر اور حاضر کو غائب کر دیتا ہے اور مقام جمع کی طرف رہبری کرتا ہے۔

اس عبارت کی شرح اپنی طرف سے کرنے کی بجائے میں شیخ الاسلام کی کتاب کے سب سے بڑے شارح، علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے وہ الفاظ یہاں نقل کیے دیتا ہوں، جو انہوں نے اپنی کتاب مدارج السالکین میں اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> ھو علم یظھر الغائب کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز عارف سے اوجھل ہوتی ہے، یہ علم اس چیز کا کشف کر دیتا ہے۔ و یغیب الشھادۃ سے یہ مراد ہے کہ یہ علم عارف کو اس کے مشہود حقیقی کے سوا ہر چیز کے مشاہدہ سے بے خبر کر دیتا ہے۔ و یشیر الی الجمع میں وحدانیت و فردانیت کے مقام کی طرف اشارہ ہے، جہاں تمام رسوم و قیود مٹ جاتے ہیں، یہاں تک کہ خود شاہد بھی اپنے آپ کو اس فردانیت میں گم کر دیتا ہے۔ (مدارج السالکین: ج ۳ ص ۳۳۳)

علم کا تیسرا درجہ جس کو شیخ الاسلام نے علم لدنی سے تعبیر فرمایا ہے، درحقیقت یہی علم ارباب تصوف کے یہاں علم و معرفت کی حقیقی معراج ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے اس کی شان میں یہاں تک فرمادیا ہے کہ لیس بینہ و بین الغیب حجاب علم لدنی اور غیب کے درمیان سرے سے کوئی پردہ حائل ہی نہیں رہ جاتا۔ اس کی تعریف میں بھی شیخ الاسلام نے جو فقرے ارشاد فرمائے ہیں، ان کی وضاحت بھی میں اپنی طرف سے کرنے کے بجائے بہتر سمجھتا ہوں کہ ان کی تفسیر میں جو کچھ علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے اس کو یہاں درج کردوں۔ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

> اسنادہ وجودہ (اس کا وجود ہی اس کی سند ہے) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس کے علاوہ جو علم ہے (یہ اشارہ صرف علم شریعت کی طرف ہے) اس کے حصول کا راستہ اسناد ہے، اسی طرح اس علم کے حصول کا راستہ وجدان ہے۔ و ادراکہ عیانہ (اس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے) کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم فکر و استنباط سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ کشف اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ونعتہ حکمہ (جس کا حکم ہی اس کی تعریف ہے) کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ اپنی دلیل ہے، اس کی دلیل کہیں اور سے نہیں لانی پڑتی۔ وہ خود دلیل اور خود مدلول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب

> نہیں رہ جاتا" بخلاف علم کی دوسری اقسام کے کہ ان کے درمیان اور غیب کے درمیان پردہ حائل رہتا ہے۔ صوفیوں کے نزدیک اس سے مراد ایک نور ہے جو مشہود حقیقی کی طرف سے عارف کی طرف آتا ہے اور وہ اس کے حواس کی تمام قوتوں اور ان کے افعال کو مٹا کر عارف کے اندر خود ان کی جگہ لے لیتا ہے۔ پھر وہ مشہود حقیقی کو اسی نور کے ذریعے سے دیکھنے لگتا ہے اور اس نور کے ظہور کے بعد مشہود حقیقی کے سوا عارف کی نظر میں سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔'
> (مدارج السالکین: ج ۳ ص ۳۳۳)

شیخ الاسلام کی اس پوری بحث پر ایک نظر دوبارہ ڈال کر وہ نتائج سامنے رکھ لیجیے جو اس سے نکلتے ہیں:

(۱) سب سے پہلی چیز تو یہ سامنے آتی ہے کہ معرفت کے نقطۂ نظر سے صوفیائے کرام کے نزدیک علم شریعت کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، علم شریعت جس کی بنیاد نقل و روایت پر ہے ان کے نزدیک بالکل ابتدائی درجہ کی چیز ہے، معرفت کے نقطۂ نظر سے جس علم کی اہمیت ہے وہ علم خفی ہے یا علم لدنی۔

(۲) علم خفی اور علم لدنی کو جس طرح نقل و روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی طرح عقل و استدلال اور فکر و استنباط سے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تمام تر وجدان، کشف اور مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں۔

(۳) ان کے حصول کا راستہ تعقل، تفکر اور استنباط و اجتہاد نہیں ہے بلکہ مراقبہ، توجہ، ریاضت اور خلوت گزینی ہے۔

(۴) یہ علم عارف کے حواس کو معطل کر کے خود اس کی جگہ لے لیتا ہے، اور عارف کو تمام دنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے مشہود حقیقی کے اندر گم کر دیتا ہے۔ یہ علم غیب کے تمام پردے اٹھا دیتا ہے اور عارف تمام حقائق کا گویا برأی العین مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

اس بحث پر تنقید کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ معرفت کی حقیقت اور اس کے مدارج پر شیخ الاسلام نے جو کچھ لکھا ہے اس کو بھی مختصراً ناظرین کے سامنے رکھ دیں تا کہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ معرفت کا معیار صوفیائے کرام کے نزدیک کیا ہے۔

معرفت کی حقیقت

سب سے پہلے شیخ الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ المعرفة احاطة بعین الشیء کما ھو (معرفت کسی شے کی حقیقت کا اس طرح احاطہ کر لینا ہے جیسی کہ فی الحقیقت وہ ہے)۔

اس کے بعد علم کی طرح معرفت کے بھی شیخ الاسلام نے تین درجے قرار دیے ہیں اور لوگوں کو تین طبقات —عوام، خواص اور اخص الخواص— میں تقسیم کر کے ہر طبقہ کی معرفت اس کے درجہ کے اعتبار سے الگ الگ بتائی ہے۔

معرفت کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ خدا کی جن صفات اور کرشموں کا مظاہرہ اس کی مخلوقات و مصنوعات میں ہو رہا ہے اور جن کا بیان نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے ہوا ہے، ان کی معرفت حاصل ہو۔ یہ معرفت، عوام کی معرفت ہے۔

معرفت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ خدا کی ذات کی معرفت حاصل ہو، اس طرح کہ ذات اور صفات کے درمیان کوئی تفریق نہ واقع ہو۔ یہ خواص کی معرفت ہے۔

معرفت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ خدا خود اپنی معرفت کا نور عارف پر ڈال دے اور عارف کی معرفت اس نور میں گم ہو جائے۔ اس معرفت تک نہ استدلال کی رسائی ہے، نہ اس تک کسی دلیل کی رہنمائی ہے اور نہ یہاں تک کسی وسیلہ کی پہنچ ہے۔ دل کا مشاہدہ، علم کے حدود و قیود سے آزادی اور مقام جمع کا مطالعہ اس کی خصوصیات ہیں۔ یہ اخص الخواص کی معرفت ہے۔

اب اس بحث کا جو خلاصہ نکلتا ہے اس کو بھی پیش نظر رکھ لیجیے۔ معرفت کی یہ پوری بحث منازل السائرین سے ماخوذ ہے۔

معرفت کی تعریف یہ ہے کہ کسی شے کی اصل حقیقت کا جیسی کہ وہ فی الواقع ہے، احاطہ کر لیا جائے۔

خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت جس کا ذریعہ انبیاء ہیں، یہ ابتدائی درجہ کی معرفت ہے۔ معرفت کا اونچا درجہ درحقیقت معرفت ذات کا درجہ ہے۔

حقیقی معرفت جو اخص الخواص کا حصہ ہے وہ عقل و استدلال اور دلیل و شہادت سے ایک بالکل ماوراء شے ہے۔ یہ معرفت جن کو حاصل ہو جاتی ہے وہ حقائق کو دلیل سے معلوم کرنے کی بجائے ان کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ وہ علم کے حدود و قیود سے بالاتر اور خود مشہود حقیقی کے اندر گم ہو جاتے ہیں۔

فلاسفہ اور متکلمین کے نظریات پر تبصرہ

اب ہم ان مختلف رایوں پر مختصراً تبصرہ کر کے یہ دکھائیں گے کہ ان میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا حصہ محض بے حقیقت خیال آرائی پر مبنی ہے۔

فلاسفہ اور متکلمین میں سے ہر ایک نے، جیسا کہ آپ نے دیکھا، ایک دوسرے کے بالکل ضد مسلک اختیار کیا ہے۔ ایک گروہ عقل کو اس قدر اچھالتا ہے کہ انسان کو بالکل آسمان پر چڑھا دیتا ہے اور دوسرا اس کو اس قدر گراتا ہے کہ وہ بالکل تحت الثریٰ میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک عقل کی رہنمائی پر اس قدر اعتماد رکھتا ہے کہ انسان کو کسی مافوق عقل رہنمائی سے بالکل ہی بے نیاز اور مستغنی ثابت کر دیتا ہے، دوسرا عقل کو اس قدر ناقابل اعتماد ٹھہراتا ہے کہ انسان کو بالکل بے بصیرت اور اندھا بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ عقل نہ تو اس غیر معمولی احترام و اعتمادی کی مستحق ہے جس کا مستحق اس کو فلاسفہ نے گردانا ہے اور نہ اس توہین و تحقیر ہی کی سزاوار ہے جس کی سزاوار اس غریب کو متکلمین نے ٹھہرایا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر سب سے بڑا انعام جو فرمایا ہے وہ یہی ہے کہ اس کو عقل عنایت کی ہے۔ لیکن یہ عقل ایسی چیز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے بالکل کافی ہو اور اس کے بعد انسان کسی مافوق عقل کی رہنمائی کا محتاج نہ رہے۔ عقل تمام خوبیوں کے باوجود اپنے اندر متعدد ایسی خامیاں بھی رکھتی ہے کہ اس کی رہنمائی نہ تو کامل ہو سکتی ہے نہ بے خطا۔ اول تو یہ جن حواسوں سے کام لیتی ہے، ان کی رسائی ہی بہت محدود ہے، اس وجہ سے بہت سے سوالات، خصوصاً مابعد الطبیعی سوالات، کے حل میں اس کے یہ وسائل و وسائط بالکل ہی ناکارہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ دوسرے وہ اپنے حواسوں کی فراہم کردہ معلومات سے جو کلیات ترتیب دیتی

ہے اور پھر ان سے جو نتائج نکالتی ہے ان میں بھی وہ غلطیوں سے محفوظ نہیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی بھی کرسکتی ہے، وہ پست ہمت بھی ہوسکتی ہے۔ وہ مرعوب وخوف زدہ بھی ہوسکتی ہے اور اپنے نفسانی میلانات ورجحانات کے حق میں جانب دار بھی ہوسکتی ہے۔ یہاں تک کہ تمام انسانوں کی عقلوں کو جمع کرکے ان سب کی رہنمائی پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ انہی نقائص کی بنا پر، جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، اور کچھ نہیں تو کم از کم اختلاف تو ان کے نتائج فکر میں لازماً رونما ہوکے رہے گا۔

تاہم عقل سے وہ مایوسی اور بدگمانی بھی غلط ہے جس کا اظہار متکلمین نے کیا ہے۔ عقل کی رسائی محدود ضرور ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ وہ مابعدالطبیعی سوالات کے حل کرنے اور اخلاقی اقدار کی جانچ پرکھ کے معاملہ میں بالکل ہی کوری ہے، ایک سخت قسم کا سفسطہ بلکہ ایک کھلی ہوئی جہالت ہے۔ عقل اپنی کوتاہیوں اور نارسائیوں کے باوجود ہماری رہنمائی بہت دور تک کرسکتی ہے۔ وہ اس کائنات کے مطالعہ اور اس کے اندر جو نظم وحکمت ہے، اس کے مشاہدہ سے نہ صرف ایک خالق کا بلکہ خالق کی بہت سی صفات کا بھی اندازہ کرسکتی ہے۔ وہ خالق کی صفات سے خالق کی پسند اور ناپسند کے متعلق بھی ایک تصور قائم کرسکتی ہے۔ وہ اس دنیا کے نظام اور اس کے سنن وقوانین کے مطالعہ سے ایک روز جزا وسزا کا بھی خیال کرسکتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کے اندر ودیعت کردہ اساسی یقینیات سے خیر وشر کے اصول بھی متعین کرسکتی ہے۔ وہ یہ ساری باتیں کرسکتی ہے، البتہ اس طرح نہیں کرسکتی کہ اس کے کیے ہوئے کو بالکل کامل سمجھا جاسکے یا اس کی صحت وصداقت پر پورا بھروسا کیا جاسکے۔ بس یہ خرابی اس کے کام میں ایک ایسی خرابی ہے جس کے سبب سے رہنمائی کے معاملہ میں تنہا اسی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، بالخصوص ایسے معاملات میں جن پر انسان کی حقیقی طمانیت ومسرت اور اس کی انفرادی وقومی سعادت وکامرانی کا انحصار ہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فلاسفہ نے عقل پر جو اعتماد کیا ہے، وہ بھی بالبداہت غلط ہے اور متکلمین نے اس کو جو بالکل خارج از بحث قرار دے دیا ہے وہ بھی صریحاً حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ حق ان دونوں کے درمیان ہے۔

شیخ الاسلام کے نظریات پر تبصرہ

اب آیئے شیخ الاسلام کے نظریات کا تجزیہ کرکے دیکھیے کہ اس میں کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ ہم شیخ الاسلام ؒ کے خیالات کے اس حصہ کو زیر بحث نہیں لائیں گے جس میں کسی پہلو سے اختلاف رائے کی گنجائش ہوسکتی ہے بلکہ ان کی صرف انہی غلطیوں کو سامنے لائیں گے جو بالکل واضح ہیں اور جن کی کوئی توجیہ دلائل کی روشنی میں ممکن نہیں ہے۔ ہمیں شیخ الاسلام کے نظریات پر مندرجہ ذیل اصولی اعتراضات ہیں:

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شیخ الاسلام نے شریعت کے علم کو کشف، مشاہدہ اور الہام کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کے مقابل میں حصول معرفت کے نقطۂ نظر سے فروتر ٹھہرایا ہے حالانکہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ علم شریعت کی بنیاد وحی پر ہے اور وحی میں کسی وہم، کسی وسوسہ، کسی نفسانی خیال آرائی اور کسی شیطانی دراندازی کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ انبیاء بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس علم کی بنیاد وجدان اور کشف و مشاہدہ یا الہام وغیرہ پر ہو اس میں ہر قسم کی شیطانی اور نفسانی مداخلت کا امکان ہوتا ہے کیونکہ کسی بڑے سے بڑے عارف اور کسی بڑے سے بڑے صوفی کے متعلق بھی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) شیخ الاسلام نے علم لدنی کے بارہ میں نہ صرف یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ فکر واستنباط سے بالاتر ہے بلکہ اس کو بجائے خود دلیل کی حیثیت دے ڈالی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صحت وصداقت کسی دوسری دلیل کی تصدیق وتائید کی محتاج نہیں رہی۔ جس طرح ایک نبی کو وحی کے ذریعہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کی تصدیق وتائید کے لیے وہ کسی خارجی شہادت کا محتاج نہیں رہتا اسی طرح ایک عارف بھی اپنے وجدان یا اپنے کشف یا مشاہدہ یا الہام کے ذریعہ سے جو علم لدنی پاتا ہے اس کو کسی اور کسوٹی پر اس کو جانچنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ جیسا کہ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے: ’اس کا وجود ہی اس کی سند ہے۔‘

ہمارے نزدیک شیخ الاسلام کی یہ بات دین میں ایک شدید قسم کا فتنہ ہے۔ علم خفی ہو یا علم لدنی

اس کو بجائے خود دلیل تسلیم کر لینے کے معنی تو یہ ہوئے کہ عارفین کو انبیاء کا درجہ دے دیا جائے اور ان کے کشف ومشاہدہ اور ان کے الہام کو بالکل ہم پایۂ وحی بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی شخص کے لیے اسلام پر قائم رہتے ہوئے تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ کشف والہام کے ذریعہ سے علم کے حصول کے ہم منکر نہیں ہیں لیکن یہ علم قابل قبول صرف اسی حالت میں ہونا چاہیے جب یہ شریعت کے مطابق ہو۔ اگر یہ شریعت کے خلاف ہو تو لازماً یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اس کو قبول کر لینا دیدہ ودانستہ اپنی باگ شیطان کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔

اگر اس کشفی یا الہامی علم کو اس درجہ اہمیت دے دی جائے کہ یہ کتاب وسنت کی طرح بجائے خود دلیل بن جائے تو اس سے جس طرح کے فتنے پیدا ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہم شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فیوض الحرمین سے ان کی ایک تحقیق شریف نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> تحقیق شریف : الاولیاء کثیرا ما یلهمون بان اللّٰه تعالٰی اسقط عنهم التکلیف و انه خیرهم فی الطاعات ان شاء وافعلوها و ان لم یشاء و الم یفعلوها. حکی لی سیدی الوالد رضی اللّٰه تعالٰی عنه عن نفسه انه الهم بهذا وانه دعا اللّٰه ان یقیم علیه التکلیف وما اختار الا التمس. ولم یکن من مذهبه سقوط التکلیف عن احد من خلق اللّٰه مادام عاقلا بالغا. فرأیته یری الالهام حقا ویری مذهبه حقا ویتحیر فی التطبیق.

ایک نہایت اعلیٰ تحقیق یہ ہے کہ بہت سے اولیاء پر یہ الہام کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام شرعی احکام کی تعمیل سے بری کر دیا ہے اور ان کو طاعت وعبادت کے معاملہ میں اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو کریں اور اگر نہ چاہیں تو نہ کریں۔ مجھ سے میرے والد ماجد نے خود اپنے بارہ میں یہ بیان فرمایا کہ خود ان کو بھی اسی طرح کا الہام ہوا تھا لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ ان کے اوپر شرعی ذمہ داریوں کو قائم رکھے اور انہوں نے قوانین و احکام کی پابندی ہی کو اختیار کیا۔ ان کا مسلک یہ نہیں تھا کہ کوئی عاقل وبالغ شرعی ذمہ داریوں سے بری قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنے الہام کو بھی حق سمجھتے ہیں اور

اپنے مسلک کو بھی حق سمجھتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان تطبیق دینے میں ان کو کچھ حیرانی سی پیش آ رہی ہے۔

> و اخبرت عن سیدی العم قدس سرّہ ان کان یخبر عن نفسه انه الهم بسقوط التکلیف. وقیل له ان عبدت طمعا فی الجنة فانا وعدناک ان ندخلک ایاها وان عبدت طلبا لرضانا فقد رضینا عنک رضا لا سخط بعده. فقال: ربی! انما اعبدک لا لشیء دونک. وکان قدس سرّہ یمیل الی ان الکمل یسقط عنهم التکلیف واللّٰه سبحانه هو الذی یقیم علیهم النوامیس من غیر اختیارهم. هکذا روی عن کثیر من اولیاء اللّٰه تعالٰی.
>
> (فیوض الحرمین، ص ۲۳۔۲۴)

مجھے میرے عم بزرگوار کی نسبت بھی یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی اپنی بابت یہ فرماتے تھے کہ ان کو بھی ذمہ داریوں سے بریت کا الہام ہوا تھا۔ ان کو غیب سے کہا گیا تھا اگر تم جنت کی آرزو میں ہماری عبادت کرتے تھے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم کو اس میں ضرور داخل کریں گے۔ اور اگر تم ہماری خوشنودی کی طلب میں ہماری عبادت کرتے تھے تو ہم تم سے ایسے راضی ہوئے کہ اب اس کے بعد کبھی ناخوش نہ ہوں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ اے رب! میں تیری عبادت محض تیرے لیے کرتا ہوں' کسی اور غرض کے لیے نہیں کرتا ہوں۔ عم بزرگوار کا میلان اس بات کی طرف تھا کہ کاملین سے شرعی ذمہ داریاں ساقط کر دی جاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے اوپر، ان کے اختیار کے بغیر، شرعی قوانین کو جاری رکھتا ہے۔ اور اسی قسم کی روایت دوسرے بہت سے اولیاء اور کاملین سے ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اس قسم کے الہامات کو رحمانی سمجھنے کا تعلق ہے شاہ صاحب کے والد بزرگوار اور عم بزرگوار، دونوں حضرات ایک ہی رائے رکھتے تھے البتہ ان دونوں بزرگوں کی رائیں اس بارہ میں مختلف تھیں کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بری کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ شاہ صاحب کے والد ماجد کا مذہب یہ تھا کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بھی بری نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان کے عم بزرگوار کا مذہب یہ تھا کہ کاملین

شرعی ذمہ داریوں سے بری تو کر دیے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ، ان کے اختیار کے بغیر ہی، ان کو تمام شرعی تکالیف کا پابند بنائے رکھتا ہے۔

خود شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس بارہ میں اپنے عم بزرگوار کے مسلک کے مؤید معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عم بزرگوار کا مذکورہ بالا مسلک نقل کرنے کے بعد اس کا فلسفہ بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

والسرّ فی ذالک عندی ان الانسان اذا انتقل عن الایمان بالغیب بهذا النوامیس الی الایمان بها علی بینة ووجدهذا العبادات و النوامیس فی نفسه مثل الجوع والعطش مما لا یقدر علی ترکه فلا معنی لتعلق التکلیف بها لانها من الجبلة التی جبل علیها.

(فیوض الحرمین: ص ۴۳۔۴۴)

میرے نزدیک اس کے اندر رمز یہ ہے کہ آدمی جب ان شرعی احکام پر ایمان غائبانہ کے درجہ سے ترقی کر کے ایمان شہادت (ایمان علی بینة) کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور ان عبادات و احکام کی طلب اپنے اندر اسی طرح محسوس کرنے لگتا ہے جس طرح بھوک اور پیاس کو محسوس کرتا ہے، جن کو چھوڑنے پر وہ قادر نہیں رہتا، تو پھر ان چیزوں کا اس کو مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں کیونکہ یہ چیزیں تو اب اس کی جبلت بن چکی ہیں، جن پر وہ پیدا ہوا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ اس قسم کے الہامات کو اپنے والد ماجد اور عم بزرگوار کی طرح رحمانی سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان کا ارشاد ہے: والحق عندی ان الالهام کلہ حق (فیوض الحرمین: ص ۴۳۔۴۴) بلکہ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ کاملین جن کو ایمان بالغیب کی جگہ ایمان بالشہادۃ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے وہ شرعی تکالیف سے بری کر دیے جاتے ہیں کیونکہ شرعی تکالیف ان کے لیے بالکل اضطراری نوعیت کی چیز بن جاتی ہیں، جن سے انحراف ان کے لیے ممکن ہی نہیں رہ جاتا۔ جس طرح وہ طبعی قوانین کی مجبورانہ اطاعت کرتے ہیں اور جس طرح وہ بے بس ہو کر جبلی تقاضوں کی تعمیل کرتے ہیں اسی طرح وہ شرعی احکام کی بھی تعمیل

بالکل بے بس ہو کر کرتے ہیں اس وجہ سے ان کو شرعی تکلیف کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد سے متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن میں سے بعض کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اس دلیل کی بنا پر کہ ان کاملین کے لیے شرعی احکام و قوانین جبلی تقاضوں کی حیثیت حاصل کرتے ہیں یہ کہا جاسکتا کہ ان کو شرعی احکام کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں تو بعینہ اسی دلیل کی بنا پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جب یہ کاملین ان شرعی احکام کی تعمیل پر جبلی طور پر مجبور ہیں تو ان کی ذمہ داریوں سے ان کو بری قرار دینے کے بھی کوئی معنی نہیں۔ کیونکہ کسی چیز سے بری قرار دینے کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اختیار موجود ہو۔ جب اختیار ہی سلب ہو چکا تو بری قرار دینا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کو معذورین و مجبورین کے زمرہ میں شمار کیے جانے کے سبب سے غیر مکلف سمجھ لیا جائے۔ لیکن یہ مرتبہ اسلامی شریعت میں کاملین کا نہیں بلکہ نابالغوں اور مجانین کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام عذاب و ثواب اختیاری اعمال پر مرتب ہوتا ہے، تو جب یہ اعمال ان کاملین کے لیے اختیاری باقی نہیں رہے تو ان پر ان کو اجر و ثواب کس بات کا ملے گا؟

تیسری بات یہ ہے کہ انبیائے کرام کا ایمان قرآن کی تصریح کے مطابق علی بینة ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ.

(ھود۔۱۱:۲۸)

بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں؟

حضرت صالح علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ. (ھود۔۱۱:۶۳)

بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں؟

حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ۔ (ھود۔۱۱:۸۸)
بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں؟

لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی کے متعلق بھی کوئی ادنیٰ اشارہ ہمیں اس بات کا نہیں ملتا کہ ان کو بھی اس بات کا الہام ہوا ہو کہ ان کو شرعی تکالیف سے بری قرار دے دیا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کو برابر یہی تاکید ہوتی رہی کہ جو کچھ تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اس پر برابر جمے رہو اور سر مو اس سے تجاوز نہ کرنا! حالانکہ شرعی تکالیف اگر کسی کے لیے جبلی چیزیں بن سکتی ہیں تو سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب وہ آخر دم تک مکلف رہے اور دوسروں سے زیادہ مکلف رہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

ہمارے نزدیک اس طرح کا الہام یا کشف کاملین کو تو ہو سکتا ہے لیکن ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہ الہام یا کشف رحمانی بھی ہو سکتا ہے۔ رحمانی کشف اور رحمانی القاء ہمیشہ بندہ کو صحیح سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ بندہ کو فتنہ میں نہیں ڈالتا۔ فتنہ میں ڈالنا شیطان کا کام ہے۔ یہ کام رحمان کا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہزاروں نبیوں اور رسولوں پر وحی نازل فرمائی لیکن یہ وحی ہمیشہ شرعی ذمہ داریوں کے اٹھانے کی تاکید کے ساتھ نازل ہوئی، نبی کے لیے بھی اور اس کی امت کے لیے بھی۔ ہم کو انبیاء کے پورے گروہ میں سے کسی کے بارہ میں بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ ان کو ایک مرتبہ بھی وحی یا کشف کے ذریعہ سے یہ بتایا گیا ہو کہ اب وہ شرعی فرائض اور ذمہ داریوں سے بری کر دیے گئے ہیں۔ اگر انبیائے کرام کی زندگیوں میں اس طرح کی کوئی چیز ملتی ہے تو اس کی نوعیت یا تو شیطانی وسوسہ کی ہے جس سے انہوں نے اللہ کی پناہ مانگی ہے یا پھر انسانی واہمہ کی ہے جس کی انہوں نے اصلاح فرمائی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ بعض لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ! جب آپؐ کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیے گئے تو آپؐ نوافل میں اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا:

افلا اکون عبدا شکورا؟ (صحیح البخاری: کتاب التھجد باب ۶)

کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟

اگر کاملیت کا انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہوتا کہ کامل کو شرعی تکالیف ہی سے بری قرار دے دیا جاتا تو سب سے بڑھ کر کامل اور اکمل تو حضور خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات تھی، لیکن قرآن کی کسی آیت یا آپؐ کی کسی حدیث سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپؐ کو زندگی کے کسی دور میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی اس بات کے لیے ہوا ہو کہ آپؐ کو شرعی ذمہ داریوں سے کسی پہلو سے بھی سبکدوش کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس کمال عبدیت میں آپؐ جتنے ہی آگے بڑھتے گئے شرعی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی قدر بڑھتا گیا۔

ہم یہاں چند آیتیں ایسی نقل کرتے ہیں جن میں نبی ﷺ کو آپؐ کی زندگی کے آخری دور میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کی بندگی میں زیادہ سے زیادہ سرگرم رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

سورہ الم نشرح میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (الم نشرح۔۹۴:۷۔۸)
پس جب تم فارغ ہو تو کمر بستہ ہو اور اپنے رب سے لو لگاؤ۔

جس سورہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تاویل کے مطابق آنحضرت ﷺ کے قرب وفات کی پیشین گوئی ہے، عین اسی سورہ میں آپؐ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (النصر۔۱۱۰:۱-۳)
جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے اور لوگوں کو دیکھو کہ وہ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے خدا کی تسبیح پڑھو اس کی حمد کے ساتھ اور اس سے مغفرت مانگو۔ بے شک وہ بڑا ہی معاف کرنے والا ہے۔

ایک جگہ صاف صاف یہ ہدایت ہے کہ اپنے رب کی بندگی پر جمے رہو یہاں تک کہ موت آ جائے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ
(الحجر۔۱۵:۹۹)
اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو یہاں تک کہ امرِ یقینی تم پر آشکارا ہو جائے۔

تمام اہل تاویل کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں یـــقـیــن سے مراد موت ہے۔ بہر حال اس قسم کا القاء خدا کی طرف سے تو ہو نہیں سکتا، اگر ہو سکتا ہے تو شیطان کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ وہ بلا شبہ کاملین کو اس مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ آخرت کی فلاح و کامیابی کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے انہوں نے کر لیا، اب مزید کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کوشش میں اگر اس کو کچھ زیادہ کامیابی بالفرض نہ بھی ہو، صرف اتنی ہی کامیابی ہو جائے کہ کوئی خدا کا بندہ اپنے عمل کو زیادہ اہمیت ہی دینے لگ جائے تو یہ بھی اس شخص کی آخرت کی بربادی اور شیطان کی بہت بڑی کامیابی ہے اور اہل تقویٰ اس فتنہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر شیطان کے اسی وسوسہ کو کوئی بزرگ اپنی سادہ لوحی سے سچ مچ القائے رحمانی ہی سمجھ بیٹھیں اور اس کی تعمیل میں تمام شرعی تکالیف سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیں، تب تو سمجھیے کہ شیطان کو سو فی صد کامیابی حاصل ہوئی۔ ہمارے نزدیک اس قسم کے الہامی اور کشفی علوم کو بجائے خود دلیل اور معیار قرار دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے جس سے کسی طرح بھی بچا نہیں جا سکتا۔ اسی چیز سے ہزارہا بدعات پیدا ہوئی ہیں اور اگر اس کا دروازہ کھلا رہے تو اس سے ہزارہا بدعات آئندہ پیدا ہو سکتی ہیں۔ بہت سے مبتدع صوفیوں نے اسی قسم کے غیبی اشارات کو آڑ بنا کر اپنے آپ کو شرعی ذمہ داریوں سے بری قرار دے لیا، جس کے سبب سے وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنے پیچھے چلنے والوں کو بھی انہوں نے گمراہ کیا۔ اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

(۳) اس علم لدنی کے متعلق شیخ الاسلام نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

لیس بینہ و بین الغیب حجاب.
اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہ جاتا۔

جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ جس کو علم لدنی حاصل ہو اس کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے جاتے ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک بالبداہت قرآن کے خلاف ہے۔

غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ اس کے سوا، نہ کسی انسان کو حاصل ہے، نہ کسی فرشتہ کو، نہ کسی نبی کو اور نہ کسی ولی کو۔ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اونچا مرتبہ نبیوں اور فرشتوں کا ہے، لیکن قرآن مجید میں تصریح ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے نہ براہ راست خطاب کر سکتے ہیں نہ غیب سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر ان سے خطاب کرتا ہے تو یا تو وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی اوٹ سے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ان کے لیے سارے حجابات اٹھا دیے جاتے ہیں:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (الشوریٰ۔۴۲:۵۱)
اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردے کی اوٹ سے یا بھیجے کسی فرشتہ کو پس وہ وحی کر دے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ بے شک وہ بڑا ہی عالی مقام، بڑا ہی حکمت والا ہے۔

اسی طرح یہ بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے بندوں کی مصلحت کے لیے کسی نبی یا رسول کو اپنے غیب کی باتوں میں سے کچھ باتوں سے باخبر کر دے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ (الجن۔۷۲:۲۶۔۲۷)
غیب کا جاننے والا وہی ہے۔ اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ رہے وہ جن کو وہ رسول کی حیثیت سے انتخاب فرماتا ہے تو وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے۔

انبیاء کی دعوت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ بلاتے ہی انہی لوگوں کو ہیں جو عقل و استدلال سے کام لینے، آفاق و انفس میں خدا کی جو نشانیاں ہیں، ان پر غور کرنے اور ان کے نتائج کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ وہ ان لوگوں کو اپنی دعوت کے لیے بالکل بیکار سمجھتے ہیں جو تفکر و تدبر کی بجائے ہر حقیقت کے مشاہدہ و معائنہ کے طالب ہوں۔ جو لوگ غیب کا مشاہدہ کر لینے کے بعد اللہ کو ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہیں، قرآن میں ایک جگہ بھی ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کی کوئی

حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس دنیا میں مشاہدۂ غیب کو حکمت الٰہی کے بالکل خلاف اور اس قسم کے ایمان کو بالکل غیر معتبر قرار دیا گیا ہے۔ اس دنیا میں اصلی آزمائش ہی یہی ہے کہ آدمی مشاہدۂ غیب کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور انبیاء کی گواہی کی بنا پر حق کو مانے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جان و مال کی قربانیاں دے۔ اگر فی الواقع کوئی ایسا علم ہے جو غیب کے پردوں کو اٹھا دیتا ہے اور اس دنیا میں وہ انسانوں کو حاصل بھی ہو سکتا ہے تو اس کے پانے کے سب سے زیادہ مستحق حضرات انبیائے کرام ہی ہو سکتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اس علم سے آگاہ نہیں کیا حالانکہ ان کی قوموں کی طرف سے برابر یہ مطالبہ رہا کہ وہ ایمان لانے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ان کو غیب کا مشاہدہ کرا دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب ملا کہ اس دنیا میں غیب کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے، پھر کس طرح ممکن ہے کہ جو چیز انبیاء کو نہیں عطا کی گئی اور جس کا دیا جانا حکمت الٰہی کے خلاف قرار دیا گیا، وہ صوفیوں کو حاصل ہو گئی؟

یہاں اس قصہ سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو جو سورہ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا بیان ہوا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کو جو علم عطا ہوا تھا اس کے متعلق قرآن میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ اس علم نے ان کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے تھے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ نکلتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند معاملات میں حضرت خضر علیہ السلام کو اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ بنایا تھا اور ان کے اوپر ان معاملات کی حکمت بھی کھول دی تھی۔ جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کی باتیں جو گوارا کیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے یہ ہدایت ہوئی تھی کہ وہ ان کے پاس ایک خاص امر کی تعلیم کے لیے جائیں۔ ان کا خدا کی طرف سے حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جانا خود اس بات کی دلیل تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام خدا کے خاص بندے ہیں، ان کا علم قابل اعتماد ہے اور ان کا عمل خدا کے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کی وہ باتیں جو ان کی نگاہ میں حق کے خلاف نظر آئیں محض اس وجہ سے گوارا کیں کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے حضرت خضر علیہ السلام کے اوپر اعتماد کرنے کی ہدایت ہوئی تھی۔

اگر وحی کے ذریعے سے ان کو حضرت خضر علیہ السلام پر اعتماد کرنے کی ہدایت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے ایک فعل کو بھی برداشت نہ کرتے۔ خود حضرت خضر علیہ السلام نے بھی آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہی اطمینان دلایا کہ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ (الکھف۔ ۸۲:۱۸) کہ یہ جو کچھ میں نے کیا ہے خدا کے حکم سے کیا ہے، اپنے جی سے نہیں کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے چند کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ان کو اس بات کی تعلیم دینے کے لیے کیے کہ خدا کے کام اگرچہ بظاہر کتنے ہی بے حکمت نظر آئیں لیکن ان کے اندر نہایت گہری حکمت ہوتی ہے جس کو صرف خدا ہی جانتا ہے اور یہ کام انہوں نے براہ راست خدا کے احکام کے تحت اسی طرح انجام دیے جس طرح فرشتے اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ جس طرح فرشتوں کو بناتا ہے، اسی طرح کسی انسان کو بھی اگر اس نے کسی مصلحت کے تحت کسی وقت بنایا تو اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ لیکن اس چیز کو آڑ بنا کر کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی اقدام شریعت کے خلاف کر ڈالے اور جب اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کا یہ فعل شریعت کے خلاف ہے تو وہ یہ جواب دے کہ میں نے تو یہ براہ راست خدا کے حکم کے تحت اس کی مشیت کی تنفیذ کی ہے کیونکہ دوسروں کے پاس اس کے صدق و کذب کے جانچنے کا ذریعہ وحی الٰہی ہی ہے اور وحی الٰہی آنحضرت ﷺ کے بعد منقطع ہو چکی ہے۔ اب حق و باطل کی کسوٹی قرآن و سنت ہے، اگر کسی شخص کا فعل کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ اس عذر پر کتاب و سنت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا کہ اس نے یہ جو کچھ بھی کہا یا کیا ہے علم لدنی کی رہنمائی کے تحت کیا ہے اور یہ علم بجائے خود دلیل ہے، اس کو کسی اور کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) شیخ الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ:

> المعرفة احاطة بعين الشيء كما هو.
>
> معرفت یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت کا جیسی کہ وہ ہے احاطہ کر لیا جائے۔

معرفت کی اس تعریف کی رو سے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی بھی معرفت نہیں حاصل کی جا سکتی

چہ جائیکہ خدا کی ذات اور اس کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت حاصل ہو سکے۔ اس طرح کی معرفت ہم اس ہوا کی بھی حاصل نہیں کر سکتے جس کے اندر ہم ہر وقت سانس لیتے ہیں، اس پانی کی بھی نہیں کر سکتے جس کو پیتے ہیں، اس سورج کی بھی نہیں کر سکتے جس کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اس طرح کی معرفت اگر ہم خود اپنے وجود کی بھی حاصل کرنا چاہیں تو یہ ہمارے لیے محال ہے اگرچہ ہمارے وجود سے زیادہ ہم سے قریب تر شے کوئی بھی نہیں ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس طرح کی معرفت ہم زمین پر رینگنے والی کسی ننھی سی چیونٹی کی بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر غور کیجیے کہ انسان جب اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بھی کماحقہ معرفت حاصل نہیں کر سکتا تو اس کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے جو ہمارے خیال و گمان اور قیاس و وہم سب سے بالاتر ہے:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

(۵) معرفت کی اس تعریف کے بعد ستم یہ ہے کہ خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت کو بالکل ابتدائی درجہ کی چیز بتایا گیا ہے۔ معرفت کا دوسرا درجہ، جو خواص کا حصہ ہے، ان حضرات کے نزدیک معرفت ذات سے شروع ہوتا ہے، حالانکہ انسان خدا کی ذات کی کماحقہ معرفت تو درکنار اس کا سرے سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خدا کی صفات مثلاً سمع، بصر، علم، قدرت وغیرہ کا تصور تو انسان کچھ کر سکتا ہے — اگرچہ وہ کتنا ہی ناقص ہو — کیونکہ ان صفات کی ایک جھلک وہ اپنے اندر بھی پاتا ہے، لیکن خدا کی ذات کا تصور کرنے کے لیے تو اس کے تمام ذخیرۂ معلومات میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے جس قدر بھی بحث کی ہے خدا کی صفات، اس کے افعال اور اس کے قوانین و سنن سے کی ہے۔ اس کی ذات سے کوئی بحث نہیں کی ہے اور اس بات کی صاف تصریح کر دی ہے کہ اس دنیا میں انسان خدا کی ذات کی تجلی کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ احادیث میں خدا کی ذات کے سوال پر غور کرنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ اس سوال پر غور کرنے کے لیے انسان کے پاس سرے سے کوئی ذریعہ ہے ہی نہیں۔ اگر وہ اس سوال پر غور کرے گا تو حیرانی و درماندگی کے سوا اس کو کچھ حاصل نہیں ہوگا اور حیرانی و درماندگی

بجائے اس کے کہ انسان کو کچھ دے اس سے وہ کچھ بھی چھین لیتی ہے جو اس کے پاس پہلے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا تو حضرات صوفیائے کرام کو بھی اقرار ہے کہ جس کو تجلیٔ ذات کا مشاہدہ ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات فرائض و واجبات بھی چھوڑ بیٹھتا ہے۔

ہمارے نزدیک تجلیٔ ذات اول تو، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، کسی کو حاصل نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی شخص اس کے درپے ہو تو وہ کچھ پانے کے بجائے الٹے وہ بھی کھو آتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔ (مدارج السالکین: ج ۳ ص ۸۷)

(۶) معرفت کا تیسرا درجہ جس کو اخص الخواص کا حصہ قرار دیا گیا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ خالص وحدت الوجود کا تصور پیش کرتا ہے، اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کو علم کے حدود و قیود سے بالکل بالاتر کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم سے مراد علم شریعت ہے۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ علم شریعت نہ تو اس معرفت کا وسیلہ و ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور نہ وہ اس معرفت پر کوئی حکم ہی لگا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ ان حضرات کے نزدیک، عارف ایک صاحب حال ہے اور ایک صاحب حال نے کشف اور مشاہدہ سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس پر مجرد ایک صاحب قال کو کوئی حکم لگانے کا حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نظریہ بنیادی طور پر شریعت کے خلاف ہے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں انسان کو اپنے جی سے کچھ کہنے کا حق نہیں دیا ہے بلکہ صاف صاف فرمایا ہے کہ اپنی ذات و صفات کو اللہ تعالیٰ خود ہی جانتا ہے، انسان اس کو اپنے محدود ذرائع علم سے کماحقہ نہیں جان سکتا۔ اس وجہ سے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ظن و گمان اور اپنے کشف و مشاہدہ کی بنا پر خدا کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے اللہ کی وحی کو رہنما بنائے اور اس کے بارے میں وہی کچھ مانے جو خود اس نے اپنے متعلق بتایا ہے:

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝ (النحل۔ ۱۶:۷۴)
تو تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اگر کوئی شخص خدا کے بارے میں کوئی ایسا تصور پیش کرتا ہے جو خدا کے پیش کردہ تصور سے

مختلف ہے اور دعوی یہ کرتا ہے کہ اس کو اپنے کشف یا مشاہدہ کے ذریعہ سے خدا کی یہی معرفت حاصل ہوئی ہے تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ یہ شخص یا تو کسی وہم میں مبتلا ہے یا غلط بیانی کر رہا ہے۔

خدا کی معرفت کے بارہ میں صحیح مسلک

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خدا کی معرفت سے متعلق فلاسفہ، متکلمین اور ارباب تصوف نے جو نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے اندر کچھ نہ کچھ خلا ہے۔ اب ہم مختصراً بتائیں گے کہ خدا کی معرفت کا بالکل صحیح اور قابل اطمینان ذریعہ کیا ہے۔

ہمارے نزدیک خدائی معرفت کا صحیح اور قابل اطمینان ذریعہ انبیا علیہم السلام ہیں۔ لیکن ہمارے اس کہنے کا منشاء ہرگز یہ نہیں ہے کہ عقل وفطرت، وجدان اور کشف کو معرفت الٰہی میں سرے سے کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ عقل یا کشف وغیرہ کے ذریعہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے اس میں غلطی اور وہم کے امکانات ہیں اور انبیاء کا طریقہ غلطی اور وہم کے تمام امکانات سے محفوظ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کی بنیاد، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، عقل اور فطرت ہی پر ہے اور اس کے اندر وجدان اور کشف کو بھی دخل ہے۔ لیکن ان کے طریقہ میں چونکہ عقل یا وجدان تنہا کام نہیں کرتے بلکہ وحی الٰہی کی رہنمائی بھی ان کی مدد کرتی ہے اس وجہ سے اس طریقہ میں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ انسان کسی غلطی یا گمراہی میں مبتلا ہو سکے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، وحی کے ذریعہ سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ وحی کے ذریعے سے حاصل ہونے والے اس علم کو قرآن کی اصطلاح میں العلم کہا گیا ہے۔ العلم یعنی علم حقیقی — جو تمام علوم کا سرچشمہ ہے، جو انسان کے لیے حقیقی صلاح و فلاح کی راہ کھولتا ہے، جو اس کے قلب اور اس کی روح کو سچی طمانیت اور سکینت بخشتا ہے، جو اس کی دنیا کو بھی سنوارتا ہے اور اس کی آخرت کو بھی روشن کرتا ہے، جو ہر قسم کے اختلاط والتباس اور ہر قسم کے شبہ سے بالاتر ہے، جس میں کسی قسم کے وہم یا وسوسہ کی کسی آمیزش کا اندیشہ نہیں ہے، جو ہر قسم کی شیطانی دخل اندازی سے بالکل محفوظ ہے، جس کو دینے والا خدا ہے، جس کو لانے والے

جبریل امین علیہ السلام ہیں اور جس کو دنیا میں پھیلانے والے حضرت خاتم النبیین ﷺ ہیں، جس کو دنیا میں اتارتے وقت اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی دونوں جگہ اس امر کا اہتمام فرمایا کہ نہ شیاطین الجن [ؓ] اس کے قریب پھٹک سکیں اور نہ شیاطین الانس اس کے اندر کوئی خرابی پیدا کر سکیں۔ [ؑ] جس کی عظمت اور پاکیزگی اور جس کے محافظین وحاملین کے صدق ووفا کی شہادت خود ان کے اتارنے والے نے ان الفاظ میں دی ہے:

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ۝ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ۝
(عبس ۸۰: ۱۳۔۱۶)

لائق تعظیم، بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں، معزز باوفا کاتبوں کے ہاتھوں میں۔

جس کی معنوی قدر و قیمت کی شہادت حضور نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں دی:

ان هذا القرآن حبل الله و هو النور المبين و الشفاء النافع و عصمة لمن تمسک به و نجاة لمن تبعه. (سنن الدارمی: کتاب فضائل القرآن باب ۱)

یہی قرآن اللہ کی رسی ہے، یہی نور مبین ہے اور یہی شفائے نافع ہے۔ اور یہی اس کی پناہ ہے جو اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے۔ اور اس شخص کے لیے وسیلہ نجات ہے جو اس کی پیروی کرے۔

جس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے — جو تمام ارباب تصوف کے نزدیک سب سے بڑے عارف ہیں — رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت کی ہے:

قال: اما انى قد سمعت رسول الله ﷺ يقول: الا! انها ستكون فتنة. فقلت: المخرج منها؟ يا رسول الله! قال: كتاب الله! فيه نبأ ما كان قبلكم و خبر ما بعدكم وحكم ما بينكم. و هو الفصل ليس بالهزل! من تركه من جبار قصمه الله. و من ابتغى الهدى فى غيره اضله الله و هو حبل الله المتين. و هو الذكر الحكيم. وهو الصراط المستقيم. هو الذى لا تزيغ به الاهواء ولا تلتبس به الالسنة. و لا تشبع منه العلماء. ولايخلق على كثرة

الرد. ولا تنقضی عجائبه. هو الذی لم تنته الجن اذ سمعته حتی قالوا: انا سمعنا قرآنا عجبا ○ یهدی الی الرشد (الجن۔۷۲:۱۔۲) ○ من قال به صدق. ومن عمل به اجر. ومن حکم به عدل. ومن دعا الیه هدی الی صراط مستقیم (سنن الترمذی: کتاب فضائل القرآن باب ۱۴)

فرمایا یاد رکھو! میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سنی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ اس سے نجات کیا چیز دلائے گی؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کی کتاب! اس میں تمہارے اگلوں کی سرگزشت ہے، جو کچھ بعد میں آنے والا ہے اس کی خبر ہے اور جو کچھ تمہارے درمیان پیدا ہوگا اس کا فیصلہ ہے۔ اور یہ دوٹوک بات ہے، کوئی ہنسی، دل لگی نہیں ہے! جو سرکش اس کو چھوڑ دے گا، اللہ اس کی پشت کی ہڈی توڑ دے گا۔ اور جو اس کے سوا کوئی اور مرجع ہدایت بنائے گا، اللہ اس کو گمراہ کردے گا خدا کی مضبوط رسی یہی ہے۔ حکمت سے بھری ہوئی کتاب یہی ہے۔ خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ یہی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے خواہشیں نہیں گمراہ کرتیں اور زبانیں نہیں لڑکھڑاتیں۔ علماء اس سے کبھی نہیں آسودہ ہوتے۔ کتنی ہی پڑھو اس سے سیری نہ ہوگی۔ اس کے عجائب حکمت کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اس کے سنتے ہی جنات پکار اٹھے: [ہم نے ایک نہایت دل پذیر قرآن سنا ہے جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے۔] جس نے اس کی سند پر کہا، سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا، اجر پائے گا۔ جس نے اس کی مدد سے فیصلہ کیا، اس نے عدل کیا۔ جس نے اس کی طرف دعوت دی، اس نے صراط مستقیم کی دعوت دی۔

یہی علم ہے جس کے بارے میں ہم اوپر انہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کر آئے ہیں:

سئل علی: هل خصکم رسول الله ﷺ بشیء دون الناس؟ فقال: لا. والذی فلق الحبة وبرأ النسمة! الا فهما یؤتیه الله عبدا فی کتابه

حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کو رسول اللہ ﷺ نے کوئی مخصوص علم ایسا بھی سکھایا تھا جو دوسروں کو نہ سکھایا ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ نہیں! اس ذات کی قسم جس نے تخم پھاڑا اور خلق کو پیدا کیا! مجھے آنحضرت ﷺ نے اس قسم کا کوئی علم نہیں سکھایا۔ البتہ وہ فہم

ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کا کسی بندے کو عطا فرما دے!

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ علم خاص جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ بھی درحقیقت وحی الٰہی کے فہم ہی کا ثمرہ تھا، اس سے کوئی علیحدہ چیز نہیں تھا۔

وحی الٰہی کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ارباب تصوف کے علم خفی یا علم لدنی کی طرح عقل وفطرت سے بالکل ماوراء شے نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بنیاد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، عقل اور فطرت ہی پر ہوتی ہے۔ قرآن کہیں بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں جو تم سے کہی جارہی ہیں، ان کا وجود ہی ان کی سند ہے یا یہ خود ہی دلیل اور خود ہی مدلول ہیں۔ بلکہ وہ ہر جگہ یہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل انہی باتوں کا مطالبہ کرتی ہے اور تمہاری فطرت ان کی صحت اور صداقت پر گواہ ہے۔ وہ ان چیزوں کو باقاعدہ منطقی طریقہ پر ثابت کرنے کے لیے آفاق اور انفس کے اندر سے دلیلیں پیش کرتا ہے اور اس خوبی اور اس وضاحت کے ساتھ ان کو ثابت کرتا ہے کہ کوئی ہٹ دھرم ہی ان کا انکار کرسکتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ وحی الٰہی ہماری اپنی ہی فطرت کے مدفون خزانہ کو ہماری نگاہوں کے سامنے کر دیتی ہے اور ہماری ہی عقل کو ہمارے اوپر گواہ بنا دیتی ہے۔ اگر یہ کام ہم خود کرتے تو اس میں غلطیوں کا امکان تھا اور یہ غلطیاں ہماری دنیا اور آخرت دونوں میں ہمارے لیے مہلک ثابت ہوسکتی تھیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام وحی کے ذریعہ سے انجام دے دیا جو ہر شک وشبہ سے بالا ہونے میں اہل تصوف کے کشف ومشاہدہ سے کہیں ارفع ہے اور اگر کوئی شخص اس میں کما حقہ فہم وبصیرت حاصل کرلے تو اس کو وہ نور یقین اور شرح صدر بھی حاصل ہوجائے جو اصل مقصود ہے اور جس کو حاصل کرنے کے لیے صوفیہ طرح طرح کی ریاضت کرکے کشف ومشاہدہ کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے مذکورہ بالا قول میں اشارہ کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صوفیوں کے علم خفی یا علم لدنی کی طرح انبیاء علیہم السلام کا علم عقل کو مفلوج اور خیرہ نہیں بناتا بلکہ وہ تمام بنیادی معاملات میں رہنمائی کرکے عقل کو صحیح اور قطعی نتائج تک پہنچا دیتا ہے اور اس طرح وہ اس کی ایسی تربیت کردیتا ہے کہ بقیہ مسائل میں وہ آپ سے آپ صحیح

طرز پر سوچنے لگ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بار بار مخاطب کو تعقل، تفکر اور تذکر کی دعوت دی گئی ہے۔

تعقل کا منشا یہ ہوتا ہے کہ آدمی زندگی کے معاملات میں محض جذبات، شہوات اور خواہشات کو اپنا رہنما نہ بنالے اور نہ اوہام و خیالات کے ہاتھ میں اپنی باگ دے بیٹھے بلکہ اس کے اندر خدا نے جو عقل رکھی ہے اس کو رہنما بنائے اور اس کی رہنمائی پر اعتماد کرے۔

تفکر کا مطلب یہ ہے کہ نظام عالم کے قوانین و احکام اور فطرت انسانی کے مطالبات اور تقاضوں پر حکیمانہ طور پر غور کیا جائے اور ان سے زندگی کے لیے جو اصول پیدا ہوتے ہیں ان کو پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔

تذکر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن بدیہیات پر یقین رکھتا ہے ان بدیہیات کو جذبات و شہوات کی ہلچل کے اندر بھی یاد رکھے اور پھر ان سے بالکل لازمی طور پر جو نتائج نکلتے ہیں ان کو بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تسلیم کرے۔

الغرض وحی الٰہی ہم کو خدا کی معرفت کی منزل تک ہماری عقل پر پٹی باندھ کر نہیں لے جاتی بلکہ وہ ہماری عقل ہی کو آفاق و انفس کے اندر خدا کی صفات اور اس کے سنن و قوانین کا مشاہدہ کراتی ہے۔ پھر ان صفات اور ان سنن و قوانین سے جو اخلاقی اصول پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان سے زندگی کے لیے جو ضابطہ بنتا ہے، ان کو ہمارے سامنے رکھتی ہے اور پھر اس سے جزا و سزا اور آخرت کے لیے جو رہنمائی ملتی ہے اس کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس طرح ہماری عقل، ایک بالکل مامون ہادی کی رہنمائی میں، خدا کی معرفت کے اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جہاں تک اس کے اندر پہنچنے کی صلاحیت ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ درحقیقت قرآن حکیم ہی ہے جو خدا کی معرفت کا اصل ذریعہ ہے اور اسی کے تدبر سے انسان کو تعقل، تفکر اور تذکر کی وہ صحیح تربیت ملتی ہے جس سے انسان خدا شناسی اور خداری کا اہل بنتا ہے اور اس راہ میں اس منزل تک پہنچتا ہے جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہے۔

---

[1] ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ موجودہ زمانے کے ماہرین سائنس کی

ساری توجہ تو اس وقت انہی سوالات پر مرکوز ہے جو اس کائنات کے ظواہر سے متعلق ہیں، خالق کائنات کے سوال پر غور کرنے والے تو ان میں بہت کم ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صورت واقعہ یہی ہے لیکن اس سے ہمارا دعویٰ باطل نہیں ہوتا۔ جہاں تک سوال پیدا ہونے کا تعلق ہے، پیدا تو آج بھی سب سے پہلے یہی سوال ہوتا ہے کہ اس کائنات کا خالق کون ہے؟ اور اس کی صفتیں کیا ہیں؟ لیکن موجودہ زمانہ کے فلسفی اس سوال پر غور کرنے اور اس کو حل کرنے کے بجائے اس سے فرار اختیار کرنے میں سلامتی سمجھتے ہیں۔ وہ کہنے کو بظاہر یہ کہتے ہیں کہ یہ سوال حل نہیں ہو سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا حل چونکہ ان کی خواہشوں کے خلاف، ان پر بہت سی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے، اس وجہ سے وہ اس کو حل کرنے اور اس کی ذمہ داریوں سے دوچار ہونے کے بجائے یا تو اس کے مقابلے میں شتر مرغ کی پالیسی اختیار کرتے ہیں یا اس کے کسی غلط حل پر ہی قانع ہو جاتے ہیں۔

[2] یہ اقوال ہم نے مدارج السالکین: ج ۳ ص ۲۳۹ سے لیے ہیں۔

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس علم کو قرآن مجید العلم کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے کسی اور علم کے اتباع کو وہ اتباع ہوا اور اتباع ضلالت قرار دیتا ہے، اس علم کی قدر و قیمت ہمارے صوفیوں کے ایک گروہ کے نزدیک کیا ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ۝ (البقرۃ۔۲:۱۲۰)

اور اگر تم اس علم حقیقی کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں پر چلے تو اللہ کے مقابل میں نہ تمہارا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔

دوسری جگہ ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (البقرۃ۔۲:۱۴۵)

اور اگر تم اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو بلاشبہ تم

ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

لیکن ہمارے صوفیوں کا ایک طبقہ اس علم کو حجاب سمجھتا ہے اور اگر وہ کسی کو اس علم کی طلب میں مشغول پاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کی نگاہوں میں اس کی کچھ قدر ہو، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص ضائع ہو گیا۔ یہاں تک کہ صوفیوں کے نزدیک **علم** کی اصطلاح ہی سرے سے ایک حقیر اصطلاح بن گئی ہے۔ وہ جس علم کو علم حقیقی سمجھتے ہیں، اس کو علم کی اصطلاح سے تعبیر کرنا پسند نہیں کرتے، بلکہ اس کے لیے انہوں نے اپنی ایک خاص اصطلاح **معرفت** کی وضع کی ہے اور جب وہ اپنے علم کو تعبیر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے **مدارج السالکین** میں ایک جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صوفیوں نے اپنے علم کے لیے **علم** کی جگہ **معرفت** کی اصطلاح اختیار کی ہے۔ لیکن انہوں نے اس کا سبب نہیں بیان کیا کہ آخر صوفیوں کو قرآن و حدیث کی اصطلاح کو چھوڑ کر ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ میرے نزدیک ان لوگوں کو اس نئی اصطلاح کے وضع کرنے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ **علم** یا **العلم** کی اصطلاح علم وحی اور علم شریعت کے لیے معروف ہو چکی تھی اور اس علم کو یہ حضرات اپنے علم کے مقابل میں محض ایک **علم ظاهر** کی حیثیت دیتے تھے، اس وجہ سے انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اس علم کے لیے وہ کوئی اور اصطلاح وضع کریں جس کو وہ علم شریعت سے افضل و برتر سمجھتے ہیں اور جو ان کے نزدیک علم حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی **مدارج السالکین** میں شروع میں **منازل السائرین** کا متن درج ہے۔ میں یہاں اس کے مطالب اردو میں پیش کروں گا اور حتی الامکان ٹھیک ٹھیک پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ جو اصحاب اصل عبارتیں دیکھنا چاہیں وہ مذکورہ کتاب کی طرف مراجعت کریں۔

۴ یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ نظریات تنہا شیخ الاسلام ابو اسماعیل ہروی ہی کے ہیں۔ ہم نے شیخ الاسلام کو تمام اکابر تصوف کے ایک قابل اعتماد نمائندہ کی حیثیت سے منتخب کیا ہے۔ جو

نظریات شیخ الاسلام کے ہیں، کم و بیش وہی نظریات دوسرے اکابر تصوف کے بھی ہیں اور اگر کسی کے نظریات بنیادی طور پر شیخ الاسلام کے نظریات سے الگ ہیں تو اس کو تصوف کے زمرہ ہی سے الگ سمجھنا چاہیے۔

۵ نزول وحی کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے وحی کو ہر قسم کی شیطانی دسترس سے محفوظ کر دینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ آسمان کے اندر شیطانوں کی آمد و شد بند کر دی اور اس کو روکنے کے لیے نہایت مضبوط قسم کا پہرہ لگا دیا۔ سورہ جن میں اس کا ذکر خود جنوں کی زبان سے یوں ہوا ہے:

وَ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا ٥ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ٥

(الجن ۷۲: ۸-۹)

اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ سخت پہرہ داروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا اور ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں کچھ سن گن لینے کو بیٹھا کرتے تھے۔ پر اب جو بیٹھے گا تو وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

۶ اسی طرح شیاطین الانس اللہ کے اتارے ہوئے علم اور اس کے دین میں جو گھپلا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کو روکنے کا بھی اس نے انتظام فرمایا:

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ٥

(الحج ۲۲: ۵۲)

پس اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو، پھر اللہ اپنی باتوں کو قرار بخشتا ہے۔ اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

باب ۴

تدبّر قرآن اور اس کے آداب و شرائط

پچھلے باب میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ خدا کی معرفت یا دوسرے الفاظ میں العلم کے حاصل ہونے کا اصلی ذریعہ قرآن حکیم ہے، لیکن اس مقصد کے لیے قرآن کی ہر تلاوت نتیجہ خیز نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ آداب و شرائط ہیں۔ اگر یہ ملحوظ رکھے جائیں تو قرآن مجید سے مذکورہ مقصد حاصل ہوتا ہے، اگر یہ ملحوظ نہ رکھے جائیں تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کو تزکیہ کا مقصد عزیز ہو، ان کو آداب و شرائط کا پورا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ ہم اختصار کے ساتھ اس باب میں یہ شرائط بیان کریں گے۔

نیت کی پاکیزگی

سب سے پہلی چیز نیت کی پاکیزگی ہے۔ نیت کی پاکیزگی سے مطلب یہ ہے کہ آدمی قرآن مجید کو صرف ہدایت و معرفت حاصل کرنے کے لیے پڑھے، کوئی ذاتی غرض سامنے رکھ کر نہ پڑھے۔ اگر طلب ہدایت و معرفت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہوگی تو نہ صرف یہ کہ وہ قرآن کے فیض سے محروم رہے گا، بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دور وہ اب تک رہا ہے، اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے گا۔ اگر آدمی قرآن مجید کو اس لیے پڑھے کہ لوگ اسے مفسر قرآن سمجھنے لگیں یا اس لیے پڑھے کہ کوئی تفسیر لکھ کر جلد اس سے شہرت اور نفع دنیاوی حاصل کر

سکے یا اس لیے پڑھے کہ اس کے کچھ اپنے نظریات ہوں اور وہ اپنے ان نظریات کو قرآن کے ملمع کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا خواہش مند ہو تو ممکن ہے اس کے یہ ارادے کسی حد تک پورے ہو جائیں لیکن جہاں تک فہم قرآن اور اس سے حصول معرفت کا تعلق ہے، اس طرح وہ اس کا دروازہ اپنے اوپر بالکل بند کر لے گا۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و معرفت کا صحیفہ بنا کر اتارا ہے اور ہر آدمی کے اندر طلب ہدایت و معرفت کا داعیہ ودیعت کر دیا ہے۔ اگر اسی داعیہ کے تحت آدمی قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اس سے اپنی کوشش اور اللہ تعالیٰ کی توفیق کے مطابق فیض پاتا ہے۔ اور اگر اس داعیہ کے علاوہ کسی اور خواہش کے تحت وہ قرآن کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو وانما لکلّ امرءٍ مانوی (اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی) (صحیح البخاری: کتاب الوحی باب ۱) کے اصول کے مطابق وہ وہی چیز پاتا ہے جس کا وہ طلب گار ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (البقرۃ۔۲: ۲۶) (اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے)۔ اور یہ اصول بیان فرمانے کے بعد ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی کہ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ (البقرۃ۔۲: ۲۶) (اور وہ نہیں گمراہ کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں)۔ یعنی جو لوگ اپنی اغراض کے ایسے بندے ہوتے ہیں کہ وہ ہدایت سے بھی ضلالت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ وہی چیز دیتا ہے جس کے وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص کعبہ جا کر بھی بتوں ہی کو یاد کرتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کا سزاوار نہیں ہے کہ اس پر توحید کے رموز کھولے جائیں۔ اگر کوئی شخص پھولوں کے اندر سے بھی کانٹے ہی جمع کرنے کا شوق رکھتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ اس کو پھولوں کی خوشبو نصیب ہو۔ اگر ایک شخص اپنے فساد طبیعت کے سبب سے علاج کو بھی بیماری ہی بنا لیتا ہے تو وہ اسی بات کے لائق ہے کہ اس کو شفا حاصل ہونے کے بجائے اس کی بیماری میں اضافہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے سورہ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا

مُهْتَدِيْنَ○ (البقرۃ۔۲:۱۶)

یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔

قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک اعلیٰ اور برتر کلام مان کر اسی حیثیت سے اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر دل میں قرآن مجید کی پوری عظمت واہمیت نہ ہو تو آدمی اس کو سمجھنے اور اس کے حقائق ومعارف کے دریافت کرنے پر وہ محنت صرف نہیں کر سکتا جو اس کے خزانۂ حکمت سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی کہ ایک کتاب کے متعلق اس کے جاننے سے پہلے ہی حسن ظن قائم کر لیا جائے کہ وہ بڑی پر حکمت اور اعلیٰ کتاب ہے۔ لیکن غور کیجیے تو قرآن مجید کے متعلق اس قسم کا پیشگی حسن ظن ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ہے۔ قرآن مجید کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بالکل مجہول ہو۔ وہ اپنے پیچھے ایک عظیم تاریخ رکھتا ہے، اس کے کارنامے نہایت شاندار ہیں، ذہنوں اور دماغوں کی تبدیلی میں اس کتاب نے جو معجزہ دکھایا ہے آج تک کسی کتاب نے بھی یہ معجزہ نہیں دکھایا ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ دنیا کی آبادی کا ایک عظیم حصہ اس کو نہ صرف ایک کتاب مانتا ہے بلکہ اس کو خدائی اور آسمانی کتاب مانتا ہے، اس کو لوح محفوظ سے اترا ہوا کلام مانتا ہے، اس کو ایک ایسا معجز کلام مانتا ہے جس کی نظیر نہ انسان پیش کر سکتے اور نہ جنات پیش کر سکتے۔ ایک ایسا کلام جس کے ماضی اور جس کے حاضر کے متعلق یہ شہادتیں اور لوگوں کے یہ احساسات موجود ہوں، بہر حال ایک اہمیت رکھنے والا کلام ہے۔ اور آدمی اس کو سمجھنے کا حق اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب اس کی یہ عظمت واہمیت اس کے پیش نظر ہو۔ اگر یہ اہمیت اس کے سامنے نہ ہو تو ممکن نہیں ہے کہ آدمی کا ذہن اس کو اس اہتمام کا مستحق سمجھے جو اہتمام اس کے لیے فی الواقع مطلوب ہے۔ اگر کسی رقبۂ زمین کے متعلق یہ علم ہو کہ وہاں سے سونا نکلتا رہا ہے اور کسی زمانے میں وہاں سے کافی سونا برآمد ہو چکا ہے تو توقع یہی کی جاتی ہے کہ اگر کھدائی کی جائے تو وہاں سے سونا ہی نکلے گا اور پھر اس

کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کا سروسامان کیا جاتا ہے اور اس پر محنت صرف کی جاتی ہے۔ لیکن اگر ایک معدن کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ گھورا ہے یا یہ کہ اگر یہاں محنت کی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہاں سے کوئلہ یا چونا فراہم ہوگا تو اس پر یا تو کوئی سرے سے اپنا وقت ہی ضائع کرنا پسند نہیں کرے گا یا پسند کرے گا تو صرف اس حد تک جس حد تک اس سے اس کو کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع ہوگی۔

یہ تنبیہ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے متعلق ایسی غلط فہمیاں لوگوں کے اندر موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں ہے کہ اس کو اس توجہ اور اہتمام کا مستحق سمجھا جائے جو اس سے حقیقی استفادہ کے لیے ضروری ہے۔ یہ غلط فہمیاں قرآن مجید کے ماننے والوں اور اس کے منکروں، دونوں کے اندر موجود ہیں۔ جو اس کے منکرین ہیں وہ اس بات کا تو ایک حد تک اعتراف کرتے ہیں کہ ایک خاص دور میں اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ اصلاحات واقع ہوئیں لیکن ان کے خیال میں وہ زمانہ اب گزر چکا ہے۔ عرب کے بدوؤں کے لیے، جن کے مسائل سیدھے سادے تھے، ان لوگوں کے خیال میں، یہ کتاب مفید ہو سکتی تھی اور ان کے لیے بلاشبہ یہ مفید ثابت ہوئی لیکن موجود زمانے کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے وہ اس کتاب کو بالکل ناکافی سمجھتے ہیں۔

جو اس کے ماننے والے ہیں ان میں بہت سے لوگ اس کو محض حرام وحلال کے بتلانے کا ایک فقہی ضابطہ سمجھتے ہیں اور فقہ کے احکام علیحدہ مرتب ہو جانے کے بعد، ان کی نگاہوں میں اگر اس کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہے تو وہ صرف تبرک کے نقطۂ نظر سے باقی رہ گئی ہے۔ ارباب تصوف اس کو محض علم ظاہر کا صحیفہ سمجھتے ہیں۔ علم باطن کے اسرار وحقائق ان کے نزدیک کشف ومشاہدہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کو بس اچھی اچھی نصیحتوں کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں، وہ اس کے اندر کسی گہری حکمت یا کسی بلند فلسفہ کی کوئی توقع نہیں رکھتے۔ بہت سے لوگ اس کو نزع کی سختیوں کے دور کرنے اور ایصال ثواب کی کتاب سمجھتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کو دفع آفات وبلیات کا تعویذ سمجھتے ہیں اور جس طرح عیسائی دل کی جانب والے جیب میں انجیل رکھے پھرتے ہیں اسی طرح اس خیال کے مسلمان جب گھر سے نکلتے ہیں تو جیب میں قرآن رکھ کے نکلتے ہیں۔ اس طرح کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے مسلمان نا ممکن ہے کہ قرآن حکیم سے وہ

فائدہ اٹھا سکیں جس کے لیے وہ فی الحقیقت نازل ہوا ہے۔ وہ اس کو انہی حقیر اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں جن اغراض کے لیے ان کے خیال میں یہ اترا ہے۔ ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کسی شخص کو ایک توپ دی جائے کہ وہ اس کے ذریعہ سے دشمنوں کے قلعہ کو مسمار کر دے لیکن وہ اس کو مچھر مارنے کی ایک مشین سمجھ بیٹھے اور اسی حقیر مقصد کے لیے اس کو استعمال کرنا شروع کر دے۔

قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم

قرآن حکیم سے حقیقی استفادہ کے لیے تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر قرآن مجید کے تقاضوں کے مطابق اپنے ظاہر و باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ ایک شخص جب قرآن مجید کو گہری نگاہ سے پڑھتا ہے تو وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کے تقاضے اور مطالبے اس کی اپنی خواہشوں اور چاہتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تصورات و نظریات بھی قرآن سے بیشتر الگ ہیں اور اس کے معاملات و تعلقات بھی قرآن کے مقرر کردہ حدود سے بالکل ہٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے باطن کو بھی قرآن سے دور پاتا ہے اور اپنے ظاہر کو بھی اس سے بالکل منحرف محسوس کرتا ہے۔ اس فرق و اختلاف کو محسوس کر کے ایک صاحب عزم اور ایک حق طلب آدمی تو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو میں اپنے آپ کو قرآن کے تقاضوں کے مطابق بنا کے رہوں گا اور وہ ہر قسم کی قربانیاں کر کے، ہر طرح کے مصائب جھیل کر اور ہر قسم کی ناگواریاں برداشت کر کے اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھال ہی لیتا ہے۔ لیکن جو شخص صاحب عزم نہیں ہوتا یا اس کے اندر حق شناسی اور حق طلبی کا سچا جذبہ نہیں ہوتا وہ اس خلیج کو پاٹنے کی ہمت نہیں کر سکتا جو وہ اپنے اور قرآن کے درمیان حائل پاتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میں اپنے عقائد و تصورات کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کروں تو مجھے ذہنی اور فکری حیثیت سے نیا جنم لینا پڑے گا۔ اسے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں اپنے اعمال و اخلاق کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کروں تو میرا ماحول میرے لیے بالکل اجنبی بن کے رہ جائے گا۔ اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو

ان مقاصد کی تکمیل میں سرگرم کروں جن کا مطالبہ مجھ سے قرآن کر رہا ہے تو میں جن منافع اور جن لذات سے متمتع ہو رہا ہوں ان سے متمتع ہونا تو الگ رہا، عجب نہیں کہ ان کے سبب سے جیل اور پھانسی کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اپنے وسائل معاش کو قرآن کے ضابطہ حلال و حرام کی کسوٹی پر پرکھوں تو آج جو عیش مجھے حاصل ہے اس سے محروم ہو کر شاید اپنی نان شبینہ کے لیے بھی فکر مند ہونا پڑے۔ ان خطروں کے مقابل میں ڈٹ جانا اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے کمر ہمت باندھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ صرف مردان کار ہی ان گھاٹیوں کو پار کر سکتے ہیں۔ معمولی ہمت و ارادہ کے لوگ یہیں سے اپنا رخ بدل دیتے ہیں۔ بعض الہڑ قسم کے لوگ، جو اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے زیادہ خواہش مند نہیں ہوتے، وہ تو یہ کہتے ہوئے اپنے نفس کی خواہشوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کا راستہ ہے تو بالکل صحیح لیکن ہمارے لیے اس پر چلنا نہایت مشکل ہے، اس لیے ہم اسی راہ پر چلیں گے جس راہ پر ہم کو ہمارا نفس لے جا رہا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی کمزوریوں کو عزیمت اور اپنے نفاق کو ایمان کے روپ میں پیش کرنے کا شوق رکھتے ہوں وہ اپنا یہ شوق مختلف تدبیروں سے پورا کرتے ہیں۔ بعض اضطرار اور مجبوری کے بہانوں سے اپنے لیے ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال بناتے ہیں۔ بعض دوراز کار اور لایعنی تاویلات کے ذریعے سے باطل پر حق کا ملمع چڑھاتے ہیں۔ بعض وقت کے تقاضوں اور مصالح کی آڑ تلاش کر کے ان کے پیچھے چھپتے ہیں۔ بعض قرآن میں اس قسم کی تحریفیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس قسم کی تحریفیں یہود نے تورات میں کی تھیں۔ بعض کفر و ایمان کے بیچ سے اپنے لیے ایک الگ راہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی قرآن کے جس حصہ کو وہ اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے ہیں اس کی پیروی کرتے ہیں اور جس حصہ کو اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں پاتے اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہ ساری راہیں شیطان کی نکالی ہوئی ہیں اور ان میں سے جس راہ کو بھی آدمی اختیار کرے گا وہ اس کو سیدھے ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گی۔ کامیابی اور فلاح کا راستہ صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی ہمت کرے اور اس کے لیے ہر قربانی پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ عرصہ تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اس ارادہ کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر

آدمی اس آزمائش میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کے لیے سعادت کی راہیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو خدا اس کے لیے دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اگر ایک ماحول سے وہ پھینکا جاتا ہے تو دوسرا ماحول اس کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ اگر ایک زمین اس کو پناہ دینے سے انکار کر دیتی ہے تو دوسری سرزمین اس کے لیے اپنی آغوش کھول دیتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝
(العنکبوت۔۲۹:۶۹)

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔ اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔

تدبّر

قرآن سے استفادہ کے لیے چوتھی شرط تدبّر ہے۔ اس شرط کا ذکر خود قرآن نے بار بار کیا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰي قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ (محمد۔۴۷:۲۴)

کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں؟

صحابہ رضی اللہ عنہم، جو قرآن کے مخاطب اول تھے، وہ قرآن مجید کو برابر تدبّر کے ساتھ پڑھتے تھے اور جو لوگ جتنا ہی تدبر کرتے تھے وہ اتنا ہی قرآن مجید کے فہم میں ممتاز تھے۔ صحابہؓ نے قرآن مجید کے مطالعہ کے لیے اپنے حلقے بھی قائم کیے تھے جن میں اہل ذوق حضرات اکٹھے ہو کر قرآن کا اجتماعی مطالعہ کرتے تھے۔ اس طرح کے قرآنی حلقوں سے نبی ﷺ کو خاص دلچسپی تھی اور روایات سے پتا چلتا ہے کہ بعد میں خلفائے راشدین — بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ — اس قسم کے حلقوں سے قرآن کے ماہرین سے برابر نہایت گہری دلچسپی لیتے رہے۔

محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور قرآن کے معانی کی طرف دھیان نہ کرنا

صحابہؓ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا ہے جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفۂ ہدایت و معرفت اور ایک خزانۂ علم و حکمت سمجھنے کے بجائے محض حصول برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا۔ جب زندگی کے مسائل سے قرآن کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دم نزع اس کے ذریعے سے جانکنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعہ سے میت کو ایصال ثواب کیا جائے۔ جب زندگی کے نشیب و فراز میں رہنما ہونے کے بجائے اس کا مصرف صرف یہ رہ گیا کہ ہم جس ضلالت کا بھی ارتکاب کریں، اس کے ذریعے سے اس کا افتتاح کریں تاکہ یہ برکت دے کر اس ضلالت کو ہدایت بنا دیا کرے۔ جب لوگوں نے اس کو تعویذ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تاکہ جب وہ اپنے شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لیے نکلیں تو قرآن ان کی حفاظت کرے کہ اس راہ سے کہیں ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ صرف اس شکل میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ اس کو پورے غور و تدبّر کے ساتھ پڑھا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دنیا میں یہی کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھ بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی چیز بھی آدمی پڑھتا ہے تو اس کے لیے سب سے پہلے وہ اپنے دماغ کو حاضر کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کو سمجھ سکے، لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں کہ مبادا کہیں اس کے کسی لفظ کا مفہوم دماغ کو چھو جائے!

تفویض الی اللہ

قرآن مجید سے صحیح فائدہ اٹھانے کے لیے پانچویں شرط یہ ہے کہ اس میں جو مشکلات پیش آئیں، آدمی ان سے بددل اور مایوس ہونے یا ان کے سبب سے قرآن مجید سے بدگمان یا اس پر معترض ہونے کے بجائے، اپنی الجھن کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرے اور اس سے مدد اور رہنمائی طلب کرے۔ قرآن میں آدمی کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے **قول ثقیل** کے نیچے دب گیا ہے جس کے بار گراں کو اٹھانا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح وہ کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے

کہ اس کے سامنے کوئی ایسی علمی مشکل آگئی ہے جس کا حل ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اس طرح کی علمی اور عملی مشکلوں سے نکلنے کا صحیح اور آزمودہ راستہ صرف یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے برابر دعا اور قرآن مجید پر برابر غور کرتا رہے، اگر قرآن مجید یاد ہو تو شب کی نمازوں میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھے، ان شاء اللہ اس کی ساری الجھنیں دور اور ساری مشکلیں حل ہو جائیں گی اور ان مشکلوں کے حل ہونے سے اس پر علم و حکمت کے جو دروازے کھلیں گے وہ دروازے کسی اور طرح اس پر ہرگز نہ کھلتے۔ مندرجہ ذیل دعا بھی اس طرح کے حالات میں پڑھتے رہنا نہایت نافع ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ، اِبْنُ عَبْدِکَ، اِبْنُ اَمَتِکَ. نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ. مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ. عَدْلٌ فِیَّ قَضَآءُکَ. اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوْاَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِہٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجَلَآءَ حُزْنِیْ وَذَھَابَ ھَمِّیْ! (مسند احمد: ج ۱ ص ۳۹۱)

اے اللہ! میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا، تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے۔ مجھ پر تیرا حکم جاری ہے۔ میرے بارہ میں تیرا فیصلہ حق ہے۔ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطہ سے، جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنے آپ کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا اپنے علم غیب میں جس کو تو نے اپنے لیے مخصوص فرمایا ہے، یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینہ کا نور، میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج بنا دے!

باب ۵

اسوۂ حسنہ

معرفتِ الٰہی اور حصولِ تزکیہ کا دوسرا قابلِ اعتماد ذریعہ نبی ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ لیکن آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے صحیح فیض ایک طالبِ تزکیہ صرف اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب نبی ﷺ کے ساتھ اس کو صحیح قسم کی نسبت حاصل ہو۔ اس نسبت کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ آپؐ کے منصبِ رسالت کی حیثیت اور آپؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ خاص طور پر یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ عہدِ صحابہ و تابعین کے گزرنے کے بعد سے اس چیز کے بارے میں ہمارے درمیان بہت کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اس اختلاف کا اثر حصولِ معرفت و تزکیہ کے اس مقصد پر بھی لازماً پڑتا ہے جو آپؐ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہے۔ اس وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے اختصار کے ساتھ نقطہ ہائے نظر کا یہ اختلاف واضح کر دیں۔ اس کے بعد تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ نبی ﷺ کے ساتھ ہماری کس نوعیت کی وابستگی معرفتِ الٰہی کے مقصد کے لیے کارآمد ہو سکتی ہے اور یہ وابستگی پیدا کرنے کے لیے ہمیں کن باتوں کا اہتمام کرنا ہے اور کس قسم کی جدوجہد عمل میں لانی ہے۔

منصبِ رسالت سے متعلق چار بنیادی غلط فہمیاں

نبی ﷺ کے منصبِ رسالت کی حیثیت اور آپؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کے بارے

میں ہمارے اندر جو غلط تصورات پیدا ہو چکے ہیں، وہ ہیں تو بہت سے لیکن ہم ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ ہم صرف چار بنیادی غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کریں گے جو ہمارے چار بڑے بڑے گروہوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

(۱) ہمارے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان — نعوذ باللہ — آنحضرت ﷺ کی وہی حیثیت سمجھتا ہے جو ایک کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان کسی معتمد ہرکارہ اور ایک دیانت دار چٹھی رساں کی ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک آنحضرت ﷺ کا کام بس یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب اپنے بندوں پر نازل فرمانی چاہی وہ آپؐ نے ان کو پہنچا دی، اس کے بعد آپؐ کا کام ختم ہو گیا۔ وہ اپنے اسی تصور کے لحاظ سے نبی ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت متعین کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ منصب رسالت کا اس قدر حقیر تصور رکھتے ہیں، ان کے لیے معرفت الٰہی کے نقطۂ نظر سے نبی ﷺ کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی اور جب آپؐ کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی تو آپؐ کی ذات کے ساتھ کسی غیر معمولی وابستگی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ جب اصلی کام آپؐ کا صرف خط کا پہنچا دینا تھا اور آپؐ خط پہنچا چکے تو اس کے بعد اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ اصل خط کی ہے یا زیادہ سے زیادہ کاتب کی، نہ کہ خط کے لانے والے قاصد کی۔ اس کے بعد تو اگر قاصد سرے سے درمیان سے غائب بھی ہو جائے جب بھی ان حضرات کے نقطۂ نظر سے کوئی خلا نہیں واقع ہونا چاہیے۔

رسالت کا یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ نبی، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان صرف ایک قاصد اور نامہ بر ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک معلم بھی ہوتا ہے، ایک مزکی بھی ہوتا ہے، ایک مرشد بھی ہوتا ہے، ایک مبین بھی ہوتا ہے، ایک مبشر بھی ہوتا ہے، ایک منذر بھی ہوتا ہے، ایک سراج منیر بھی ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک واجب الاطاعت ہادی بھی ہوتا ہے۔ اور پھر اپنی ان تمام خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ارشاد و ہدایت کے فرائض کے سلسلہ میں براہ راست خدا کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ جس کے سبب سے وہ غلطی اور گمراہی کے تمام خطروں سے بالکل محفوظ و مامون ہوتا ہے۔ اس کا فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خدا کی کتاب بندوں کو پہنچا دے، بلکہ اس کا

کام یہ بھی ہے کہ وہ اس کتاب کے تمام اسرار و رموز لوگوں کو سمجھا دے، اس کتاب پر عمل کر کے دکھا دے، اس کتاب پر عمل کرنے والوں کا ایک گروہ اپنی تعلیم و تربیت سے تیار کر دے اور اس کتاب کے مضمرات ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں نمایاں کر دے۔ ان سارے کاموں میں اس کی اپنی ذات ایک عامل کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے اور ایک رہنما کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے۔ اور اپنی اس دوسری حیثیت میں جو کچھ وہ کہتا ہے یا کرتا ہے یا جس چیز کو وہ منظور کر لیتا ہے، اس کو اس کتاب کے اور اس کے منصب رسالت کے تحت ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کو قبول کیا جاتا ہے۔

رسالت کے اس تصور کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نبی ﷺ کے ساتھ ہم جتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات رکھتے ہیں اتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات نہ دنیا میں ہمارے کسی کے ساتھ ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں آپ سے آپ یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان گوناگوں تعلقات کی نوعیت سے اچھی طرح واقف نہ ہو یا ان میں سے بعض کا یا کل کا منکر ہو، تو وہ ہرگز آپؐ کی ذات بابرکات سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جس کے لیے آپؐ کی بعثت ہوئی ہے۔

(۲) دوسرا گروہ، جو منصب رسالت کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہے وہ، ہمارے ارباب تصوف کا ہے۔ یہ لوگ اول تو شریعت اور طریقت اور علم ظاہر اور علم باطن کی الگ الگ حد بندیاں قائم کیے ہوئے ہیں۔ پھر مزید ستم یہ کرتے ہیں کہ ان دونوں علموں کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہاں تک علم ظاہر یا علم شریعت کا تعلق ہے اس کی تعلیم تو نبی ﷺ نے عام لوگوں کو دی، لیکن علم باطن یا علم طریقت کی تعلیم آپؐ نے بطور ایک راز کے صرف چند مخصوص لوگوں ہی کو بتائی اور پھر انہی لوگوں کے واسطے سے یہ علم سینہ بہ سینہ تصوف کے مختلف سلسلوں تک منتقل ہوا ہے اور وہی اس راز کے امین بنے۔

اس خیال کے اندر جو خرابیاں ہیں اور اس سے منصب نبوت کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر اس سے معرفت الٰہی کے نصب العین کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کی طرف ہم اس کتاب

کے پہلے باب میں بعض اشارات کر چکے ہیں۔ یہ خیال اگرچہ غلط ہے، لیکن غلط ہونے کے باوجود ہمارے نزدیک کم از کم اس پہلو سے غنیمت ہے کہ اس میں علم ظاہر اور علم باطن دونوں کا سرچشمہ نبی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ علم شریعت کا سرچشمہ تو نبی ﷺ کو تسلیم کیا گیا ہو لیکن علم طریقت کا سرچشمہ کسی اور کو قرار دے دیا گیا ہو۔ ورنہ اہل تصوف میں تو ایک ایسا گروہ بھی ہے جو نبوت اور ولایت کے دو الگ الگ بالکل متوازی منصب تسلیم کرتا ہے۔ پھر ان میں سے ایک کو وہ علم ظاہر — یعنی علم شریعت — کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور دوسرے کو علم باطن کا۔ اس گروہ کے نزدیک آنحضرت ﷺ کے لیے جس طرح خاتم الانبیاء کا منصب مخصوص ہے، اسی طرح بعض اشخاص کے لیے ان کے نزدیک خاتم الاولیاء کا منصب مخصوص ہے۔ ان کے نزدیک یہ دونوں منصب بالکل دو متوازی نظاموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دو مستقل متوازی نظاموں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ ان کے درمیان رقابت اور کشمکش کی حالت رہے۔ چنانچہ ان کے درمیان بھی برابر رقیبانہ چوٹیں چلتی رہتی ہیں۔ طریقت کے علم بردار، شریعت کے حامیوں کو ظاہر پرست اور بے مغز قرار دیتے ہیں اور شریعت کے حامی، طریقت کے حامیوں کو مبتدع اور گمراہ ٹھہراتے ہیں اور اس تعصب اور غلو نے بڑھتے بڑھتے یہ شکل اختیار کر لی ہے کہ بہت سے صوفی حضرات شریعت کو اپنی طریقت کے مقابلے میں پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے اور معرفت الٰہی کے نقطۂ نظر سے ان کی نگاہوں میں جو مرتبہ شیخ محی الدین ابن عربی کا ہے وہ — العیاذ باللہ — کسی نبی کا بھی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص منصب رسالت کے متعلق اس سوء ظن میں مبتلا ہو جائے تو اس کو معرفت الٰہی کا ایک ذرہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ بزعم خویش باطن میں اتنا کمال حاصل کر لے کہ ہوا میں اڑنے اور پانی پر دوڑنے لگ جائے۔ معرفت الٰہی کا اصلی ذریعہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں اور ہمارے نبی ﷺ چونکہ خاتم النبیین ہیں اور آپؐ کی شریعت آخری اور کامل شریعت ہے، اس وجہ سے لازماً آپؐ خاتم الاولیاء اور خاتم العارفین بھی ہیں۔ معرفت کا جو مقام آپؐ کو حاصل ہوا، وہ نہ کسی اور کو حاصل ہوا اور نہ ہوگا اور علم کا جو خزانہ آپؐ کی شریعت کے اندر پوشیدہ ہے وہ خزانہ نہ کسی اور چیز کے اندر ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

(۳) ہمارے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو نبی ﷺ کو ماضی کی ایک قابل احترام شخصیت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ساری قوم چونکہ آپؐ کو رسول کہتی ہے، اس وجہ سے یہ لوگ بھی آپؐ کو رسول ہی کہتے ہیں اور قومی روایات کے زیر اثر آپؐ کے لیے حمیت اور عصبیت کا جذبہ بھی ایک حد تک رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات ان لوگوں کے دل میں کسی طرح بھی نہیں دھنستی کہ آپؐ جس معاملہ میں جو کچھ فرما گئے ہیں وہی حرف آخر ہے اور انسان کی دنیوی اور اخروی سعادت کا انحصار بس اس کو بے چون و چرا مان لینے ہی پر ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک آپؐ نے جو کچھ بتایا اور سکھایا وہ ایک مخصوص زمانہ اور ایک مخصوص ماحول کے لیے تو بے شک ٹھیک تھا لیکن علم و روشنی کے اس زمانہ میں بھی انہی چیزوں پر اصرار کیے چلے جانا، ان کے خیال میں، جہالت اور حماقت ہے۔ اب آپؐ کی بتائی ہوئی باتوں میں سے اگر کچھ چیزیں مانے جانے کے قابل ہیں تو یا تو وہ ہیں جو خود ان کی اپنی خواہشات کے مطابق ہیں یا وہ ہیں جن کو خوش قسمتی سے موجودہ زمانے میں بھی قدر و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو یہ لوگ دل سے گوارا کرنے کے لیے تیار ہوں اگرچہ اپنی کمزوری اور بزدلی کے سبب سے اس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ رکھتے ہوں۔

(۴) ہمارے عوام الناس کا ایک بڑا طبقہ ایسے لوگوں پر بھی مشتمل ہے، جن کے نزدیک نبی ﷺ کی ذات بس ایک اندھی بہری عقیدت کا مرجع ہے۔ وہ مختلف اوقات میں اپنی اس عقیدت کا اظہار کر کے اپنے خیال میں آپؐ کی نبوت و رسالت کے تمام حقوق و واجبات سے اپنے آپ کو سبکدوش کر لیتے ہیں۔ انہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ نبی ﷺ کس مقصد کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے، آپؐ نے دنیا کو کیا تعلیم دی، اپنے بعد امت پر کیا ذمہ داریاں چھوڑ گئے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے ہمیں کیا کچھ کرنا ہے۔ ان سوالوں پر غور کرنے اور ان کے تقاضے پورے کرنے کی بجائے، وہ اپنے تصورات کے مطابق، آپؐ کی ذات کے ساتھ اظہار عقیدت کر لینے کو کافی سمجھتے ہیں اگرچہ اس اظہار عقیدت کا طریقہ صریحاً آپؐ کی تعلیمات اور ہدایات کے خلاف ہی ہو۔ جاہل پیروں اور

مولویوں کی ایک جماعت نے نبی ﷺ کے ساتھ عوام کے اس جذبہ عقیدت سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ شریعت کی حقیقی ذمہ داریوں سے محفوظ رہتے ہوئے عوام میں مقبول بننے کا یہ راستہ بہت سہل ہے کہ عوام کی اس جاہلانہ عقیدت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف تو نبی ﷺ کو منصب رسالت سے اٹھا کر خدائی کے منصب پر متمکن کرنے کی کوشش کی اور اپنے زعم کے مطابق اس کے دلائل فراہم کیے۔ دوسری طرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ اظہار عقیدت ومحبت کے ایسے طریقے ایجاد کیے جن سے ان کو اپنی خواہشات نفس کی تسکین کے لیے شریعت کی تمام پابندیوں سے پوری آزادی مل جائے۔ اس طرح نبی ﷺ کے نام اور آپؐ کی محبت وعقیدت کا کلمہ پڑھتے ہوئے ان تمام عقائد کی بنیادیں بھی ڈھادی گئی ہیں جن سے معرفت الٰہی کی راہیں کھلی تھیں اور وہ تمام اعمال واخلاق بھی برباد کر دیے گئے جو اس معرفت کو جلا دینے والے تھے۔ جس ذات کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس مقصد کے لیے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کے لیے رہنما بنے اور ان کو خدا کا راستہ دکھائے، اسی کے نام کو ان ظالموں نے اس مقصد کے لیے استعمال کیا کہ لوگوں کو خدا کے رستے سے ہٹا کر ان کو گمراہی کے راستوں پر ڈال دیں۔

نبی ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت

نبی ﷺ کی حیثیت اور آپؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت سے متعلق ہمارے اندر جو گمراہیاں آج پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے ہم نے یہ چند بڑی بڑی گمراہیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر معرفت الٰہی کے حصول کا واحد راستہ نبی ﷺ کی ذات ہی ہے تو ان گمراہیوں کی موجودگی میں آپؐ کے ساتھ نہ تو ہمارا صحیح ربط ہی قائم ہو سکتا ہے اور نہ وہ چیز ہی ہم آپؐ سے حاصل کر سکتے ہیں جس کے حاصل ہونے کا آپؐ واحد ذریعہ ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن بنیادوں پر قرآن نے نبی ﷺ کے ساتھ ہمیں اپنا تعلق استوار کرنے کی ہدایت کی ہے ہم وہ بنیادیں واضح کر دیں تاکہ جو شخص خدا تک پہنچنا چاہے وہ خدا تک پہنچنے کے واحد ذریعہ کے ساتھ اپنی ٹھیک ٹھیک وابستگی قائم کر سکے۔

ہمارے نزدیک قرآن مجید نے نبی ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کو مندرجہ ذیل چار بنیادوں پر قائم کیا ہے:

۱۔ ایمان

۲۔ اطاعت

۳۔ اتباع

۴۔ محبت

ایمان

نبی ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی پہلی بنیاد ایمان ہے۔ ایمان کا مطلب صرف یہ مان لینا ہی نہیں ہے کہ آپؐ اللہ کے آخری رسول ہیں بلکہ اس ایمان کی اصل روح آپؐ کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہے۔ اس بات پر اعتماد کہ آپؐ صادق اور امین ہیں۔ اس بات پر اعتماد کہ آپؐ کے ہر قول اور ہر فعل کے اندر گہری حکمت ہے اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آرہی ہو۔ اس بات پر اعتماد کہ آپؐ نے جو راہ دکھائی ہے اگرچہ بظاہر اس میں کتنے ہی خطرات نظر آ رہے ہوں لیکن نجات اور فلاح کی حقیقی راہ وہی ہے۔ اس بات پر اعتماد کہ آپؐ نے زندگی کے جو اصول سکھائے ہیں وہ وقتی اور عارضی نہیں ہیں بلکہ وہ دائمی اور ابدی ہیں اور انسان ان سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہو سکے گا۔ اور سب سے بڑھ کر اس بات پر اعتماد کہ خدا کی معرفت کا جو طریقہ آپؐ نے بتایا اور سکھایا ہے، اس سے بڑھ کر نہ کوئی اور طریقہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

جب تک آدمی کے اندر یہ اعتماد نہ پیدا ہو، مجرد اس تصدیق سے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، آدمی ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہوتا اور نہ یہ ایمان اس معرفت کے نقطۂ نظر سے کچھ کارآمد ہوتا ہے جو اس ایمان کی حقیقی غایت ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں فرمایا گیا ہے:

> ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربًا و بالاسلام دینًا و بمحمد رسولاً
> (صحیح مسلم: کتاب الایمان باب ۱۱)

ایمان کا مزا اس نے چکھا جو اللہ کے اپنا رب ہونے پر، اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور

محمد (ﷺ) کے اپنا رسول ہونے پر مطمئن ہو گیا۔

یہی اعتماد ہے جس کی تعلیم نبی ﷺ نے ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم کبھی کبھی یہود سے ایسی باتیں سنتے ہیں جو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپؐ اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض باتیں نوٹ کر لیا کریں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اپنے دین کے بارہ میں حیرانیوں میں پڑ گئے اسی طرح تم بھی حیرانیوں میں پڑنا چاہتے ہو؟ میں نے تمہارے سامنے اللہ کے دین کو بالکل روشن اور شفاف صورت میں رکھا ہے۔ اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری پیروی کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔ (سنن الدارمی)

یہی بات ایک دوسری روایت میں کچھ مختلف طریقہ پر وارد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا سوال پر کچھ خفگی کا بھی اظہار فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب حضور ﷺ کی خفگی کا احساس ہوا تو وہ فوراً پکار اٹھے:

رضینا باللہ ربًا و بالاسلام دینًا و بمحمد رسولًا۔

ہم اللہ کے اپنا رب ہونے پر، اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمد (ﷺ) کے اپنا نبی ہونے پر پوری طرح مطمئن ہیں۔

ان حدیثوں سے صاف واضح ہے کہ جہاں تک اللہ کی معرفت کا راستہ دکھانے اور خدا کی صراط مستقیم کو واضح کرنے کا تعلق ہے، یہ کام بہتر سے بہتر طریق پر نبی کریم ﷺ نے انجام دے دیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی اگر آپؐ کے بعد ہوتے تو اسی طریقہ کی پیروی کرتے۔ ظاہر ہے کہ حق کی رہنمائی کے نقطہ نظر سے جب آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی لائی ہوئی شریعت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی شریعت کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تو دوسرے اشخاص اور ان کے علوم و افکار اور نظریات و تجربات کی کیا وقعت باقی رہتی ہے؟ دوسرے علوم و افکار کچھ قابل لحاظ ہو سکتے ہیں تو صرف اس حد

تک ہو سکتے ہیں جہاں تک وہ کتاب و سنت کے موافق و مؤید ہوں۔ اگر کوئی شخص اس حد سے بڑھ کر کسی فکر و فلسفہ کو یا کسی وجدان و کشف کو یا کسی طریقہ اور تجربہ کو نبی ﷺ کے علم و عمل پر ترجیح دے یا اس کے برابر ہی ٹھہرائے یا اس کسوٹی پر جانچے بغیر ہی اس کو تسلیم کرے اور اس کے ساتھ ساتھ نبی ﷺ پر ایمان کا بھی دعویٰ کرے تو اس کا دعوائے ایمان محض ایک فریب نفس ہے کیونکہ اس کا ایمان اس اعتماد سے بالکل خالی ہے جو اس ایمان کی اصل روح ہے۔

اطاعت

نبی ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری شرط آپؐ کی کامل اطاعت ہے۔ دنیا کا کوئی نبی اور رسول بھی اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ بس اس کو مان لینے کی حد تک لوگ اس کو نبی اور رسول مان لیں۔ بلکہ اس کے بھیجے جانے سے اصل شے جو مقصود رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسی کی اطاعت بھی کی جائے اور زندگی کے معاملات میں جو احکام و ہدایات وہ دے اس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء۔۴:۶۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

دوسری جگہ ہے کہ آدمی کے نیک اعمال کی قبولیت کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرے۔ اگر وہ اطاعت نہ کرے تو اس کے تمام اعمال رائگاں ہو جاتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝
(محمد۔۴۷:۳۳)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو رائگاں نہ کرو۔

رسول کی اطاعت کے مطالبہ کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت جو اصل مقصود ہے اس کا راستہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہ راست معاملہ نہیں کرتا بلکہ اپنے رسول کے واسطے سے کرتا ہے۔ رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس

کے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس وجہ سے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرے۔ رسول کی یہ اطاعت ہی درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء ۴: ۸۰)
جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

رسول کا ہاتھ لوگوں کے لیے اللہ کے ہاتھ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ جو لوگ رسول کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ گویا بالواسطہ اللہ ہی کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ (الفتح ۴۸: ۱۰)
جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

خود احادیث میں بھی اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی اطاعت کا راستہ یہی ہے کہ محمد ﷺ کی اطاعت کی جائے، مثلاً:

فمن اطاع محمداً ﷺ فقد اطاع اللہ. و من عصی محمداً ﷺ فقد عصی اللہ و محمد ﷺ فرق بین الناس.
جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان محمد ﷺ ہی نشانِ امتیاز ہیں۔

قرآن مجید میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ یہ اطاعت محض ظاہری اور رسمی قسم کی مطلوب نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ آدمی پورے طور پر اپنے آپ کو خدا کی کتاب اور پیغمبر کی سنت کے تابع کر دے، آپس میں جتنے قضیے اور مسئلے بھی پیدا ہوں، ان سب کے طے کرنے کے لیے کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کیا جائے، اور پھر کتاب و سنت کے فیصلوں کو دل کے پورے اطمینان اور طبیعت کی پوری رضامندی کے ساتھ قبول کیا جائے، ان کے خلاف دل کے اندر کسی قسم کی بدگمانی یا شکایت نہ رہے۔ فرمایا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء ۴: ۶۵)
پس نہیں، تیرے رب کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کر دیں۔

ان آیات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کا تعلق صرف نبی ﷺ کی زندگی ہی سے تھا، جب آپؐ کی ذاتِ خاص ہمارے درمیان موجود نہیں رہی تو اس اطاعت کا سوال بھی باقی نہیں رہا۔ آپؐ کی وفات کے بعد اللہ کی کتاب اور آپؐ کی سنت امت کے اندر آپؐ کے قائم مقام ہے، اس وجہ سے اب انھی دو چیزوں کی اطاعت آپؐ کی اطاعت ہے۔ نبی ﷺ نے اپنی وفات سے پہلے خود اس کی وصیت بھی فرما دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

ترکت فیکم امرین. لن تضلوا ما تمسکتم بھما — کتاب اللہ و سنۃ نبیہ.
(مؤطا امام مالک: کتاب القدر باب ۱)
میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم ان دونوں پر مضبوطی سے قائم رہو گے اس وقت تک تم گمراہ نہ ہو گے — اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔

علاوہ ازیں ایک اسلامی حکومت کے وہ امراء اور حکام بھی اس حکم میں داخل ہیں جو زمین میں خدا کی کتاب اور آپؐ کی سنت کے نافذ کرنے والے ہوں۔ اس کی تصریح بھی نبی ﷺ نے فرما دی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ: من اطاعنی فقد اطاع اللہ. و من عصانی فقد عصی اللہ. و من اطاع الامام فقد اطاعنی و من عصی الامام فقد عصانی.
(سنن ابن ماجہ: کتاب الجہاد باب طاعۃ الامام)
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ جس نے میری نافرمانی کی تو اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی اطاعت کی تو اس

نے میری اطاعت کی۔ اور جس نے امام کی نافرمانی کی تو اس نے میری نافرمانی کی۔

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ نبی ﷺ کو رسول ماننے کی اصلی حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کتاب و سنت کی پیروی کریں جن کے ذریعے سے آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے احکام سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے۔ اگر محض زبان سے آنحضرت ﷺ کی رسالت کا اقرار کیا جاتا رہے اور اطاعت اپنی ہوائے نفس کی یا رسول کی ہدایات کے خلاف دوسروں کی کی جاتی رہے تو اس طرح رسولؐ کو رسول ماننا وہ ماننا نہیں ہے جس سے معرفت الٰہی کے دروازے کھلیں۔ بلکہ اس طرح کا ماننا الٹا آدمی کے خسران اور اس کی بدبختی میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔

اتباع

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد اتباع ہے۔ اتباع کا دائرہ اطاعت سے زیادہ وسیع ہے۔ اطاعت کے دائرہ میں تو عموماً وہی باتیں آتی ہیں جن کی حیثیت احکام و واجبات اور اوامر و نواہی کی ہو، لیکن اتباع کے دائرہ میں مستحبات و نوافل بھی آجاتے ہیں۔ پھر اطاعت بعض حالات میں محض ظاہری اور رسمی بھی ہو سکتی ہے۔ آدمی ایک شخص کی اطاعت کرتا ہے لیکن اس کی اطاعت میں اخلاص اور محبت کا جذبہ ذرا بھی شامل نہیں ہوتا۔ لیکن اتباع میں متبوع کے لیے عقیدت و احترام کا جذبہ پایا جانا بھی شرط ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کی اطاعت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ آپؐ کی اتباع بھی کرتے تھے۔ وہ صرف یہی نہیں کرتے تھے کہ آپؐ کسی بات کا حکم دیں تو اس کی تعمیل کر دیں یا کسی بات سے روکیں تو اس سے رک جائیں بلکہ وہ آپؐ کی ایک ایک ادا کو دیکھتے، اس کو نگاہوں میں رکھتے اور پھر اس کی تقلید کرتے تھے — آپؐ کس طرح اٹھتے ہیں، کس طرح بیٹھتے ہیں، کس طرح سوتے ہیں، کس طرح جاگتے ہیں، کس طرح چلتے ہیں، کس طرح گفتگو کرتے ہیں، کس طرح کھانا کھاتے ہیں، کس طرح ہاتھ دھوتے ہیں، کس طرح وضو کرتے ہیں، کس طرح نماز پڑھتے ہیں، غرض وہ آپؐ کی تمام حرکات و سکنات پوری طرح نظر میں رکھتے اور پھر ان میں سے ہر شخص کی یہ دلی خواہش ہوتی کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نبی ﷺ کی زندگی کے سانچے میں ڈھالے۔

وہ یہ اہتمام کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ محبت و عقیدت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کرتے تھے۔

اتباع رسول میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس ذوق و شوق کی وجہ یہ تھی کہ خدا کی محبت اور محبوبیت کا درجہ صرف اطاعت رسول سے نہیں بلکہ درحقیقت اتباع رسول سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول، خدا کی معرفت کا مظہر کامل ہوتا ہے اور اس کی ایک ایک ادا معرفت الٰہی کا نشان ہوتی ہے، اس وجہ سے جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں وہ رسول کی ایک ایک ادا سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ رسول کے اندر وہ علم دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے، وہ عمل دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے پیدا ہوتا ہے، وہ عادات دیکھتے ہیں جو خدا کو پسند ہیں، وہ صفات دیکھتے ہیں جو خدا کو محبوب ہیں، وہ جمال دیکھتے ہیں جس پر جمال خداوندی کا پرتو ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ رسول کے ایک ایک نقش کو تلاش کر کر کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور چونکہ یہ سب کچھ خدا کی محبت میں کرتے ہیں اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا صلہ یہ پاتے ہیں کہ وہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں۔ یہی حقیقت قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران۔۳:۳۱)
کہہ دو: اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا۔

درحقیقت رسول کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہی یہی ہے کہ معرفت الٰہی کا جو عکس انسان کی زندگی پر پڑنا چاہیے اس کو رسول کی روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کرایا جائے۔ اگر باطن میں معرفت کا نور جلوہ گر ہو تو ظاہر کی ایک ایک چیز میں نورانیت ہونی چاہیے۔ پیغمبر کی زندگی اس کا کامل نمونہ ہوتی ہے، اس وجہ سے اس کی زندگی کی ایک ایک ادا کو پیروی کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی میں جتنا ہی ترقی کرتا ہے وہ خدا کی محبت اور اس کی محبوبیت میں اتنی ہی ترقی کرتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔۳۳:۲۱)
اور تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

محبت

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی شرط آپؐ کے ساتھ ہماری محبت ہے۔ دین میں وہ ایمان یا وہ اطاعت معتبر نہیں ہے جس کی بنیاد محبت پر نہ ہو۔ ایسی اطاعت جس کی تہہ میں محبت کا جذبہ کارفرما نہ ہو بعض حالات میں محض نفاق ہوتی ہے۔ پھر محبت بھی محض رسمی اور ظاہری قسم کی مطلوب نہیں ہے بلکہ ایسی محبت مطلوب ہے جو تمام محبتوں پر غالب آجائے، جس کے مقابل میں عزیز رشتے اور محبوب سے محبوب تعلقات کی بھی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ جائے، جس کے لیے دنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جاسکے لیکن خود اس کو کسی قیمت پر نہ چھوڑا جاسکے۔ قرآن مجید میں اس محبت کا معیار یہ بتایا گیا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ
(التوبہ ۔ ۹:۲۴)

ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا، وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں اگر اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمادے۔

اسی حقیقت کو نبی ﷺ نے مختلف طریقوں سے احادیث میں بھی واضح فرمایا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ کسی شخص کا ایمان بالرسول متحقق نہیں ہوسکتا جب تک وہ مجھ کو اپنے باپ، بیٹے اور دوسرے تمام عزیزوں اور قرابت داروں سے عزیز نہ رکھے:

قال رسول اللہ ﷺ: لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین۔ (صحیح مسلم: کتاب الایمان باب ۱۹)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے

نزدیک، اس کے بیٹے اس کے باپ اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس قسم کی محبت کے بعد ہی کوئی شخص ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا ہوسکتا ہے:

ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان: ان تکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما۔ (صحیح البخاری: کتاب الایمان باب ۸)

تین چیزیں جس شخص میں ہوں گی وہ ان کے سبب سے ایمان کا مزا چکھے گا۔ ایک وہ شخص جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔

لیکن یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جس محبت کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مقصود محض وہ جذباتی محبت نہیں ہے جو آدمی کو فطری طور پر اپنے بیوی بچوں سے یا اپنے دوسرے عزیزوں کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ اس سے مقصود وہ عقلی اور اصولی محبت بھی ہے جو ایک شخص کو کسی اصول اور مسلک کے ساتھ ہوا کرتی ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی زندگی میں ہر جگہ اسی اصول اور اسی مسلک کو مقدم رکھتا ہے۔ اس اصول اور مسلک کے اوپر وہ ہر چیز اور ہر اصول، ہر مسلک اور ہر خواہش اور ہر حکم کو قربان کردیتا ہے لیکن خود اس کو دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہیں کرتا۔ اس اصول اور مسلک کی برتری کے لیے وہ ساری چیزوں کو پست کردیتا ہے لیکن اس اصول اور مسلک کو کسی حالت میں بھی پست دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اگر اس سے خود اس کا اپنا نفس اس مسلک کی مخالفت میں مزاحم ہوتا ہے تو وہ اس سے بھی لڑتا ہے، اگر دوسرے اس سے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا بھی وہ مقابلہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بیوی بچوں اور اعزہ و اقارب کے مطالبات بھی اگر اس کے اس مسلک کے مطالبات سے کسی مرحلہ پر ٹکراتے ہیں تو وہ اپنے اس اصول اور مسلک کا ساتھ دیتا ہے اور بے تکلف اپنے بیوی بچوں کی خواہشوں اور اپنے خاندان اور قوم کے مطالبہ کو ٹھکرا دیتا ہے۔

اس محبت کا اصولی اور عقلی ہونا خود حضور نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں واضح فرما دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

من احب سنتی فقد احبنی و من احبنی کان معی فی الجنۃ. (سنن الترمذی)
جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

اطاعت بلا محبت اور محبت بلا اتباع

اس تفصیل سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی ﷺ کے ساتھ ہمارا ایمانی تعلق اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتا جب تک اس ایمان کی بنیاد اطاعت، اتباع اور محبت پر نہ ہو، وہیں مختلف اشارات سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اطاعت بلا محبت کے نفاق، اور محبت بلا اطاعت و اتباع کے بدعت ہے۔

یہ بات کہ محبت بلا اطاعت کے نفاق ہے، خود قرآن مجید سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے۔ حوالیٔ مدینہ کے بہت سے اعراب، اسلام کی سیاسی طاقت بڑھ جانے کے بعد اسلامی احکام وقوانین کی ظاہری اطاعت کرنے لگے تھے لیکن یہ اطاعت محض سیاسی مصالح کے تحت مجبورانہ تھی، اللہ اور رسول کی محبت اور اس ایمان کا نتیجہ نہیں تھی جس کی اصلی روح اخلاص و اعتماد ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے جب بعض مواقع پر اپنے ایمان کا دعویٰ اس طرح کیا جس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ انہوں نے ایمان لا کر آنحضرت ﷺ پر اور اسلام پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے تو قرآن نے آنحضرت ﷺ کو یہ ہدایت کی کہ ان مدعیان ایمان سے کہہ دو کہ محض اسلامی احکام وقوانین کی ظاہری اطاعت سے آدمی مومن نہیں ہو جایا کرتا بلکہ ایمان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اخلاص و محبت بھی شرط ہے اور یہ چیز تمہارے اندر مفقود ہے، اس وجہ سے ابھی تمہارا دعوائے ایمان بھی غلط ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ (الحجرات۔۴۹:۱۴)

اہل بدو نے کہا کہ ہم ایمان لائے۔ ان کو بتا دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں! یوں کہو کہ ہم نے

اطاعت کرلی اور ابھی ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا ہے۔

رہی دوسری بات، یعنی محبت بلا اطاعت و اتباع کا بدعت ہونا تو یہ اوپر کی آیات و احادیث سے واضح طور پر نکلتی ہے۔

جس طرح قرآن مجید نے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ والی آیت میں اللہ کی محبت کا طریقہ یہ بتلایا ہے کہ نبی ﷺ کی اتباع کی جائے اور بغیر اتباع نبی (ﷺ) کے اللہ کی محبت کے جتنے طریقے ایجاد کیے گئے ہیں ان سب کو بدعت و ضلالت قرار دیا ہے، اسی طرح نبی ﷺ نے من احب سنتی فقد احبنی والی حدیث میں یہ واضح فرمادیا کہ آپؐ سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپؐ کی سنت کے ساتھ محبت کی جائے۔ اور بعض دوسری حدیثوں میں آپؐ نے اپنی محبت میں اس قسم کے غلو کی ممانعت فرمائی ہے، جس قسم کا غلو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں کیا۔

نبی ﷺ کی وہ ہدایت اور یہ ممانعت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ جو لوگ نبی ﷺ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن آپؐ کی سنت کی پیروی نہیں کرتے اول تو ان کا دعویٰ ہی بے حقیقت ہے اور اگر اس کے اندر سچائی کی رمق ہے بھی تو ان کی یہ محبت بالکل بے معنی محبت ہے۔ اور اگر انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ محبت کرنے کے کچھ ایسے طریقے بھی ایجاد کر لیے ہیں جو صریحاً آپؐ کی سنت کے خلاف ہیں تو یہ اس طرح کی بدعت ہے جس طرح کی بدعت نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں کی ہے کہ ان کو پیغمبر کی بجائے خدا بنا کے بٹھا دیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت نبی ﷺ کے ساتھ محض عقلی و اصولی ہی نہیں تھی بلکہ جذباتی بھی تھی لیکن یہ جذبات بھی حدود کتاب و سنت سے متجاوز نہیں ہوتے تھے۔ ایک طرف یہ حال تھا کہ صحابہؓ اپنے اوپر بڑی سے بڑی تکلیف اٹھا لیتے لیکن نبی ﷺ کے تلووں میں ایک کانٹے کا چبھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، نبی ﷺ کی حفاظت میں ان کے اپنے جسم تیروں سے چھلنی ہو جاتے تھے لیکن وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے جیتے جی آپؐ کا بال بھی بیکا ہو۔ مرد تو مرد عورتوں تک کے جذبات کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے بیٹے اور شوہر اور باپ اور بھائی سب کو قربان کر

کے بھی نبی ﷺ کی سلامتی کی آرزوئیں رکھتی تھیں۔ دوسری طرف اتباع سنت کا یہ اہتمام تھا کہ اس محبت سے مغلوب ہو کر بھی کبھی کوئی ایسی بات ان سے صادر نہیں ہوتی تھی جو آپؐ کی صریح ہدایات تو درکنار، آپؐ کی پسند ہی کے خلاف ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ملاحظہ ہو:

عن انس قال: لم یکن شخص احبّ الیھم من رسول اللہ ﷺ . و کانوا اذا راوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیتہ لذالک۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہؓ کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی شخص بھی محبوب نہ تھا۔ لیکن جب وہ آپؐ کو دیکھتے تو آپؐ کی تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوتے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ آپؐ اس بات کو ناپسند فرماتے ہیں۔

لیکن آج اگر ہم مسلمانوں کا جائزہ لیں تو ان کے اندر عظیم اکثریت ایسے ہی لوگوں کی نکلے گی جو یا تو نبی ﷺ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس ایمان کے ساتھ اطاعت موجود نہیں ہے۔ یا محبت کا دم بھرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اتباع سنت نہیں ہے۔ اطاعت اور اتباع دونوں کی جگہ انہوں نے اپنے جی سے چند چیزیں ایجاد کر لی ہیں — کچھ میلاد کی مجلسیں منعقد کر دیتے ہیں، کچھ دیگیں پکوا کے تقسیم کر دیتے ہیں، ایک آدھ جلوس نکلوا دیتے ہیں، کچھ نعرے لگوا دیتے ہیں — بس اس طرح کی کچھ باتیں ہیں جن سے ان کا ایمان اور ان کی محبت رسول عبارت ہے۔ آپ کو کتنے ایسے اشخاص مل جائیں گے جنہوں نے نماز مدت العمر نہیں پڑھی لیکن مہینہ میں میلاد کی مجلسیں اور قوالی کی محفلیں کئی بار منعقد کرتے ہیں۔ مال رکھتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنے کی ان کو کبھی توفیق نہیں ہوئی لیکن اپنی ان بدعات پر، جو وہ رسول اللہ ﷺ کے نام پر کرتے ہیں، ہر سال ہزار ہا روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ ان کو اس بات کی کبھی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا مطالعہ کریں اور ان کی روشنی میں اپنی زندگیوں کا جائزہ لے کر ان کو درست کرنے کی کوشش کریں لیکن رسول اللہ ﷺ کے عشق میں اپنے آپ کو ہر وقت سرشار ظاہر کرتے ہیں اور نعتیہ اشعار پڑھ کر یا سن کر ان پر وارفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ حالت ہمارے کسی ایک ہی طبقہ کی نہیں ہے بلکہ ہمارے اکثر طبقے اسی قسم کی

محبت رسول کے دعویدار ہیں اور اگر کچھ لوگ اتباع سنت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں تو ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان کے نزدیک تمام سنت جن چند اختلافی مسائل کے اندر سمٹ آئی ہے بس انہی چند چیزوں پر ان کا سارا زور صرف ہوتا ہے۔ گویا نبی ﷺ کی بعثت صرف انہی چند مسائل کی تعلیم کے لیے ہوئی تھی۔

باب ۶

حجاباتِ علم

پچھلے مباحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ علم حقیقی دراصل ہے کیا اور اس کے حاصل کرنے کے وسائل و ذرائع کیا ہیں۔ اب ہم بتائیں گے کہ اس علم کے حصول کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، وہ رکاوٹیں کہاں سے ابھرتی ہیں اور ان کے دور کرنے یا ان پر قابو پانے کی تدابیر کیا ہیں؟

ہمارے نزدیک یہ رکاوٹیں یا حجابات دو قسم کے ہیں: ایک تو وہ رکاوٹیں ہیں جن کے پیدا ہو جانے کے بعد علم حقیقی کے حصول کا راستہ ہی سرے سے بند ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ ان کے ہوتے ہوئے انسان کے اندر علم حقیقی کے لیے کوئی رغبت پیدا ہو سکے یا اس کے حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی جد و جہد کر سکے۔ بلکہ یہ رکاوٹیں انسان کو اس قدر ناکارہ بنا دیتی ہیں کہ اس کی رغبت اور خواہش کے بغیر علم حقیقی اس پر کہیں سے برس بھی پڑے تب بھی وہ اس نعمت کی قدر نہیں کر سکتا۔

دوسری وہ رکاوٹیں ہیں جن کی نوعیت آفتوں اور بیماریوں کی سی ہے۔ یعنی یہ ایک آفت کی طرح انسان کے حاصل کردہ علم پر نازل ہوتی ہیں اور پھر یا تو دیمک کی طرح آہستہ آہستہ اس کے پورے ذخیرہ کو چاٹ جاتی ہیں یا ایک برق خاطف کی طرح چشم زدن میں اس کو سوخت کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ہم نے پہلی قسم کی رکاوٹوں کے لیے حجابات کی اصطلاح اختیار کی ہے اور اس

دوسری قسم کی مصیبتوں کے لیے آفات کی۔ ہم اس باب میں حجابات کی وضاحت کریں گے، اس کے بعد ایک علیحدہ باب میں آفات پر بحث کریں گے، پھر ایک مستقل باب میں ان کے دور کرنے یا ان پر قابو پانے کی تدابیر بیان کریں گے۔

ہمارے نزدیک بڑے بڑے حجابات چار ہیں:

۱۔ حب عاجلہ

۲۔ تکبر

۳۔ عصبیت جاہلیت

۴۔ غفلت اور لاابالی پن

ان کو مختصر تشریح کے ساتھ ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

حبِّ عاجلہ

علم حقیقی سے محروم رکھنے والے حجابات میں سے سب سے بڑا حجاب، حبِّ عاجلہ کا حجاب ہے۔ حبّ عاجلہ کا مطلب ہے آخرت کی زندگی اور اس کی نعمتوں کے مقابل میں دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں اور راحتوں کو ترجیح دینا۔

آدمی کے سامنے سب سے پہلے اس کی جسمانی ضرورتیں اور خواہشیں ہی آتی ہیں اور انہی کے پورا کرنے پر اس کے مادی اور جسمانی وجود و بقا منحصر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ مجبور ہوتا ہے کہ ان خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کوشش کرے۔ ایک خاص حد تک ان خواہشات اور ضروریات کی تحصیل میں انسان کا مصروف ہونا خود قدرت کا منشاء ہے۔ چنانچہ اسی مصلحت سے قدرت نے ان کے ساتھ لذت کی چاٹ بھی لگا رکھی ہے تا کہ انسان ان کو ایک بالکل بے مزا اور محض مشقت کا دھندا سمجھ کر چھوڑ نہ بیٹھے بلکہ ان کے مطلوبات کو حاصل کرنے میں جوش اور سرگرمی کے ساتھ کوشش کرے تا کہ ان کے واسطے سے انسان کے جو شخصی اور نوعی مصالح پورے ہونے ہیں وہ پورے ہو سکیں۔

لیکن ان چیزوں کے اندر انسان کا انہماک بس ایک خاص حد تک ہی مطلوب ہے۔ اگر یہ

انہماک اس خاص حد سے آگے بڑھ جائے تو اس سے انسان کے روحانی اور اخلاقی اقدار کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ پھر یہ خواہشیں اور لذتیں انسان پر اس طرح سوار ہو جاتی ہیں کہ وہ بالکل ہی بطن وفرج کا غلام بن کے رہ جاتا ہے اور اس کو یہ سوچنے کی بھی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ان خواہشوں کی غلامی کے سوا اس کی زندگی کا اور کوئی مقصد بھی ہے اور اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس کے تقاضے اور مطالبات اس زندگی کے تقاضوں اور مطالبات سے کچھ مختلف ہیں۔ یہی گروہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (الفرقان۔۲۵:۴۴)

کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ یہ تو بس چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔

اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝
(الکہف۔۱۸:۱۰۳۔۱۰۵)

کہو: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی تمام سعی اس دنیا کی زندگی کے پیچھے اکارت گئی اور وہ گمان کرتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کرتے رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا۔ پس ان کے اعمال اکارت گئے اور قیامت کے دن ہم ان کو ذرا بھی وزن نہ دیں گے۔

یہ حبِ عاجلہ کے گرفتاروں کی عام قسم ہے۔ دنیا میں زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو دنیاوی لذتوں اور راحتوں ہی کو اپنا مقصودِ زندگی بنا لیتے ہیں اور انہی کے حاصل کرنے اور انہی کی فراہمی میں اپنی زندگیاں گنوا دیتے ہیں۔

لیکن ان کے اندر ایک قسم ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو ان حقیر نفسانی لذتوں اور راحتوں کے مقابل میں بظاہر کچھ بلند مقاصد اور بلند اقدار کے طالب ہوتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہ بلند مقاصد اور بلند اقدار بھی حبِ عاجلہ ہی کی ایک قسم ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ عام قسم کے پست ذہن لوگ اپنے شخصی اغراض اور ذاتی فوائد ہی کے دائرہ کے اندر بند رہ جاتے ہیں، اس سے آگے انہیں ان خوبیوں اور ان کمالات کو اپنانے کا حوصلہ نہیں ہوتا جو ان کو خدا کی نظر میں نہ سہی کم از کم سوسائٹی ہی کی نظروں میں کچھ عزت وعظمت دلا سکیں۔ لیکن یہ گروہ چونکہ اپنے اندر کچھ ذہانت رکھتا ہے اس وجہ سے وہ محدود شخصی اغراض ومنافع سے آگے بڑھ کر کچھ ایسے کمالات حاصل کرنے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مارتا ہے جو مجرد حبِ ذات کے نصب العین سے بلند ہوتے ہیں۔ مگر اس بلندی کی بساط بس اتنی ہوتی ہے کہ آدمی اپنی ذات اور اپنے نفس کی پرستش سے نکل کر اپنی سوسائٹی کی بندگی اور غلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اس طرح کے لوگ بلاشبہ علوم اور کمالات کے طالب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ انہی علوم کو علوم اور انہی کمالات کو کمالات سمجھتے ہیں جو وقت کی سوسائٹی میں ان کو عزت اور شہرت دلا سکیں یا جن سے وہ اپنے دنیاوی مقاصد زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ حاصل کر سکیں۔ یہ لوگ درحقیقت اپنے وقت کی سوسائٹی کے بندے ہوتے ہیں۔ سوسائٹی جن چیزوں کو پسند کرے یہ ان کے حاصل کرنے کے لیے اپنا سارا زور وزر صرف کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے اگرچہ حقیقت کے نقطۂ نظر سے ان کی کوئی قدر وقیمت نہ ہو۔ اور اگر سوسائٹی کے اندر ایک چیز کی مانگ نہ ہو تو وہ اس چیز کی طرف کبھی مڑ کے بھی نہ دیکھیں گے اگرچہ وہ چیز آسمان ہی سے کیوں نہ اتری ہو۔ سوسائٹی میں اگر طلب ہو تو یہ سحر وساحری اور علم قراءت الید (PALMISTRY) کو بھی علم لدنی کا درجہ دے دیں گے لیکن اگر سوسائٹی میں مانگ نہ ہو تو نبیوں اور رسولوں کا علم بھی ان کی نگاہ میں اوہام وخرافات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝ (الدھر۔۷۶:۲۷)

یہ لوگ صرف دنیائے عاجل سے محبت رکھتے اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حبِ عاجلہ کے اس حجاب کو **حجاب طبع** اور **حجاب رسم** کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے اور ان دونوں حجابوں کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

"تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کے اندر کھانے پینے اور جماع کے تقاضے موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اس کا دل مختلف طبعی تغیرات' مثلاً غم، خوشی، غصہ اور خوف سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ ان میں سے ہر حالت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ آدمی کا نفس پہلے سے ان کے اسباب کی طرف متوجہ ہو اور اس کی تمام ذہنی قوتیں دوسری تمام سمتوں سے مڑ کر اس چیز کی طرف مرکوز ہو جائیں، اس وجہ سے ان چیزوں میں وہ زیادہ مشغول رہتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر چیز کا اثر انسان کی طبیعت پر بعد میں بھی قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک طویل زمانہ ایسی حالت میں گزر جاتا ہے کہ یہ چیزیں اس کو اتنی فرصت ہی نہیں دیتیں کہ وہ ایک اعلیٰ چیز کی طرف متوجہ ہو سکے۔ بلکہ بہت سے لوگ تو اس کیچڑ میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ انہیں مدت العمر اس سے نکلنا ہی نصیب نہیں ہوتا۔ کتنے ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر ان کا نفس اتنا غالب آ جاتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے رسوم و آداب اور عقل کی ذمہ داریوں کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے اور کوئی علامت بھی ان کو ان کی نفس پرستی سے روک نہیں سکتی۔ اس حجاب کو حجاب نفس کہتے ہیں۔

"لیکن جن کے اندر عقل اور ذہانت موجود ہوتی ہے وہ انہی نفسانی تقاضوں کے اندر کچھ فرصت کے ایسے اوقات بھی نکال لیتے ہیں جن میں وہ نفسانی تقاضوں سے یکسو ہو کر اپنی عقلی اور عملی قوتوں کے لحاظ سے کچھ نوعی کمالات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ شروع شروع میں آنکھیں کھولتے ہیں اور اپنی قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ اسباب معیشت کی فراہمی، زینت و آرائش کے اہتمام، فخر و مباہات کے ہنگاموں اور فصاحت و خطابت اور علوم و فنون کی سرگرمیوں میں مصروف ہے تو یہی چیزیں ان کے دلوں کو بھی موہ لیتی ہیں اور وہ بھی انہی چیزوں کے حاصل کرنے میں پوری دلچسپی اور پوری سرگرمی کے ساتھ مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس کو **حجاب رسم** اور **حجاب دنیا** کہتے ہیں۔ اور ایسے کتنے ہیں جو انہی چیزوں میں پھنسے ہوئے رہتے ہیں یہاں تک کہ اسی

حالت میں ان کو موت آ جاتی ہے۔" (حجۃ اللہ البالغۃ: باب اعجب المانعۃ عن ظہور الفطرۃ)

شاہ صاحب کے اس بیان سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ عموماً دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں: یا تو وہ لوگ ہیں جو ساری ساری زندگیاں اپنے نفسانی تقاضوں کی تکمیل ہی میں گزار دیتے ہیں اور ان کو اس سے کسی اعلیٰ و برتر مقصد کی طرف توجہ کرنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملتی، یا پھر وہ لوگ ہیں جو اگر کمال حاصل کرنے کی طرف توجہ بھی کرتے ہیں تو بس انہی چیزوں کے حاصل کرنے میں اپنی پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں جن چیزوں کو وقت کی سوسائٹی کمال سمجھتی ہے۔ اس سے آگے نہ ان کے نزدیک کمال کا کوئی تصور ہوتا ہے اور نہ ان کے حصول کے لیے ان کے اندر کوئی جذبہ پیدا ہوتا۔ ان کے حصولِ کمال کی ساری جدوجہد کا منتہیٰ یہ ہوتا ہے کہ اسی طلب دنیا کے ایک جال سے نکلے اور پھر اسی کے دوسرے جال میں جا پھنسے!

تکبر

علم و معرفت کی راہ میں دوسرا بڑا حجاب تکبر ہے۔ تکبر کی تعریف خود نبی ﷺ نے ایک سوال کے جواب میں نہایت واضح طور پر فرما دی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے:

قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا یدخل الجنة من کان فی قلبہ مثقال ذرة من کبر. قال رجل: ان الرجل یحبّ ان یکون ثوبہ حسناً و نعلہ حسنةً؟ قال: ان اللہ جمیل ویحبّ الجمال. الکبر بطر الحق وغمط الناس.

(صحیح مسلم: کتاب الایمان باب ۳۹)

انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کے دل کے اندر ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں داخل ہو گا۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ خود صاحب جمال ہے اور جمال پسند فرماتا ہے۔ تکبر یہ ہے کہ آدمی حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکبر کی اصل حقیقت حق کا انکار اور دوسروں کو حقیر سمجھنا ہے۔ بعض لوگ اپنے آپ کو اتنی بڑی چیز سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ان کے لیے یہ باور کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ جس بات کو وہ جانتے اور مانتے ہیں حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے اور ان کے یا ان کے زمرہ کے سوا کوئی اور شخص بھی کسی احترام یا اعتراف کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ان کو جو عزت و نعمت حاصل ہوتی ہے اس کو وہ اللہ کا فضل سمجھنے اور اس کے شکر گزار ہونے کے بجائے اس کو یا تو اپنا پیدائشی اور خاندانی حق سمجھ بیٹھتے ہیں یا اس کو اپنی کوشش اور قابلیت کا ثمرہ خیال کرتے ہیں اور پھر اس پر اتراتے اور فخر کرتے ہیں۔ اسی چیز کو بعض احادیث میں اعجاب المرء بنفسه (آدمی کی خود فریبی) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور انسان کے لیے تین بڑی مہلک چیزوں میں سے اس کو سب سے زیادہ مہلک شمار کیا گیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

> و اما المهلكات فهن متبع و شح مطاع و اعجاب المرء بنفسه و هو اشدهن.
>
> رہیں تین مہلک چیزیں تو ان میں سے ایک خواہشات کی پیروی ہے، دوسرے بخل کی اطاعت اور تیسرے آدمی کا خود اپنے اوپر فریفتہ ہونا۔ اور یہ چیز ان تینوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔

قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ سب سے پہلے خدا کی نافرمانی شیطان نے کی اور اس کی نافرمانی کی تہہ میں یہی تکبر کا جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق قرآن مجید میں بار بار یہ لفظ آئے ہیں: اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ. (اس نے خدا کی اطاعت سے انکار کیا اور تکبر کیا)۔

قرآن مجید نے انبیائے کرام اور ان کی قوموں کی جو تاریخ بیان کی ہے اس میں بھی جگہ جگہ اس بات کو نمایاں کیا ہے کہ انبیاء کے انکار میں سب سے پہلے ان کی قوموں کے اسی طبقہ نے سبقت کی جو تکبر میں مبتلا تھا۔ ان لوگوں کو اول تو یہی بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھی کہ خدا کی کسی

نعمت کا مستحق ان کے اندر سے کوئی ایسا شخص قرار پائے جو ان کی طرح مالدار اور صاحب اقتدار نہیں ہے اور اگر اس بات پر کسی طرح وہ اپنی طبیعت کو راضی بھی کر لیتے تھے تو پھر اس بات کو برداشت کرنا ان کے لیے ناممکن ہوتا تھا کہ پیغمبر ﷺ کے غریب ساتھیوں کو اپنا ساتھی اور اپنا ہمسر بنائیں اور ان کی صحبت میں برابر کے آدمی کی حیثیت سے بیٹھیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ کے ارباب اقتدار اور مسند نشینوں نے ان کی باتوں کو محض اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ اس سے ان کی علمی و سیاسی برتری کا پندار مجروح ہوتا تھا۔ بعینہ یہی چیز قریش کے اکابر کے لیے بھی حجاب بنی رہی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نبوت کے منصب پر کسی کو سرفراز کرنے والا ہی ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو اس منصب پر سرفراز کرتا، محمد (ﷺ) جیسے نادار اور قلاش آدمی کو یہ عزت ہرگز نہ بخشتا۔ اور اگر کبھی بادل نخواستہ آنحضرت ﷺ کو پیغمبر تسلیم کرنے پر آمادہ بھی ہوتے تو اس کے لیے یہ شرط پیش کرتے کہ آپؐ کے ارد گرد جو غریب اور نادار لوگ — ان کے الفاظ میں رذیل اور بے وقوف لوگ — جمع ہو گئے ہیں پہلے آپؐ ان کو اپنے پاس سے ہٹائیں تب ہم آپؐ کے پاس آئیں گے۔

بعینہ یہی صورت حال ہمیشہ انبیاء کے علاوہ دوسرے مصلحین اور داعیان حق کو بھی پیش آئی ہے۔ ان کی پیش کی ہوئی صداقتوں کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت و قوت کے ساتھ انہی لوگوں نے جھٹلایا ہے جو استکبار کے فتنہ میں مبتلا رہے ہیں۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر آج تک جتنے مصلحین اور داعیان حق پیدا ہوئے ہیں اگر ان کے حالات جمع کیے جائیں تو یہ چیز بطور قدر مشترک اس میں ملے گی کہ اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کی راہ کھولنے کی انہوں نے جو کوشش کی اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ متکبرین ہی بنے۔ نہ انہوں نے خود اس راہ پر چلنا پسند کیا اور نہ، جہاں تک ان کا بس چلا، انہوں نے دوسروں کو اس راہ پر چلنے دینا چاہا۔

اس تکبر کے ساتھ حسد اور غصہ کا پایا جانا بھی لازمی ہے۔ جب ایک حقیقت متکبرین کے تکبر کے علی الرغم ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی ہے اور بالآخر ظہور میں آ کر رہتی ہے تو جو لوگ اس کے دبانے کے درپے ہوتے ہیں ان پر جھنجھلاہٹ بھی طاری ہوتی ہے اور حسد کے دورے بھی پڑنے لگتے ہیں، اور اس حسد اور جھنجھلاہٹ دونوں کے مرکب سے پھر دوسری بہت سی بیماریاں پیدا

ہو جاتی ہیں جو آدمی کو حق سے اتنا دور کر دیتی ہیں کہ اس کے لیے حق کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

عصبیتِ جاہلیت

معرفت حق کے حجابات میں سے ایک حجاب عصبیت جاہلیت بھی ہے۔ عصبیت جاہلیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص قدیم روایات و مالوفات، قدیم رسم و رواج اور باپ دادا کے طریقہ کے تعصب میں گرفتار ہو جائے کہ نہ ان پر کوئی تنقید برداشت کرنے کے لیے تیار ہو اور نہ ان کی جگہ کوئی اور چیز قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ باپ دادا کے طریقہ اور قدیم روایات سے محبت بجائے خود بری چیز نہیں ہے بلکہ بعض اعتبارات سے نہایت اچھی اور نہایت ضروری چیز ہے لیکن ان روایات کو تنقید سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی جگہ ان سے بہتر چیز قبول نہ کرنا جاہلی عصبیت ہے جو علم و معرفت اور حق و صداقت کے راستہ میں ہمیشہ رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کو ان کی قوموں نے زیادہ تر اسی تعصب کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کیا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ ہمارے باپ دادا جو علم و فضل اور اخلاق و عمل میں بہر حال پچھلوں سے برتر تھے، کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کا اختیار کیا ہوا کوئی طریقہ غلط ہو اور بعد والے آ کر اس کی اصلاح کریں! وہ اس بات کو تسلیم کرنے میں اپنے اسلاف کی توہین اور خود اپنی ہتک خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک قدامت بجائے خود ان کے عقیدہ و مسلک کی صحت و صداقت کی ایک ایسی دلیل تھی جس کو دنیا کی کوئی اور دلیل باطل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے مقابل میں نہ وہ عقل کا فیصلہ قبول کرنے کے لیے تیار تھے نہ کسی وحی کو کوئی اہمیت دیتے تھے۔ وہ جس راہ پر چل رہے تھے، اس پر پوری طرح قانع اور مطمئن تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کے لیے جو کچھ بہتر ہو سکتا تھا وہ سب کچھ باپ دادا پر روشن تھا، اب اس میں کسی ترمیم یا کسی اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا کے نعرہ کے اندر ان کا ماضی، ان کا حال اور ان کا مستقبل سب کچھ محفوظ تھا۔ اس وجہ سے وہ اس گنبد سے باہر نکلنے کے لیے کسی طرح بھی آمادہ نہ تھے اگرچہ اس گنبد سے باہر نکلنے کے لیے ان کو کوئی نبی ہی کیوں نہ

دعوت دے رہا ہو۔

قدیم سے محبت اور قدامت کے ساتھ غیر معتدل حسن ظن کا یہی جذبہ ہے جس نے ہمارے یہاں اندھی تقلید کی طرح ڈالی۔ اندھی تقلید کا مطلب یہ ہے کہ اگلوں میں سے کسی کے ساتھ اتنا حسن ظن ہو جائے کہ اس کو بجائے خود سند تسلیم کر لیا جائے اور اس کے کسی قول یا فعل کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جائے۔ یہاں تک کہ اگر اس کا کوئی قول یا فعل کتاب و سنت کے خلاف بھی نظر آئے اور کوئی اللہ کا بندہ اس کی طرف توجہ بھی دلائے جب بھی اس بات پر اصرار کیا جائے جو اس نے کہی ہے اور اس کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی جائے کہ وہ کتاب و سنت کو پچھلوں سے زیادہ جاننے والا ہے اس وجہ سے اس کی بات ضرور کتاب و سنت کی کسی نہ کسی دلیل پر مبنی ہوگی اگرچہ وہ دلیل ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔ اس قسم کی تقلید کتاب و سنت کو عملی اعتبار سے بالکل بانجھ بنا کر رکھ دیتی ہے کیونکہ تقلید زدہ طبقہ اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کتاب و سنت سے جو مکھن نکالا جا سکتا تھا وہ اسلاف نے اچھی طرح بلو کر نکال لیا ہے، اب جو کچھ بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہی چھاچھ ہے۔

غفلت اور لاابالی پن

علم کے لیے ایک بڑا حجاب غفلت اور لاابالی پن بھی ہے۔ غفلت اور لاابالی پن کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زندگی کے کسی پہلو پر بھی سنجیدگی سے غور ہی نہ کرے بلکہ اس کو کسی نہ کسی طرح صرف گزار دینے پر قانع ہو جائے:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اس ذہنیت کے لوگ کبھی اس سوال پر غور نہیں کرتے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، کہاں جائیں گے اور جس نے ہمیں اس دنیا میں بھیجا ہے اس نے کس مقصد کے لیے بھیجا ہے اور اگر وہ مقصد ہم نے پورا نہ کیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ نہیں ہے کہ اس طرح کے سوالات ان کے ذہن میں سرے

سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ پیدا تو ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ کبھی ان کو حل کرنے میں اپنے آپ کو پریشان نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک یہ معمہ نہ کسی سے حل ہوا ہے اور نہ حل ہوگا۔ اس وجہ سے ان کی ساری جدو جہد صرف اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ کسی طرح ان کے عیش اور ان کی بےفکری میں کوئی خلل پیدا نہ ہونے پائے۔ اگر ان کی اس خواہش اور کوشش کے باوجود کوئی تلخ حقیقت سامنے آہی جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ رُو در رُو ہو کر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں، وہ اس کے مقابل میں شتر مرغ کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنا سر ریت میں چھپا لیتے ہیں اور پھر یہ خیال کر لیتے ہیں کہ وہ تلخ حقیقت گزر گئی۔

حد یہ ہے کہ جو لوگ اس لاابالی پن کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ان آزمائشوں سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے جن میں وہ مبتلا کیے جاتے ہیں کہ ان کا یہ لاابالی پن دور ہو اور وہ اپنی زندگی کے مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے اور سنجیدہ نتائج پر پہنچنے کی طرف مائل ہوں۔ ان لوگوں کی مثال حدیث میں گدھے سے دی گئی ہے جس کو اس کا مالک کبھی کھول دیتا ہے اور کبھی باندھ دیتا ہے لیکن اس کو کچھ پتا نہیں کہ کیوں اس نے اس کو باندھا اور کیوں کھول دیا۔

اس گروہ کے اندر ایک عظیم اکثریت ایسے لوگوں کی بھی ہے جن کو زندگی کی ابتدائی ضروریات —— روٹی، کپڑے اور مکان —— کی فراہمی سے اول تو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ کسی اور اعلیٰ اور برتر مقصد کے حاصل کرنے کے درپے ہوں اور اگر فرصت ملتی بھی ہے تو اس کو وہ کسی نہ کسی ایسے مشغلہ میں صرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے ان کو زندگی کی تلخیوں سے کم از کم غافل ہی کر دے۔ اس مقصد کے لیے ان لوگوں نے کچھ عقل کو مغلوب کر دینے والی منشیات اور طبیعت کو بہلانے والی دلچسپیاں ایجاد کر رکھی ہیں جن سے وقتی طور پر ان کو کچھ تفریح حاصل ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن جوں ہی وہ ان سے الگ ہوئے اور ان سُن کر دینے والی دواؤں کا اثر دور ہوا زندگی کی تلخیوں کی وہ ساری ٹیسیں مزید زور و قوت کے ساتھ پھر عود کر آتی ہیں جن سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ان سن کر دینے والی دواؤں کی مدد حاصل کی تھی۔ حالانکہ اگر وہ

اپنا یہ تھوڑا سا فرصت کا وقت ان فضولیات پر ضائع کرنے کے بجائے زندگی کی اعلیٰ حقیقتوں کو سمجھنے پر صرف کرتے تو اس سے وہ اپنی دنیا اور اپنی آخرت دونوں میں بہتر نتائج حاصل کرتے۔ لیکن ان کا لاابالی پن ان کو کسی ایسی چیز کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتا جس میں کچھ سنجیدگی ہو اور جس کے لیے کچھ دماغ اور عقل صرف کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

باب ۷

آفاتِ علم

جس طرح کسی سرسبز وشاداب باغ پر کوئی آفت ارضی وسماوی نازل ہو جاتی ہے اور وہ تباہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ جس طرح لہلہاتی ہوئی کھیتی کو کوئی روگ لگ جاتا ہے جس سے وہ دفعتہً یا آہستہ آہستہ جھلس جاتی ہے۔ جس طرح ایک عالی شان عمارت نذرِ تغافل ہو جانے کے سبب سے یا کسی زلزلہ کی وجہ سے کھنڈر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک تومند اور تندرست انسان کسی بیماری کا شکار ہو کر موت کے کنارے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح علم ومعرفت کو تباہ کر دینے والی بھی بہت سی بیماریاں ہیں جو اگر اس کی جڑوں کو لگ جائیں تو پھر اس کو ختم کر کے ہی دم لیتی ہیں۔ ان آفتوں میں سے بعض اپنے مزاج کے لحاظ سے جلد اور تیز اثر کرنے والی ہیں اور بعض آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ بعض انفرادی حیثیت سے نمودار ہوتی ہیں اور بعض وبائی بیماریوں کی طرح پھوٹ پڑتی ہیں۔ بعض عقل اور ذہن کی طرف سے نمودار ہوتی ہیں۔ بعض اخلاق وعمل کی طرف سے۔ بعض محض کاہلی اور بے پروائی سے پیدا ہوتی ہیں۔ بعض جان، مال یا جامع لفظوں میں دنیا کی غیر معمولی محبت کے سبب سے۔ بعض بزدلی، پست ہمتی اور خوف کا نتیجہ ہوتی ہیں اور بعض گھمنڈ، غرور اور خود پسندی اور انانیت کا۔ ان اعتبارات سے ان کے درجہ اور ان کی نوعیت میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک ان کے اثر اور نتیجہ کا تعلق ہے یہ سب انسان کو علم حقیقی کی دولت سے محروم کر دینے کی خاصیت میں بالکل یکساں ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہر انسان جو ایک مرتبہ علم کی

دولت پا کر اس سے محروم ہو جانے کے لیے تیار نہ ہو وہ ان بیماریوں کی نوعیت اور ان کے علاج کے طریقوں سے اچھی طرح واقف رہے۔ اپنی صحت کی قدر کرنے والا ایک شخص جتنا اہتمام ان بیماریوں سے واقف رہنے کے لیے کرتا ہے، جو اس کی صحت کو برباد کر سکتی ہیں، اس سے کہیں زیادہ ضروری، علم حقیقی کے ایک قدردان کے لیے، ان آفتوں سے باخبر رہنا ہے جو اس کے علم کو غارت کر سکتی ہیں۔ ہر شخص اپنے خزانہ کی حفاظت کا اہتمام اس کی قدر و قیمت کے لحاظ سے کرتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی جسمانی صحت کی حفاظت سے قاصر رہ جائے تو اس سے جو نقصان اس کو پہنچے گا وہ بیشتر اسی دنیا کی زندگی تک محدود رہے گا۔ لیکن اگر ایک شخص علم حقیقی کی نعمت کی حفاظت سے قاصر رہ جائے تو یہ ایک ایسا نقصان ہوگا جس سے اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان بیماریوں کی اس اہمیت کے سبب سے ہم یہاں ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

غفلت اور بے پروائی

ان بیماریوں میں سب سے زیادہ عام بیماری غفلت اور بے پروائی کی بیماری ہے۔ انسان کا کچھ خاصہ ایسا ہے کہ جو چیز اس کے پاس موجود ہو اس کی قدر آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں میں کم ہو جایا کرتی ہے اور جس چیز کی قدر کم ہو جائے لازماً اس کے رکھ رکھاؤ میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ جب ایک چیز کے رکھ رکھاؤ میں فرق آیا تو پھر ناگزیر ہے کہ اس پر تغافل کا سایہ پڑنا شروع ہو جائے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس پر ایک دن ایسا آئے کہ وہ بالکل ہی عدم کی تاریکی میں چھپ جائے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے نسیان کو علم کی سب سے زیادہ عام آفت قرار دیا ہے۔

آپ ؐ کا ارشاد ہے:

آفة العلم النسیان. (سنن الدارمی: مقدمہ)

علم کے لیے بڑی آفت بھول جانا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق، جو علم حقیقی کا خزانہ ہے، آنحضرت ﷺ نے خاص طور پر ہدایت فرمائی ہے کہ لوگ اپنے قرآن کے علم کو برابر تازہ کرتے رہیں تا کہ وہ ضائع نہ

ہونے پائے۔ آپؐ کے الفاظ یہ ہیں:

واستذکروا القران. فانه اشد تفصیا من صدور الرجال من النعم.
(صحیح البخاری: کتاب فضائل القرآن باب ۲۳)
اور اپنے علم قرآن کو برابر تازہ کرتے رہو۔ جس طرح اونٹ غفلت کے سبب سے کھو جاتا ہے اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ قرآن سینوں سے نکل جایا کرتا ہے۔

دوسری روایت میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

انما مثل صاحب القران کمثل صاحب الابل المعقلة. ان عاهد علیها امسکها وان اطلقها ذهبت.
(صحیح البخاری: کتاب فضائل القرآن باب ۲۳)
اس شخص کی مثال جس کے پاس قرآن کا علم ہو اس شخص کی ہے جس کے پاس بندھنوں میں بندھے ہوئے اونٹ ہوں۔ اگر وہ ان کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے تو وہ محفوظ رہتے ہیں اور اگر وہ ان سے غافل ہو جاتا ہے تو پھر وہ کہیں کے کہیں چل دیتے ہیں۔

یعنی علم کے لیے صرف ایک مرتبہ حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو حاصل کر لینے کے بعد بار بار اس کی دیکھ بھال کرتے رہنا بھی ضروری ہے، ورنہ اس کی مثال ایسی ہوگی کہ ایک شخص صرف کثیر اور اہتمام و انتظام کی تمام زحمتیں جھیل کر کسی دور دراز ولایت سے ایک قیمتی پودا منگوائے لیکن منگوا چکنے کے بعد پھر اس کی خبر نہ لے کہ وہ کس حال میں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو پودا جس قدر قیمتی ہوتا ہے، وہ اسی قدر رکھ رکھاؤ اور اہتمام کا طالب ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز اس کو حاصل نہ ہو سکے تو پھر اس کا نشوونما پانا تو درکنار اس کا محفوظ رہنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہی حال حقیقی علم کا ہے۔ جہاں تک اس کے حاصل ہونے کا تعلق ہے، اس کا راستہ ہر طالب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ جس طرح آسمان سے بارش برستی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سب سے بڑی نعمت بھی برسائی ہے اور اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کے صالح بندوں نے اس نعمت کے تقسیم کرنے میں، تاریخ کے کسی دور میں بھی، کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور اس علم کو بقدر

استعداد پایا بھی بہتوں نے ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی دیکھ بھال اور اس کے رکھ رکھاؤ کا تعلق ہے' اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں بہت تھوڑے ہی پورے اترے ہیں۔ اور درحقیقت یہی تھوڑے سے پورے اترنے والے ہیں جو اس نعمت سے بہرہ یاب ہوئے ہیں، ورنہ بہتوں کے لیے، جیسا کہ بعض حدیثوں میں فرمایا گیا ہے' یہ علم مفید ہونے کے بجائے ان کے خلاف ایک حجت ہی ثابت ہوا ہے۔

یہی سبب ہے کہ نبی کریم ﷺ قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کے لیے خاص اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن مجید کی بعض آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبریل امین علیہ السلام آنحضرت ﷺ کو قرآن کی آیتیں سناتے تو آپؐ اس اندیشہ سے کہ کوئی چیز یاد کرنے سے رہ نہ جائے اس کو بار بار دہراتے اور اس کو اچھی طرح محفوظ کرنے کی کوشش فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس فکر سے فارغ کر دینے کے لیے قرآن مجید کو جمع کرنے اور اس کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری خود لے لی اور آپؐ کو ان الفاظ میں تسلی دی:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (القیامۃ ۔ ۷۵: ۱۶۔۱۹)
اس کو جلدی سیکھ لینے کے لیے اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو جلدی نہ چلاؤ۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔

یہ قرآن کو محفوظ رکھنے کا مقصد ہی ہے جس کی وجہ سے اس کو ایسے اسلوب میں ڈھالا گیا کہ اس کو یاد رکھنا آسان ہو اور پھر اس کی بار بار تلاوت کا حکم دیا گیا اور پنج وقتہ نمازوں میں اس کی تلاوت کو ضروری قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں رمضان کی راتوں میں خاص اہتمام کے ساتھ تمام مسلمانوں کے لیے یہ بڑے اجر و ثواب کا کام ٹھہرایا گیا کہ مساجد میں قرآن پڑھا جائے اور لوگ اس کو سنیں۔ خود آنحضرت ﷺ فرض اور نفل نمازوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ یہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ قرآن کا جتنا جتنا حصہ اترتا جاتا اور جس جس کو

پہنچتا جاتا وہ اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا۔ یہ اہتمام صرف قرآن کے الفاظ ہی کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں تھا بلکہ الفاظ سے زیادہ اس کے معانی و مطالب کے محفوظ کرنے کے لیے صحابہؓ میں سرگرمی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ صحابہؓ اپنے زمانے میں مختلف علمی مجالس قائم کرتے تھے، جن میں قرآن مجید کے معانی و مطالب اور اس کے اسرار و حقائق پر گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ ان حلقوں میں نبی کریم ﷺ بھی کبھی کبھی شرکت فرماتے تھے اور تحقیق قرآنی کی ان مجلسوں کو آپؐ ذکر و عبادت کی مجلسوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

قرآن اور علوم نبویؐ کو محفوظ کرنے کا یہی ذوق و شوق آنحضرت ﷺ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانوں میں بھی باقی رہا۔ خلفائے راشدینؓ خود اس دلچسپی کو بڑھانے میں حصہ لیتے رہے۔ خصوصیت کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خدمت میں جو حصہ لیا اس کے ذکر سے ان کی زندگی کا ہر ورق نورانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے علم کے لیے حفاظت کا یہ اہتمام پچھلی امتوں کے زمانوں میں نہ ہو سکا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا اور یہ امتیں اللہ تعالیٰ کی روشنی پانے کے بعد اس سے محروم ہو گئیں۔ چنانچہ یہود کا حال جو ہوا اس کی مثال قرآن مجید نے یہ دی ہے:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ (البقرۃ۔۲:۱۷)

ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے لوگوں کے لیے آگ جلائی۔ جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایسی تاریکی میں چھوڑ دیا جس میں ان کو کچھ بھائی نہیں دے رہا ہے۔

انہی یہود کے متعلق فرمایا ہے کہ:

وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ (المائدۃ۔۵:۱۳)

اور جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاددہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے۔ اور تم برابر

ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے۔

اسی طرح نصاریٰ کے متعلق قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے علم کا ایک حصہ اپنی ناقدری اور بے پروائی کے سبب سے فراموش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان اختلاف اور جھگڑے کی مستقل بنیادیں قائم ہو گئیں، جن کے رفع ہونے کی اب ان کے پاس کوئی صورت باقی ہی نہیں رہ گئی:

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ. (المائدۃ۔۵:۱۴)

اور جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی عہد لیا۔ تو جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاددہانی کی گئی وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے۔ تو ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی

دوسری چیز جو علم حقیقی سے محروم کرنے والی ہے وہ خواہشاتِ نفس کی پیروی ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح اتباع ھوا ہے۔ اتباع ھوا کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ضروریات کی تکمیل، اپنی خواہشات کے حصول، اپنی شہوات کی تسکین اور اپنے جذبات کی تسلی کے سوا اور کسی چیز سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ ان کے سوا اس کے سامنے زندگی کا کوئی اور اعلیٰ اور بلند تر مقصد نہ رہ جائے۔ وہ انہی چیزوں کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھ بیٹھے اور اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں اور اپنے تمام ذرائع و وسائل بس انہی کی خدمت اور انہی کی مقصد برآری میں لگا دے۔ ان کی لذتیں اور ان کے نقد منافع اس کو اس طرح مسحور کر لیں کہ اس کو یہ سوچنے کا بھی موقع ہی نہ مل سکے کہ ان سے بڑھ کر بھی کوئی چیز چاہنے کی ہو سکتی ہے اور یہ زندگی اس کے حاصل کرنے کا بھی ذریعہ بن سکتی ہے۔

اس اتباع ہوا کا ایک مرحلہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشات و شہوات کی تعمیل میں اس قدر آگے بڑھ جائے کہ زندگی کے اندر وہ ان کے سوا یا تو کسی اور اعلیٰ اصول اور کسی برتر قدر کا سرے سے

قائل ہی نہ رہ جائے یا قائل تو رہے لیکن اپنے ان نفسانی مطلوبات کے حصول میں ان کا حارج ہونا کسی طرح گوارا نہ کرے۔ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے جب اٹھے تو اس چیز سے بالکل آنکھیں بند کر کے اٹھے کہ حرام و حلال اور ظلم و انصاف کے کچھ معروف ضابطے بھی ہیں، جن کا اس کو احترام کرنا ہے۔ جب اس کے اوپر شہوت کا بھوت سوار ہو تو وہ صرف اس بات پر نگاہ رکھے کہ اس کی یہ شہوت کی آگ بجھتی کس طرح ہے۔ اس سے بالکل قطع نظر کرلے کہ اس کے لیے خدا اور رسول نے کچھ حدود بھی مقرر کیے ہیں، جن سے تجاوز کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ جب اس پر یہ جذبہ غالب آجائے تو وہ اس کے تقاضوں کی رو میں بہہ جانے کے لیے اپنے آپ کو اس کی موجوں کے حوالہ کردے۔ اس سے اسے کچھ بحث نہ رہے کہ یہ جذبہ برا ہے یا اچھا اور اس کے اندر اعتدال اور بے اعتدالی کی حدیں کیا ہیں؟ الغرض وہ ایک نرا حیوان بن جائے اور حیوانوں ہی کی طرح اپنی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کرلے۔ بس اگر کچھ فرق رہ جائے تو یہ کہ حیوانات کے لیے کچھ جبلی حدود ہوتے ہیں، جن کی پابندی پر وہ مجبور ہوتے ہیں، اس وجہ سے کسی راہ میں بھی قدرت کی مقرر کی ہوئی ایک متعین حد سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتے اور یہ ایک خودمختار مخلوق ہونے کی وجہ سے اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں جس قدر آگے بڑھنا چاہے، بڑھتا چلا جائے۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

> اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ط (الاعراف۔ ۷:۱۷۹)
> یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

اس اتباع ہوا کا دوسرا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ آدمی صرف حلال و حرام کے حدود توڑنے پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں اس قدر اندھا ہو جائے کہ ان کی خاطر تمام اقدار کو تلپٹ کر دینے کے درپے ہو جائے۔ اس کی کوشش یہ ہونے لگے کہ معروف، منکر بن جائے اور منکر، معروف کی جگہ حاصل کرلے۔ جو چیز اب تک نیکی سمجھی گئی ہے وہ بدی سمجھی جانے لگے اور جو بدی ہے وہ نیکی کی حیثیت اختیار کرلے۔ قوم کی روایات، قوم کی تہذیب اور قوم کے سارے معیارات یک قلم تبدیل ہو جائیں۔ دین و مذہب کے نام سے جو چیز

موجود ہے، اس کا اول تو خاتمہ ہو جائے لیکن اگر خاتمہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کی وہ چیزیں جو کسی پہلو سے نفس کی آزادیوں میں خلل انداز ہوتی ہیں، مٹادی جائیں۔ ان میں سے بعض کو ملائیت اور دقیانوسیت کہہ کر ختم کر ڈالا جائے، کچھ پر تحریف کی قینچی چلادی جائے اور کچھ پر تاویل باطل کی سیاہی پھیر دی جائے۔ صرف انہی چیزوں کو باقی رہنے دیا جائے جو نفس کی خواہشوں کے مطابق ہیں یا کم از کم ان سے متصادم نہیں ہیں۔

انسان کی یہ کوشش اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی میں اس قدر بے بس ہو جاتا ہے کہ وہ اس بات کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں رہ جاتا کہ کسی گوشہ سے اس کے کانوں میں ملامت کی کوئی آواز پڑے۔ اس خیال سے وہ یا تو ان ساری چیزوں کو مٹا دیتا ہے جو اس کے نفس کو کھٹکتی ہیں یا ان کو تاویل و تحریف کے پردوں میں چھپا دیتا ہے تاکہ ان کے سبب سے اس کی نفس پرستی پر اس کا ضمیر کوئی خلش نہ محسوس کرے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کتر بیونت اور اتنی کانٹ چھانٹ کے بعد مذہب کا کچھ حصہ ان کی زندگیوں کے کسی گوشہ میں اگر بچ رہتا ہے تو اس وجہ سے نہیں بچ رہتا ہے کہ وہ مذہب کا حصہ ہے یا خدا نے اپنی کتاب میں اس کی تعلیم دی ہے یا رسول نے اپنے قول اور فعل سے اس کو قائم کیا ہے بلکہ اس کے بچ رہنے کی واحد وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ چیز ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتی ہے یا کم از کم یہ کہ ان کے خلاف نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ قرآن اور حدیث کی کسی بات کو اس لیے ماننا کہ یہ 'ہماری خواہشوں کے مطابق ہے' یہ قرآن و حدیث اور اللہ اور رسول کا ماننا نہیں ہے بلکہ یہ محض اپنی خواہشوں کی پرستش ہے۔ خدا اور رسول کو ماننے کے لیے تو یہ لازمی ہے کہ ان کی ہر بات مانی جائے خواہ وہ ہماری خواہشوں کے مطابق ہو یا ان کے خلاف۔ بلکہ ایمان کا حقیقی تقاضا تو خواہشوں کے خلاف ماننے ہی سے پورا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

> لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعاً لما جئتُ بہ۔
> تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشیں میرے لائے ہوئے علم کے تابع نہ بن جائیں۔

انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح کی بنائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں طرح کے رجحانات ودیعت کر دیے ہیں۔ جہاں تک اس کی ضروریات وخواہشات کا تعلق ہے وہ تو اس کو پوری طاقت کے ساتھ نفع عاجل اور لذت عاجل کی طرف کھینچتی ہیں اور اس کو اجازت نہیں دیتیں کہ وہ ان کی تکمیل کی راہ میں کسی قسم کی اخلاقی قید وبند کو حائل ہونے دے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر کچھ روحانی تقاضے بھی ہیں جو اس کے ہر غلط اقدام پر اس کو ٹوکتے رہتے ہیں اور اس کی نفسانی خواہشوں کے علی الرغم اس کو نیکی، انصاف اور حق پرستی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف کھینچتے ہیں۔ انسان کی نفسانی اور روحانی کشمکش کا یہی وہ مرحلہ ہے جس میں انسان کی دست گیری اور رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے انسان کو علم حقیقی کی روشنی عطا فرمائی ہے اور اس علم حقیقی کو اَلْعِلْمُ کی اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے اور انسان کی سعادت و کامرانی اس بات میں رکھی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام مراحل میں اَھْوَاءٌ یعنی اپنی خواہشات، اپنے من گھڑت نظریات وافکار اور اپنے جی سے بنائے ہوئے قوانین وضوابط کی — جو العلم کے خلاف ہوں — پیروی کرتا ہے تو وہ اس قانون کی مخالفت کرتا ہے جو فاطر السموات والارض نے انسان کی فلاح ونجات کے لیے بنایا ہے اور اس صورت میں اس کو خدا کے قانون کی مخالفت کے برے انجام سے کوئی طاقت بھی نہیں بچا سکتی۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید کی یہ آیت واضح کرتی ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَ ھُمْ بَعْدَ مَا جَآءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ ○ (الرعد۔۱۳:۳۷)

اور اگر تم اس علم صحیح کے آجانے کے بعد ان کی بدعتوں کی پیروی کرو گے تو نہ خدا کے مقابل میں تمہارا کوئی مددگار ہوگا نہ بچانے والا۔

العلم اور ھواء کی طبیعت میں ہر اعتبار سے بالکل تضاد ہے۔ ایک کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے اور دوسرے کا منبع انسان کا اپنا نفس۔ ایک ہمیشہ انسان کو ابدی زندگی کی بلندیوں کی طرف بڑھنے کے لیے اشارہ کرتا ہے اور دوسری چیز اس کو اسی زندگی کی فانی لذتوں کی کیچڑ میں لت پت

رکھنا چاہتی ہے۔ ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان مادی خواہشوں اور لذتوں کی تنگ نائے سے نکل کر روحانی کمالات کے حاصل کرنے کے لیے پرواز کرے لیکن دوسرے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انسان اسی زمین کا کیڑا بنا رہے۔ اس کوشش اور خواہش میں کچھ عرصہ تک کشمکش رہتی ہے لیکن بالآخر یہ کشمکش اس وقت ختم ہوتی ہے جب انسان ان میں سے کسی ایک کو مستقلاً اپنے لیے انتخاب کر لیتا ہے۔ اگر وہ برابر العلم کے مقابل میں ھواء ہی کو ترجیح دیتا ہے، بلندیوں پر چڑھنے کے بجائے پستیوں ہی میں گرے ہوئے رہنے کو پسند کرتا ہے اور خدا کے بجائے اپنے نفس اور اس کی خواہشوں ہی کی رہنمائی پر اعتماد کرتا ہے اور اس پر دناءت اور رذالت اس قدر غالب آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شر سے خیر کی طرف اور بدی سے نیکی کی طرف موڑنے کے لیے عسر اور یسر اور رنج وراحت کے جو امتحانات رکھے ہیں ان سے بھی وہ متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ دونوں ہی صورتوں میں کتے کی طرح زبان نکالے ہی رہتا ہے تو ایسے لوگوں سے العلم کی نعمت سلب ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خواہشوں اور لذتوں کے حوالے کر دیتا ہے کہ وہ ان کے پیچھے جن جن وادیوں میں بھٹکنا چاہتے ہیں اچھی طرح بھٹک لیں۔ قرآن مجید نے اسی صورت حال کی تصویر ایک تمثیل کے ذریعہ سے پیش کی ہے اور دیکھیے کس قدر جامع اور خوب صورت تمثیل ہے:

وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْھَا فَاَتْبَعَہُ الشَّیْطٰنُ فَکَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰہُ بِھَا وَلٰکِنَّہٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ ۚ فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْھَثْ اَوْ تَتْرُکْہُ یَلْھَثْ.

(الاعراف۔۷:۱۷۵۔۱۷۶)

اور ان کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا' بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہوگیا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی تمثیل کتے کی ہے: اگر تم اس کو دھتکارو' جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو' جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ نے یہود کی مثال بیان کی ہے جن کو العلم کی روشنی عطا ہوئی تھی لیکن انہوں نے اس روشنی کی قدر نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان ان کے پیچھے لگ گیا اور اس نے ان کو بالکل ہی ایمان سے محروم کر کے چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ ان آیتوں کی کمند کا سہارا لے کر روحانی بلندیوں کے مقامات طے کرنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کریں۔ لیکن وہ برابر اپنی ہوائے نفس ہی سے چمٹے رہے اور اس قدر پست ہمت اور ذلیل ہو گئے کہ نہ خدا کی تنبیہات نے ان پر کچھ اثر ڈالا اور نہ اس کی عنایات نے۔ بالآخر جب وہ اس قدر ذلیل اور پست ہمت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے العلم کی روشنی ان سے چھین لی اور ان کو ان کے نفس کے حوالہ کر دیا۔

عدم احتساب

علم حقیقی کو برباد کرنے والی آفتوں میں سے ایک بہت بڑی آفت عدم احتساب بھی ہے۔ عدم احتساب کے معنی یہ ہیں کہ آدمی نیکی اور بدی اور حق اور باطل کے معاملہ میں بالکل بے تعلق ہو کے رہ جائے' اسے اس سے کچھ بحث ہی نہ رہے کہ دنیا نیکی کی طرف جا رہی ہے یا بدی کی طرف' خیر کی طرف بڑھ رہی ہے یا شر کی طرف، معاشرہ بگڑ رہا ہے یا بن رہا ہے۔ وہ یا تو یہ نظریہ قائم کر لے کہ یہ پرائے جھگڑے ہیں اور پرائے جھگڑے نمٹانا اس کی ذمہ داری نہیں ہے یا فضا کی اور حالات کی ناسازگاری اس کو اس قدر پست ہمت اور بزدل بنا دے کہ صریح سے صریح انحراف کو دیکھ کر بھی اس کی زبان سے کلمہ حق نہ نکلے۔ اگر کسی قوم کے اندر حاملین علم کی اکثریت یا ان کی پوری جماعت کی جماعت یہی روش اختیار کر لے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قوم پر باطل کی تاریکی چھا جاتی ہے اور وہ علم حقیقی کے نور سے بالکل ہی محروم ہو جاتی ہے۔

کسی معاشرے کے اندر جس وقت کسی خرابی کا آغاز ہوتا ہے، اس وقت یہ خرابی زیادہ طاقتور نہیں ہوتی۔ اگر اسی مرحلہ میں معاشرے کے ذمہ دار لوگ اس کے احتساب کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور برائی کے ذمہ داروں کو مناسب تنبیہ ہو جائے تو اس کے مزید پھیلنے کے امکانات کا سدِ باب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس سے تغافل برتا جائے تو آہستہ آہستہ وہی معمولی سی برائی جڑ پکڑ لیتی ہے اور پھر اس کے برگ و بار اس قدر پھیل جاتے ہیں کہ ان پر قابو پانا ناممکن ہو

جاتا ہے:

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اس احتساب کے لیے قرآن مجید کی معروف اصطلاح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے غفلت کی جائے تو اس کے نتائج کا پہلا مرحلہ تو یہ سامنے آتا ہے کہ معروف، منکر اور منکر، معروف کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اس کا دوسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ طبیعتیں مسخ ہو کر بدی کے سانچے میں اس طرح ڈھل جاتی ہیں کہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذمہ دار تھے، وہ علانیہ بدی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے لگ جاتے ہیں۔ اس کا تیسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ علم حقیقی کی روشنی بالکل ہی غائب ہو جاتی ہے اور تمام معاشرے پر ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے علم رکھنے والوں کی عقل بھی چکر کھا جاتی ہے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس فتنہ سے بھاگ کے کہاں جائیں اور کیا کریں؟ ان تمام مراحل کی تصویر خود نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر کھینچ دی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ملاحظہ ہو:

کیف انتم اذا طغی نساؤکم وفسق شبابکم و ترکتم جهادکم؟ قالوا: و ان ذالک لکائن؟ یا رسول اللّٰه! قال: نعم! والذی نفسی بیده! و اشد منه سیکون. قالوا: و ما اشد منه؟ یا رسول اللّٰه! قال: کیف انتم اذا لم تامروا بالمعروف و تنهوا عن المنکر؟ قالوا: او کائن ذالک؟ یا رسول اللّٰه! قال: نعم! والذی نفسی بیده! و اشد منه سیکون. قالوا: و ما اشد منه؟ قال: کیف انتم اذا رأیتم المعروف منکرا و المنکر معروفا؟ قالوا: او کائن ذالک؟ یا رسول اللّٰه! قال: نعم. والذی نفسی بیده! واشد منه سیکون. قالوا: و ما اشد منه؟ قال: کیف انتم اذا امرتم بالمنکر و نهیتم عن المعروف؟ قالوا: او کائن ذالک؟ یا رسول الله! قال: نعم. والّذی نفسی بیده! واشد منه سیکون. یقول اللّٰه تعالی: بی حلفت! لا یتحن لهم فتنة

يصير لحليم فيها حيران!
اس وقت تمہارا کیا حال ہو جب تمہاری عورتیں بے قابو ہو جائیں گی' تمہارے نوجوان بدچلن ہو جائیں گے اور تم جہاد چھوڑ بیٹھو گے؟ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ آنے والا ہے۔ لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! اس سے زیادہ سخت مرحلہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم نیکی کا حکم دو گے نہ برائی سے روکو گے؟ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اس سے بھی سخت مرحلہ سامنے آنے والا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا: (یا رسول اللہ!) اس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم دیکھو گے کہ معروف منکر بن گیا ہے اور منکر معروف بن گیا ہے؟ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ آنے والا ہے۔ لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! اس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم برائی کا حکم دو گے اور بھلائی سے روکو گے؟ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اس سے بھی زیادہ سخت وقت آنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ اس وقت میں ان کے لیے ایسا فتنہ برپا کروں گا کہ بڑے بڑے دانشور بھی چکر میں پڑ جائیں گے!

اس حدیث سے وہ پوری تدریج سامنے آجاتی ہے جس تدریج سے احتساب کے فرض سے غفلت نمایاں ہوتے ہی فتنہ کی تاریکی بڑھنی شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس طرح چھا جاتی ہے کہ بڑے بڑوں کو بھی نیکی اور سچائی کی راہ بھائی نہیں دیتی اور آنکھیں رکھنے والے بھی اندھے بن جاتے ہیں۔
مذکورہ بالا مضمون کی تائید بعض دوسری حدیثوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً:

ان النبی ﷺ قال: والذی نفسی بیدہ! لتامرن بالمعروف و تنہون عن المنکر. اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عذاباً من عندہ. ثم لتدعونہ فلا

یستجاب لکم.
نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یا تو تم نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے۔ یا یہ ہوگا کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے ایک عذاب بھیجے گا۔ پھر تم اس کو پکارو گے لیکن تمہاری سنی نہیں جائے گی۔

ایک دوسری حدیث میں یہی حقیقت ایک دوسرے اسلوب سے بیان ہوئی ہے:

ما من قوم یعمل فیہ بالمعاصی ثم یقدرون علی ان یغیروا ثم لا یغیرون الا ان یوشک ان یعمہم اللہ بعقاب.
جس قوم کے اندر برائی پھیل رہی ہو اور اس کے اندر ایسے لوگ ہوں جو اس کی اصلاح کر سکتے ہوں لیکن وہ اصلاح نہ کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقت قریب آ لگا ہے جب اللہ تعالیٰ ان سب کو کسی عذاب میں پکڑ لے۔

ایک حدیث جو ٹھیک ٹھیک قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر ہے اس حقیقت کو یوں واضح کر رہی ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

ان اللہ عزوجل لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یرو المنکر بین ظہرانیہم و ہم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذالک عذب اللہ الخاصۃ و العامۃ. (مسند احمد: ج ۴ ص ۱۹۲)
خدائے عزوجل تھوڑے سے برے لوگوں کے برے اعمال کی پاداش میں دوسروں کو اس وقت تک سزا نہیں دیتا جب تک یہ بات نہ پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے درمیان برائی کو پھیلتے ہوئے دیکھیں اور وہ اس کے خلاف آواز اٹھانے پر قادر بھی ہوں لیکن وہ آواز نہ اٹھائیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے بھلوں اور بروں سب کو سزا دے دیتا ہے۔

اس باب میں سب سے زیادہ اہم حدیث ذیل کی حدیث ہے جو نہایت واضح طور پر کھول دیتی ہے کہ اگر کسی قوم کے اہل علم احتساب کے فرض سے غافل ہو جاتے ہیں یا محض منافقانہ قسم کے احتساب پر قانع ہو جاتے ہیں تو کس طرح اللہ تعالیٰ ان کو علم و ایمان کی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

لما وقعت بنو اسرائیل فی المعاصی نہتھم علماء ھم. فلم تنتھوا فجالسوھم فی مجالسھم و اکلوھم و شاربوھم فضرب اللہ قلوب بعضھم ببعض و لعنھم علی لسان داود و عیسی بن مریم.
(مسند احمد: ج ۱ص ۳۹۱)

جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہونے لگے تو ان کے علماء نے شروع شروع میں ان کو روکا۔ لیکن جب وہ باز نہ آئے تو بالآخر انہوں نے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک گروہ کے دلوں کی سیاہی دوسروں کے دلوں پر تھوپ دی۔ اور جناب داؤد اور جناب عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کر دی۔

بدعت

علم حقیقی کو برباد کرنے والی چیزوں میں سے ایک چیز بدعت بھی ہے۔ بدعت کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز اللہ کے دین میں نہیں ہے اور نہ اس کے مزاج سے کوئی مناسبت ہی رکھتی ہے اس کو دین میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ شریعت میں اصل و اساس کی حیثیت صرف اس چیز کو حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے یا پیغمبر ﷺ سے صحیح طریق پر ثابت ہے۔ اس کے بعد اگر کسی چیز کو شریعت کے اندر سمجھا جا سکتا ہے تو اس چیز کو سمجھا جا سکتا ہے جو مذکورہ اساسات سے مستنبط ہوئی یا کم از کم ان کے اشارات سے سمجھی جاتی ہو۔ ان کے علاوہ کوئی ایسی چیز دین میں لا داخل کرنا جو نہ دین کے کسی اصول سے نکلتی ہو اور نہ اس کے مجموعی نظام ہی سے کوئی جوڑ رکھتی ہو بدعت ہے۔ بالخصوص جس چیز کے بارہ میں نبی ﷺ کی کوئی سنت موجود ہو اس میں محض اپنے ذوق اور اپنی ایجاد سے کوئی اضافہ کرنا یا اس سنت کا بدل پیدا کرنا بدعت کی نہایت ہی مکروہ قسم ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس طرح کی تمام دینی ایجادات کے بارہ میں یہ جامع حکم دیا ہے:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد. (صحیح البخاری: کتاب الصلح باب ۵)

جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز داخل کی جو اس سے جوڑ نہیں رکھتی تو ایسی شے مردود ہے!

بعض احادیث میں آپؐ نے بدعت کی تردید فرماتے ہوئے علم دین کے بنیادی ماخذوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان سے ہٹ کر کوئی چیز دین میں پیدا کرنے کی کوشش کرنا بدعت ہے۔ اگر کوئی چیز ان کے اشارات سے نکل رہی ہو یا ان کے حدود کے اندر داخل ہو یا وہ زندگی کے اس دائرہ سے تعلق رکھنے والی ہو، جس کو اسلام نے ہماری اپنی صواب دید پر چھوڑا ہے، تو وہ چیز بدعت نہیں کہلائے گی۔ آپؐ نے فرمایا کہ:

فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمد ﷺ. و شر الامور محدثاتھا. و کل بدعة ضلالة. (صحیح مسلم: کتاب الجمعہ باب ۱۳)

بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ اور بدترین چیزیں وہ ہیں جو ان کے اندر ان سے بے جوڑ نئی پیدا کی جائیں۔ اور ہر ایسی بدعت گمراہی ہے۔

اس بدعت کی سب سے بری قسم یہ ہے کہ کسی جاہلی فکر و فلسفہ، کسی غیر اسلامی طور طریقہ اور کسی کافرانہ رنگ ڈھنگ کو اسلام کے عقائد و ایمانیات یا اس کے نظام معیشت و معاشرت یا نظام تہذیب و تمدن میں گھسانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

ابغض الناس الی اللہ ثلاثة: ملحد فی الحرم و مبتغ فی الاسلام سنة الجاھلیة و مطلب دم امرئ بغیر حق لیھریق دمه.
(صحیح البخاری: کتاب الدیات باب ۸)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین شخص سب سے زیادہ قابل نفرت ہیں: ایک وہ جو حرم کے اندر کسی بے دینی کا ارتکاب کرے، دوسرا وہ جو اسلام کے اندر جاہلیت کے کسی طریقہ کو گھسانے کی کوشش کرے اور تیسرا وہ جو ناحق کسی کی جان کے درپے ہو تاکہ اس کا خون بہائے۔

آنحضرت ﷺ نے اس حقیقت کو بھی واضح فرما دیا ہے کہ ہر بدعت جو ایجاد کی جاتی ہے وہ کسی نہ کسی سنت کو ضرور ڈھاتی ہے اور جب کوئی قوم سنت کی جگہ بدعت کو پسند کرنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سنت کی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلھا من السنة. (مسند احمد: ج ۴ص ۱۰۵)

جس قوم نے بھی کوئی بدعت ایجاد کی تو اسی کے مانند اس کے اندر سے سنت اٹھالی گئی۔

تحریف

بدعت کے بالمقابل علم حقیقی کو تاراج کرنے والی دوسری چیز تحریف ہے۔ بدعت میں غالب پہلو یہ ہے کہ جو چیز دین کی نہیں ہے اس کو دین میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے اور تحریف میں غالب پہلو یہ ہے کہ جو چیز دین کی ہے اپنے اغراض وخواہشات کے خلاف ہونے کے سبب سے اس کو دین سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ علم حقیقی پر یہ آفت متعدد شکلوں میں نازل ہوتی ہے۔

اس کی ایک عام اور معروف شکل تو یہ رہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے کلام کی ایسی من مانی تاویلیں کی جائیں جو اس کلام سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ رکھتی ہوں۔ الفاظ، قواعد زبان، سیاق وسباق، نظائر وشواہد اور خود متکلم کے دوسرے اقوال وارشادات چیخ چیخ کر اس تاویل سے اپنی بیزاری کا اعلان کر رہے ہوں لیکن محض اپنی خواہشات نفس کی اتباع میں اس تاویل کو کلام الٰہی پر یا کلامِ رسول پر چپکانے کی کوشش کی جائے۔

اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ تاویل وتفسیر کے تکلف میں پڑنے کے بجائے سرے سے اس چیز ہی کو بدل ڈالا جائے جو امر حق کی طرف رہنمائی کے لیے نشانِ راہ کا کام دے رہی ہو۔ نفی کو اثبات، شک کو یقین، اور دن کو رات بنا کر اصل حقیقت کی اس طرح قلب ماہیت کر دی جائے کہ اس کو پہچاننا محال یا تقریباً محال ہو جائے۔

اس کی تیسری شکل یہ ہے کہ لفظ یا فقرے کو قراءت اور طرزِ ادا کے تصرفات سے اس طرح بدل دیا جائے کہ وہ جس حقیقت کی طرف رہنمائی کے لیے وضع ہوا تھا اس سے ہٹ کر ایک بالکل ہی مختلف سمت میں مڑ جائے۔

تحریف کی مذکورہ بالا تینوں شکلوں کی طرف قرآن مجید نے یہود کے حالات بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

> يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ (المائدۃ۔۵:۱۳)

وہ کلام کو اس کے موقع ومحل سے ہٹاتے ہیں اور جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی

گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے۔ اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے۔

دوسری جگہ ہے:

> مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّاۢ بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ط (النساء۔۴:۴۶)

یہود میں سے ایک گروہ زبان کو توڑ مروڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے الفاظ کو ان کے موقع ومحل سے ہٹا دیتا ہے اور سمعنا و عصینا، اسمع غیر مسمع اور راعنا کہتا ہے۔

یہود ونصاریٰ کے اندر تحریف کی یہ تینوں قسمیں پائی جاتی تھیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو علم حقیقی کی روشنی سے بالکل محروم کر دیا۔ مسلمانوں کے اندر جو گمراہ فرقے اٹھے وہ تحریف کی پہلی اور دوسری قسم پیدا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب وسنت کی لفظی تحریف میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر خاص فضل ہے۔

کتمانِ حق

اسی سلسلہ کی ایک اہم چیز کتمانِ حق بھی ہے۔ کتمانِ حق کا مفہوم یہ ہے کہ ایک امر کو جانتے ہوئے اور اس کے اظہار کی ضرورت موجود ہوتے ہوئے کسی طمع یا خوف کے سبب سے اس کے اظہار سے گریز کیا جائے۔

حق کی شہادت دینا اس امت کا حقیقی فرضِ منصبی ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے دین اور اس کے اتارے ہوئے علم کو صحابہؓ کو پہنچایا اسی طرح اس امت کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائیں:

> وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (البقرۃ۔۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور

رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

اسی فریضہ کی ادائیگی کا مطالبہ نبی کریم ﷺ نے امت سے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

بلّغوا عنّی ولو آیۃ.   (صحیح البخاری: کتاب الانبیاء، باب ۵۱)
تم میری طرف سے لوگوں کو علم حق پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہی کی۔

اسی حقیقت کی طرف حضور ﷺ نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

نضّر اللہ امرأ سمع منا حدیثاً فحفظہ حتّٰی یبلغہ.
(سنن الترمذی: کتاب العلم باب ۷)
اللہ تعالیٰ اس بندے کے چہرے کو تر وتازہ رکھے جس نے ہماری بات سنی، پھر اس کو یاد کیا اور محفوظ رکھا تا کہ اس کو لوگوں تک پہنچائے۔

اور جو لوگ علم رکھتے ہوئے اس کو چھپاتے ہیں ان کو حضور ﷺ نے یہ وعید سنائی ہے:

من سُئل عن علم علمہ ثم کتمہ الجم یوم القیامۃ بلجام من نار.
(سنن الترمذی: کتاب العلم باب ۳)
جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی، جس کو وہ جانتا ہے، لیکن اس نے چھپائی تو اس کو قیامت کے دن آگ کی لگام لگائی جائے گی۔

اس فرض سے عموماً دو چیزیں مانع ہوتی ہیں: ایک طمع، دوسری خوف۔
آدمی ان لوگوں کے سامنے اظہار حق سے لازماً جھجکتا ہے جن سے اس نے کوئی طمع وابستہ کر رکھی ہو۔ ایسوں کے سامنے دین کی وہ باتیں کہی جاتی ہیں جو ان کو پسند ہوں یا کم از کم ان کو ان سے اختلاف نہ ہو۔ لیکن وہ باتیں کہنا جو ان کی خواہشوں کے خلاف ہوں اور جن سے ان کی بداعمالیاں بے نقاب ہوتی ہوں، کم از کم اس شخص کے لیے ناممکن ہے جو ان سے اپنی کوئی دنیوی غرض رکھتا ہو۔ جناب کعب احبارؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں اسی حقیقت کو یوں آشکارا کیا ہے:

ان عمر بن الخطاب قال لکعب: من ارباب العلم؟ قال: الذین یعملون بما یعلمون. قال: فما اخرج العلم من قلوب العلماء؟ قال: الطمع.
(سنن الدارمی)
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب کعبؓ سے پوچھا کہ اہل علم کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔ انہوں نے پھر پوچھا کہ علم کو علماء کے سینوں سے نکالا کس چیز نے؟ انہوں نے جواب دیا: لالچ نے۔

یہی صاحب طمع اور خوشامدی گروہ ہے جس نے اپنے اغراض کے لیے ارباب اقتدار کی ہر بے راہ روی اور گمراہی کو دین ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس طرح وہ خود بھی ذلیل ہوا اور اس نے دین کو بھی ذلیل کیا۔ انہی لوگوں کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

قال: لو ان اهل العلم صانوا العلم و وضعوه عند اهله لسادوا به اهل زمانهم. ولكنهم بذلوه لاهل الدنيا لينالوا به من دنياهم. فهانوا عليهم.
(سنن ابن ماجہ: المقدمۃ باب ۲۳)
فرمایا کہ اگر اہل علم اپنے علم کی قدر کرتے اور اس کو اس کے حقداروں کے سامنے پیش کرتے تو اس کے ذریعے سے وہ اپنے زمانے کے لوگوں پر سرداری کرتے۔ لیکن انہوں نے دنیاداروں سے صلہ حاصل کرنے کے لیے اس علم کو ان کی مقصد برآریوں کے لیے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نگاہوں میں ذلیل ہو کے رہ گئے۔

اسی قسم کے اقتدار پرست اور دین فروش گروہ کا ذکر حضور ﷺ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

قال رسول اللہ ﷺ: ان اناساً من امتی سیتفقھون فی الدین و یقرء ون القران و یقولون: ناتی الامراء فنصیب من دنیاھم و نعتزلھم بدیننا؟ و لا یکون ذالک. کما لا یجتنی من القتاد الا الشوک کذالک لا یجتنی من قربھم الّا.   (سنن ابن ماجہ: المقدمہ باب ۲۳)
رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو فقہ اور تفسیر کا علم حاصل کریں گے، پھر وہ کہیں گے کہ اس میں کیا برائی ہے کہ ہم ارباب اقتدار سے مل کے ان

کی دنیا سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے دین کو ان سے بچائے رکھیں؟ حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے۔
جس طرح ببول کے درخت سے کانٹے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اسی طرح ارباب اقتدار سے (راوی کا خیال ہے) گند کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسی قسم کے ارباب اقتدار کی عبادت کرنے والے دین فروشوں کے متعلق حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ اللہ کے سب سے زیادہ مبغوض ہیں اور جب اس قسم کے لوگ پیدا ہونے لگیں گے تو دین کی ساری حقیقت مٹ جائے گی۔ صرف کچھ رسوم اور الفاظ باقی رہ جائیں گے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

ان من ابغض القراء الی اللہ تعالی الذین یزودون الامراء. یوشک ان یاتی علی الناس زمان لا یبقی من القران الا رسمه. (سنن البیہقی)
خدا کے نزدیک سب سے برے وہ مدعیان علم قرآن ہیں جو ارباب اقتدار کے تقرب کے طلب گار ہیں۔ قریب ہے کہ وہ زمانہ آئے گا کہ اسلام میں سے صرف اس کا نام باقی رہ جائے اور قرآن میں سے صرف اس کے الفاظ۔

دوسری چیز جو اظہار کلمۂ حق سے مانع ہوتی ہے وہ خوف ہے۔ یہ خوف مختلف چیزوں کا ہوتا ہے۔ کبھی اس امارت و سیادت کے چھن جانے کا ہوتا ہے جو آدمی کو حاصل ہوتی ہے، کبھی عوام کی برہمی اور خفگی کا اندیشہ ہوتا ہے اور کبھی ارباب اقتدار کے غصہ و غضب اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر کسی آزمائش کے پیش آ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ اس خوف کو قرآن نے متعدد مقامات پر بڑی وضاحت کے ساتھ منافقین کی صفات میں سے گنایا ہے اور اچھے مسلمانوں کی تعریف اس کے مقابل میں یہ بیان کی ہے:

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۚ (المائدۃ ۵:۵۴)
پس عنقریب اللہ ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ وہ مسلمان کے لیے نرم مزاج اور کافروں کے مقابل میں سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔

اسی حقیقت کو حضور نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

الا! لا یمنعن رجلاً منکم هیبة الناس ان یقول بحق اذا علمه.
(سنن الترمذی: کتاب الفتن باب ۲۶)
یاد رکھو جب تم ایک حق جانتے ہو تو لوگوں کا خوف اور رعب تمہیں اس کے اظہار سے مانع نہ ہو۔

اسی چیز کو اس مشہور حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے:

افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر.
(سنن ابی داؤد: کتاب الملاحم باب ۱۷)
سب سے مبارک جہاد کسی حق سے منحرف صاحب اقتدار کے سامنے انصاف کی بات کہہ گزرنا ہے۔

اگر قوم کے اندر اظہار حق کا یہ جوہر باقی نہ رہے اور مداہنت اور کتمان حق کی بیماری پھیل جائے تو پھر اس کی سزا اس قوم کو یہ ملتی ہے کہ اس کے اندر سے علم حق غائب ہو جاتا ہے۔ پچھلی امتوں میں سے یہود و نصاریٰ اس کی نہایت عبرت انگیز مثال موجود ہیں۔

اشتغال بالادنیٰ

علم حقیقی کی نعمت سے محروم کرنے والی چیزوں میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ دوسرے حقیر علوم کو اس علم پر ترجیح دی جائے اور آہستہ آہستہ یہ بدمذاقی اس قدر بڑھ جائے کہ پھر طبیعت کے اندر اعلیٰ اور حقیقی علم کے لیے سرے سے کوئی رغبت ہی باقی نہ رہ جائے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جن چیزوں کے پڑھنے پڑھانے سے دنیوی منفعتیں اور عزتیں حاصل ہو سکتی ہیں یا جن چیزوں کا علم وقت کی سوسائٹی میں شہرت اور حصول مقاصد کا ذریعہ بن سکتا ہے یا جن چیزوں کا مطالعہ لذت اور بے فکری کے ساتھ اوقات گزاری کا سامان فراہم کر سکتا ہے، طبیعتیں انہی کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ اور یہ میلان اس قدر غالب اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جو یا تو نرے قدامت پرست ہوں

یا زمانہ کے رجحانات عام بلکہ اس کی وبائے عام سے لڑ کر جینے کا دم داعیہ رکھتے ہوں اور کوئی بھی اس بات کی ہمت نہیں کر سکتا کہ اپنا اور اپنی اولاد کا وقت ان چیزوں کے سیکھنے سکھانے پر ضائع کرے جو حقیقت کے نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی قدر و قیمت کی حامل ہوں لیکن وقت کے بازار میں ان کی کوئی مانگ نہ ہو۔

پچھلی ملتوں میں یہودیوں کے متعلق صاف قرآن میں بیان ہوا ہے کہ جب ان کے اندر کلدانیوں کے علوم، سحر و ساحری اور صوفیانہ قسم کے علوم' مثلاً علم خواص کلمات اور عملیات حب و بغض اور تسخیر جنات و شیاطین کا زور ہوا تو ان میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب پیٹھ پیچھے پھینک دی، اس کے سیکھنے سکھانے کے لیے ان کے اندر سرے سے کوئی میلان باقی ہی نہیں رہ گیا۔ چنانچہ قرآن نے ان کا حال یہ بیان کیا ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ (البقرۃ۔۲:۱۰۲)

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول ان پیشین گوئیوں کے مطابق آیا جو ان کے پاس موجود ہیں تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینکا گویا اس سے آشنا ہی نہیں اور ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھتے پڑھاتے تھے۔

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ (البقرۃ۔۲:۱۰۲)

پس یہ لوگ ان سے وہ علم سیکھتے جس سے میاں اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں۔ حالانکہ یہ اس کے ذریعہ سے خدا کی مشیت کے بغیر کسی کو نقصان پہنچانے والے نہیں بن سکتے تھے۔ اور یہ وہ چیز سیکھتے تھے جو ان کو نقصان پہنچائے نفع نہ پہنچائے۔

یہی صورت مسلمانوں کے اندر اس وقت پیش آئی جب یونانی علوم کا فتنہ پھیلا۔ عباسیوں کے زمانہ میں جب منطق و فلسفہ اور دوسرے یونانی علوم کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور مسلمانوں نے ان کا پڑھنا پڑھانا شروع کیا تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ حال ہو گیا کہ بہتر سے بہتر دینی حلقوں میں بھی قرآن اور حدیث کا علم محض برائے تبرک رہ گیا۔ یہ چیزیں وقت کی سوسائٹی کے دل و دماغ پر اس قدر چھا گئیں کہ وہ شخص پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا تھا جو ان چیزوں کے اندر کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔ اول تو لوگوں میں دین کو پیش کرنے کا ولولہ ہی سرد پڑ گیا لیکن اگر کچھ باقی رہا بھی تو اس کی جرأت بہت کم لوگ کر سکتے تھے کہ دین کو براہ راست کتاب و سنت کے واسطہ سے پیش کریں۔ بلکہ وہ مجبور ہوئے کہ انہی بولیوں اور انہی اصطلاحات میں بات کریں جو منطق و فلسفہ کے رعب و اثر نے زبانوں پر چڑھا دی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے پیش کرنے کا اصلی ذریعہ علم کلام بن گیا۔ جس کو مذہب کی بگڑی ہوئی شکل کہنا تو اس کی عزت افزائی ہوگی البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلسفہ اور منطق اور یونانی علم مناظرہ کی ایک مسخ شدہ شکل ہے۔

اسی طرح اربابِ تصوف نے اشراقیت اور ویدانت سے جو تاثر قبول کیا تو اس راہ سے بہت سے فتنے ایسے گھس آئے جو علم حقیقی کی رہنمائی سے محروم کرنے والے ثابت ہوئے اور بعد کے زمانوں میں تو ان لوگوں کا بیشتر اعتماد صرف گنڈوں، تعویذوں اور تسخیر و تاثیر کے عملیات پر رہ گیا۔ جس نے ان چیزوں میں کچھ دخل حاصل کر لیا اس کا کاروبار چل گیا اور جو اس میں پیچھے رہے وہ بالکل ہی ناکام ثابت ہوئے۔ بہت ہی تھوڑے لوگ ایسے نکلے جو اس روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کی جرأت کر سکے۔

اب اس دورِ آخر میں اس فتنہ کا جو حال ہے اس کا اندازہ ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کر سکتا ہے کہ ہر علم، علم ہے، ہر چیز کے پڑھنے پڑھانے والوں سے مدرسے اور کالج بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ گندے سے گندے رسالے اور ناپاک سے ناپاک افسانے بھی لاکھوں کی تعداد میں اس ملک کے اندر چھپتے اور بکتے ہیں اور لوگ ان کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کے پڑھنے پڑھانے والے مفقود ہیں تو یہ وہ علم ہے جس کو اللہ اور رسول کا علم کہا جاتا ہے—

يَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا.

باب ۸

حجاباتِ علم اور آفاتِ علم کا علاج

اشتغال بالادنیٰ کے اسباب اور اس کا علاج

پچھلے دو ابواب میں ہم نے ان بیماریوں کی نشان دہی کی ہے جو علم و معرفت کے لیے مہلک ہیں۔ یہ بیماریاں تو بہت سی ہو سکتی ہیں لیکن ہم نے صرف دس ایسی بیماریوں کا پتا دیا ہے جو جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن میں سے ایک ایک کے اندر سے صد ہا روحانی و اخلاقی بیماریوں کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ ان میں سے چار بیماریاں تو، جیسا کہ ہم نے بتایا ہے، ایسی ہیں جو اگر کسی شخص میں پائی جائیں تو اس کے اندر حق طلبی اور حق شناسی کا داعیہ ہی سرے سے مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے حالات پر ایسا قانع، اپنے علم پر ایسا مطمئن اور اپنے ماحول میں ایسا مست یا غافل ہوتا ہے کہ نہ تو خود اس کے اندر سے کسی قسم کی طلب یا پیاس ابھرتی ہے اور نہ کسی کے توجہ دلانے ہی پر اس کے اندر کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ بعض حالات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر اس کا کوئی ہمدرد و خیر خواہ اس کی بے حسی یا بے راہ روی پر اس کو ٹوک دے تو وہ اس کی اس ہمدردی کی قدر کرنے کے بجائے الٹا اس کے سر ہو جاتا ہے کہ اس نے اس کو کیوں ٹوکا؟ وہ اپنے آپ کو مریض سمجھنے میں اپنی ہتک محسوس کرتا ہے۔ اس کو اس تصور سے بھی غصہ آتا ہے کہ کوئی شخص خود اس کے اندر بھی کسی مرض کی نشان دہی کر سکتا ہے یا اس کا علاج کر سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو نہ صرف تندرست و توانا

خیال کرتا ہے بلکہ بعض حالات میں وہ دوسروں کا معالج اور طبیب بھی بنا بیٹھا ہوتا ہے۔ پھر وہ کس طرح گوارا کرے کہ دوسرے آ کر اس کے پندارِ حذاقت کو مجروح کریں اور وہ ان کے مشورے قبول کر کے دوسروں کی نظروں سے اپنے آپ کو گرائے اور اپنی جمی جمائی دکان ختم کر دے؟

اسی طرح ہم نے بتایا ہے کہ ان میں سے چھ بیماریاں ایسی ہیں جو اگر کسی صاحبِ علم و معرفت کو لگ جائیں تو اس کی تمام حاصل کردہ دولتِ معرفت برباد ہو جایا کرتی ہے۔ علم و ایمان کا جو ذخیرہ اس نے جمع کیا ہوا ہوتا ہے وہ بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔ تربیتِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کے جو مراحل وہ طے کر چکا ہوتا ہے وہ سارے کے سارے ناطے کردہ بن کے رہ جاتے ہیں۔ وہ جہاں سے اس راہ میں چلا ہوتا ہے وہیں پھر پلٹ جاتا ہے بلکہ بسا اوقات اس سے بھی پیچھے پھینک دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے لیے توفیقِ خیر کے دروازے ہی بند ہو جاتے ہیں اور وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بقول نہ صرف اتنے ہی سے محروم کر دیا جاتا ہے جو اسے بخشا گیا تھا بلکہ وہ بھی اس سے چھین لیا جاتا ہے جو اس کے اپنے پاس موجود ہوتا ہے۔

ہماری جسمانی بیماریوں میں جو اہمیت دق اور سل، کوڑھ اور جذام وغیرہ کو حاصل ہے اس سے زیادہ اہمیت ہماری روحانی و اخلاقی بیماریوں میں ان امراض کو حاصل ہے۔ اس وجہ سے ہم صرف ان کے بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے بلکہ اپنے علم کی حد تک کتاب و سنت کی روشنی میں ان میں سے چند اہم بیماریوں کے اسباب اور ان کے ازالہ کی تدابیر پر بھی گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ ہم نے صرف چند ہی بیماریوں کے اسباب اور ان کے علاج پر گفتگو کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی بیماریاں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ دوسری بیماریوں پر جو اجمالی بحث ہم نے پچھلے دو ابواب میں کی ہے وہ ان کے اسباب و علاج پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کے اسباب

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ اور شریف کو نظر انداز کر کے کسی حقیر و رذیل کام کو انسان بس یونہی نہیں اختیار کر لیتا ہے۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے پست اور رذیل نہیں بنایا گیا ہے کہ خواہ مخواہ پستیوں ہی کی

طرف جھکے اور گھٹیا باتوں ہی کو پسند کرے۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے تو وہ حق طلب، خیر پسند اور اعلیٰ اقدار کا قدر دان پیدا کیا گیا ہے لیکن کچھ خاص اسباب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بسا اوقات اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ اور خوب کو نظر انداز کر کے ناخوب کو اختیار کر لیتا ہے اور پھر اسی کے پیچھے اپنی بیش قیمت زندگی گنوا بیٹھتا ہے۔ ہم یہاں ان اسباب کا کھوج لگائیں گے اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی ان کے دور کرنے کی تدابیر کی طرف بھی اشارے کرتے جائیں گے۔

وقت کی قدر و قیمت سے بے خبری

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ عموماً لوگ وقت کی قدر و قیمت نہیں پہچانتے۔ انہیں یہ پتا نہیں ہے کہ انسان کے ہاتھ میں اصلی دولت وقت ہی ہے۔ جس نے وقت کو ضائع کر دیا اس نے سب کچھ ضائع کر دیا۔ قدرت نے انسان کے ہر لمحہ زندگی کے ساتھ ایک اہم فرض باندھ رکھا ہے جس کی ادائیگی ہی میں اس کی زندگی کی ساری عظمتیں پوشیدہ ہیں۔ اگر وہ اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی اس فرض کو پہچاننے یا ادا کرنے میں کوتاہی کر جائے جو اس لمحہ کے ساتھ مخصوص ہے تو پھر اس فرض کا وقت زندگی میں کبھی بھی نہیں آتا کیونکہ اس کے بعد اس کو زندگی کے جو لمحات بھی میسر ہوتے ہیں وہ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریاں ساتھ لاتے ہیں، اس وجہ سے جو فرض رہ گیا وہ گویا ہمیشہ کے لیے رہ گیا۔ اگر اس کو اس کے اصلی وقت کے بعد پورا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اسی کے مساوی یا اس سے بھی زیادہ بھاری دوسرے کسی فرض کو اس کی خاطر نظر انداز کیا جائے۔ جس نے یہ کہا ہے کہ:

یک لحظہ غافل بودہ ام صد سالہ راہم دور شد

اس نے محض ایک شاعرانہ خیال ہی نہیں ظاہر کیا ہے بلکہ زندگی کی ایک نہایت اہم حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

وقت ایک گراں مایہ دولت ہے اور اس دولت کی فطرت یہ ہے کہ یہ رکھ چھوڑنے کی چیز نہیں ہے۔ یہ برف کے تودے کی طرح ہر وقت پگھلتی رہتی ہے۔ اگر انسان اس سے پوری مستعدی کے ساتھ فائدہ نہ اٹھائے تو یہ بہت جلد پانی کی روانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے اور انسان اپنی غفلت اور

بدبختی پر ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ پھر اس کی یہ بھی فطرت ہے کہ یہ ایک شمشیر دودم ہے جس کی کاٹ دوطرفہ ہے۔ اگر آپ اس کو اپنے حق میں استعمال نہ کر سکے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ آپ کے خلاف استعمال ہوا۔ اگر اس کے ایک ایک لمحہ کے بدلہ میں آپ نے اجر نہیں کمایا تو صرف یہی خسارہ نہیں ہوا کہ آپ نے اپنے سرمایہ سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کا اصلی دردانگیز پہلو یہ ہے کہ ضائع شدہ زندگی کا ایک ایک پل آپ کے لیے وبال بنا۔ یہ رائگاں جانے والی زندگی صرف رائگاں ہی نہیں جاتی بلکہ انسان پر ایک ابدی لعنت بن کر مسلط ہو جاتی ہے۔ سورہ عصر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ سورہ وہ سورہ ہے جس کی نسبت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر قرآن میں سے اور کچھ نہ اترتا، صرف یہی سورہ اترتی' تو ہمارے لیے کافی تھی۔ فرمایا:

وَالْعَصْرِ ٥ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ٥ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ٥ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ٥ (العصر ۱۰۳:۱۔۳)

زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے بجز ان کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

یہ سورہ جہاں اوپر کے حقائق کی طرف اشارہ کر رہی ہے، وہیں ایک اور باریک نکتہ کی طرف بھی اس سے رہنمائی مل رہی ہے۔ وہ یہ کہ انسان کے اس خسارہ کی وجہ یہ ہے کہ وہ وقت اور اس کے مصرف دونوں کی قیمتوں میں موازنہ نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اشرفیاں تو لٹاتا ہے اور کوئلوں پر مہر کرتا ہے' جواہرات دیتا ہے اور سنگ ریزے خریدتا ہے' کانٹوں کو چنتا ہے اور پھولوں کو پھینکتا ہے۔

اگر ایک انسان کے پاس ایک ہی روٹی ہو اور خود اس کو اور اس کے بچوں کو فاقہ درپیش ہو تو بچوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنے کی غلطی کبھی نہیں کرے گا۔ اگر ایک مسافر کے پاس پانی کی ایک ہی چھاگل ہو اور اس کو صحرا کا سفر درپیش ہو تو وہ اس پانی کو پاؤں دھونے پر بھی ضائع نہیں کرے گا بلکہ اس کا ایک ایک قطرہ اپنی زندگی بچانے کے لیے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اگر کسی کے ترکش میں ایک ہی تیر ہو اور راستے میں اسے شیر یا بھیڑیے سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہو تو

وہ یہ حماقت کبھی نہیں کرسکتا کہ وہ اس ایک ہی تیر کو گیدڑوں اور لومڑیوں کے شکار پر ضائع کردے بلکہ وہ اس کو اصل خطرہ کی مدافعت کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن حیرت ہے کہ وہی انسان جو اپنی ایک روٹی، اپنے ایک چھاگل پانی اور اپنے ترکش کے ایک تیر کے مصرف کو متعین کرنے میں اتنا محتاط ہے جب اس کے سامنے خود اپنی زندگی جیسی بیش قیمت چیز کے مصرف کے متعین کرنے کا سوال آتا ہے تو وہ بالکل ہی نادان بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے حصے میں ایک ہی زندگی آئی ہے، کئی زندگیاں نہیں آئی ہیں۔ اسی زندگی کے بدلے میں ہم یا تو ابدی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں یا ابدی خسران۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ابدی کامیابی حاصل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ یہ چیز محض خواہش کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے انسان کو قدم قدم پر مہمات سر کرنی پڑتی ہیں اور زندگی کے ہر موڑ پر معرکے جیتنے ہوتے ہیں۔ بغیر ان معرکوں کے جیتے اور ان مہمات کو سر کیے انسان ابدی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ لیکن اس واضح حقیقت کے باوجود دنیا میں اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو اپنی زندگیاں نہایت حقیر مقاصد پر ضائع کرتے ہیں۔ اس کی وجہ جیسا کہ بیان ہوئی، یہی ہے کہ انہیں اس زندگی اور اس مدت حیات کی حقیقی قدر و قیمت معلوم نہیں ہے جو ان کے حصہ میں آئی ہے۔ نہ وہ اس کی سیال فطرت سے واقف ہیں، نہ اس کی دوطرفہ کاٹ کو جانتے ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ یہ خود تو اگرچہ عارضی اور فانی ہے لیکن وہ ایک ابدی اور لازوال زندگی کی قیمت بن سکتی ہے بشرطیکہ انسان اس کو حقیر مشغلوں میں ضائع کرنے کے بجائے اسی مصرف میں صرف کرے جس پر اس کو صرف ہونا چاہیے۔

اپنے مرتبہ سے بے خبری

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کی طرف مائل ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے اس درجہ اور مرتبہ سے غافل ہو جاتا ہے جو قدرت نے اس کو بخشا ہے۔ انسان اس تمام کائنات کی تخلیق کا مقصد اور موضوع ہے۔ دنیا کی ساری چیزیں اس کے لیے بنائی گئی ہیں لیکن وہ ان چیزوں میں سے کسی کے لیے بھی نہیں بنایا گیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی ہے لیکن وہ کسی کے لیے بھی مسخر نہیں کیا گیا۔ وہ ہر چیز کو استعمال کرتا ہے اور کرسکتا ہے لیکن اس دنیا میں کسی کا بھی یہ درجہ اور مرتبہ

نہیں ہے کہ خود اس کو استعمال کرسکے۔ لیکن انسان فنا ہو کر بھی باقی رہنے والا ہے۔ اس کی صلاحیتیں اور قابلیتیں غیر محدود ہیں اور اس کے درجہ کی بلندی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس کو اپنی معرفت حاصل ہو جائے اور وہ اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرسکے تو دوسری مخلوقات تو درکنار فرشتے بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ یہ زمین میں خدا کا خلیفہ اور اس کا نائب ہے اور خدا کے سوا کوئی بھی اس سے بڑا نہیں ہے۔ یہ مرتبہ ایک ایسا اونچا مرتبہ ہے کہ اس سے زیادہ اونچے مرتبہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خدا نے اس مرتبہ کا انسان کے اندر شعور بھی ودیعت کیا ہے اور اس مرتبہ کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے اس کو قوتیں اور قابلیتیں بھی عطا فرمائی ہیں۔ اگرچہ اپنے اس شعور کو زندہ رکھنا یا نہ رکھنا اور ان قوتوں اور قابلیتوں کو استعمال کرنا یا نہ کرنا خود اس کی اپنی آزادی رائے اور اپنی پسند یا ناپسند پر منحصر ہے اور یہ اختیار و آزادی بھی غور کیجیے تو اس کے عزت و شرف ہی کا ایک پہلو ہے کیونکہ خدا نے اپنی مخلوقات میں سے انسان ہی کو اس شرف سے نوازا ہے کہ وہ اپنی راہ اور منزل خود انتخاب کرسکتا ہے۔ اگر وہ اپنے اس انتخاب میں اپنے منصب اور مرتبہ کا لحاظ رکھتا ہے تو جس فطرت شاہینی کے ساتھ خدا نے اس کو پیدا کیا ہے وہ ظہور میں آتی ہے لیکن اگر وہ اپنے مرتبہ اور مقام کو بھول جائے تو پھر وہ شاہین ہو کر کنجشک فرومایہ اور شیر ہو کر گربہ مسکین کی فطرت اختیار کرلیتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف سورۂ تین میں ارشاد فرمایا ہے:

> لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍo ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ o
> (التین ۔ ۹۵: ۴ ۔ ۵)
> ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا۔ پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا۔

اس احساس شرف سے محروم ہو جانے کے بعد انسان جس طرح گرتا ہے اور اپنے آپ کو اپنی حقیر و رذیل خواہشوں کے جس طرح حوالہ کر دیتا ہے اور پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر وہ جس درجہ ذلیل و خوار ہوتا ہے، اس کی پوری تصویر قرآن مجید نے سورہ اعراف کی ان آیات میں کھینچ کے رکھ دی ہے:

> وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ

الْغٰوِيْنَ o وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ

(الاعراف۔ ۷: ۱۷۵۔۱۷۶)

اوران کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی تمثیل کتے کی ہے۔ اگر تم اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔

پست ہمتی و بے صبری

اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جتنے کام بھی اعلیٰ واشرف ہیں وہ مشقت طلب، صبر آزما اور عموماً کڑوے کسیلے ہیں۔ ان کو انجام دینے کے لیے انسان کو ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے۔ برعکس اس کے گھٹیا قسم کے جو کام ہوتے ہیں وہ نہایت سہل، بے مشقت اور نفسانی تقاضوں کو فوری تسکین بہم پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے انسان کو کوئی چڑھائی چڑھنے کی بجائے صرف نیچے کی طرف لڑھک جانا ہوتا ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ نماز اور تلاوت کے مقابلہ میں گپ شپ کرنا، مطالعہ کرنے کے بجائے سورہنا، فلسفہ پڑھنے کے بجائے ناول اور افسانے پڑھنا، ضبطِ نفس اور تربیت و تزکیہ کا دردِ سر مول لینے کے بجائے اپنے آپ کو خواہشاتِ نفس کی رو پر چھوڑ دینا عام آدمیوں کے لیے نہایت سہل اور لذیذ کام ہیں۔ میدان میں ڈٹ کر لڑنے کے بجائے اگر فرار اختیار کرنا ہو اور موجوں اور بادِ مخالف سے نبرد آزمائی کی جگہ کشتی کو موجوں ہی کے حوالے کر دینا ہو تو آخر اس کے لیے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دینے کے سوا اور کس سلیقہ یا محنت کی ضرورت ہے؟ اعلیٰ کاموں کے مقابل میں ادنیٰ کاموں کی یہی فطرت ہے جو ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے جو اپنے اندر ہمت اور اولوالعزمی نہیں رکھتے اور جو محنت و مشقت کے بجائے کاہلی اور سہل پسندی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کے اسی فرق کو ایک حدیث نبوی میں اس طرح واضح فرمایا

گیا ہے کہ:

حفت الجنة بالمكاره و حفت النار بالشهوات.

(صحیح مسلم: کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واھلہا باب ا)

جنت کی منزل مشکلات ومصائب سے گھری ہوئی ہے اور جہنم کی منزل خواہشاتِ نفس سے گھری ہوئی ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ کمال کی منزل مشکلات و مصائب سے گھری ہوئی ہے اور اہلِ خسران کی منزل خواہشاتِ نفس سے گھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص جنت حاصل کرنا چاہے تو اس کو بے شمار مشکلات و مصائب سے لڑنا اور ان پر غالب آنا پڑے گا۔ برعکس اس کے اگر کوئی شخص دوزخ میں گرنا چاہے تو اس کا معاملہ نہایت سہل ہے۔ وہ کسی مزاحمت کا مقابلہ کیے بغیر اپنی خواہشات کے سبز باغوں میں پھرتا پھراتا وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ نیکی اور بدی کے مزاج کا یہی اختلاف ہے، جس کے سبب سے انسان نیکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا ہے کیونکہ اس راہ میں اس کو گھاٹیاں پار کرنی پڑتی ہیں اور قدم قدم پر اپنے نفس کی خواہشوں سے لڑنا ہوتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن نے اس راہ کے سفر کو اقتحام عقبة سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے معنی گھاٹی کو پار کرنا فرمایا ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ o فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ o وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ o فَكُّ رَقَبَةٍ o اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ o يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ o اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ o ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ o اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ o (البلد۔ ۹۰: ۱۰۔۱۸)

اور کیا ہم نے اس کو دونوں راہیں نہیں سجھا دیں؟ پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی! اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی؟ گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا — پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔ یہی خوش بخت لوگ ہیں۔

برعکس اس کے جو شخص بدی کے گڑھے میں گرنا چاہتا ہے وہ اپنی منزل بڑی تیزی سے طے

کرتا ہے۔ وہ بدی کا رخ کرتے ہی خود بخود لڑھکتا ہوا اپنے پسند کردہ قعرِ مذلت کی گہرائیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کا اشارہ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (التین ۹۵: ۵) میں سٰفلین کے لفظ سے نکل رہا ہے۔ اس کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہشاتِ نفس کے پیرو کو اس کی خواہشات کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ لڑھکتا ہوا اخلاقی پستی کی آخری حدوں تک پہنچ جاتا ہے۔

اس موقع پر نفس انسانی کی اس خصوصیت کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے جس کی طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا ہے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کی ذمہ داریاں سپرد کرتے وقت جو قیمتی نصیحتیں فرمائیں ان میں ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ اس بات کو یاد رکھنا کہ نفس کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی اگر ایک ناجائز خواہش پوری کر دی جائے تو پھر وہ دوسری کے لیے ہاتھ پاؤں پھیلاتا ہے۔ یعنی ایک کمزوری دوسری کے لیے اور ایک برائی دوسری برائی کے لیے خود راہ کھول دیتی ہے۔ اس وجہ سے بہتری اسی میں ہے کہ نفس کو اس جانب ڈھیل ہی نہ دی جائے۔ ورنہ اگر ایک مرتبہ وہ اس راہ پر چل پڑا تو پھر اس کو اس سے موڑنا آسان نہیں رہے گا۔ ایک چراگاہ کے بعد دوسری چراگاہ اس کے سامنے آتی رہے گی اور وہ آگے ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہاں پہنچ جائے گا جہاں پہنچ کر واپس آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ادنیٰ پرستوں کی کثرت

اعلیٰ کے مقابل میں ادنیٰ کو ترجیح دینے کی ایک بڑی وجہ دنیا میں ادنیٰ پرستوں کی کثرت بھی ہے۔ آدمی اسی راہ پر چلنے میں سلامتی دیکھتا ہے جو قافلوں سے بھری ہوئی ہو۔ جس کام کو اکثریت کر رہی ہو اس کے کرنے کے لیے صرف یہی نہیں کہ دل میں تحریک پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ چیز اس کے اعلیٰ اور عمدہ کام ہونے کی ایک نہایت قوی دلیل بھی بن جاتی ہے۔ تاریخ کے جس دور میں جس چیز کا بھی زور ہوا ہے اس نے وبائے عام کی طرح ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور متاثر کیا ہے اور اس تاثر میں اول تو اس کی واقعی قدر و قیمت پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے اور اگر کچھ لوگوں نے غور بھی کیا تو بالآخر انہیں بھی وقت کی عام بدمذاقی کے آگے سپر ڈال دینی پڑی۔ بنی اسرائیل کے بگاڑ کی تاریخ نبی ﷺ نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ جب ان کے اندر خرابیاں پھیلنی شروع ہوئیں تو

ابتدا میں ان کے علماء نے ان کو ان سے روکنا چاہا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وقت کے رجحانِ عام کے آگے ان کے لیے بند باندھنا مشکل ہے تو وہ خود بھی اسی رجحانِ عام کی رو میں بہنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جس کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے بگڑے ہوئے لوگوں کے دلوں کی سیاہی ان کے دلوں پر بھی تھوپ دی۔ خود ہماری اپنی تاریخ پر بھی غور کیجیے تو کچھ یہی صورت حال یہاں بھی نظر آئے گی۔ صدر اول کو چھوڑ کر، جس میں زندگی کے ہر شعبہ میں اعلیٰ اقدار کا حقیقی احترام باقی رہا، بعد کے ادوار کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ جس دور میں جو چیز بھی ذہنوں اور دماغوں پر چھا گئی ہے اسی کا کلمہ سب پڑھنے لگے ہیں۔ جس دور میں شعر و ادب کا زور ہوا سب اسی رنگ میں مست نظر آنے لگے۔ جب یونانی علوم کی گرم بازاری ہوئی تو ان علوم کے آگے سارے علوم ہیچ ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کے اعزاز و احترام میں کتاب و سنت کی بساط بھی لپیٹ کر رکھ دی گئی۔ اسی طرح جب تصوف کا چرچا پھیلا تو کتاب و سنت کی تعبیریں بھی اسی کی روشنی میں کی جانے لگیں، گویا یہ اصل ہے اور کتاب و سنت اس کی فرع ہیں۔ اب اس زمانہ کو دیکھیے تو مغربی علوم و فنون نے ہر شخص کو اس طرح مسحور کر لیا ہے کہ کسی کو ہوش ہی نہیں کہ ان کے سوا کوئی اور علم بھی ہے جس کے سیکھنے سکھانے کی ضرورت ہے اور زندگی میں اس کی بھی کوئی قدر و قیمت ہے۔ حالانکہ ہر چیز میں حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی وہی ہے جس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے بغیر تو یہ سارے علوم و فنون انسانیت کے حقیقی فائدہ کے نقطۂ نظر سے ضرر رساں زیادہ اور مفید بہت کم رہ جاتے ہیں۔ لیکن ہماری تاریخ میں بہت تھوڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے اس ہمہ گیر فتنہ کے اندر اپنے ذہنی توازن کو قائم رکھا اور جو نہ تو زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے اتنے عاجز اور بے بس ہوئے کہ وقت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں اور نہ اتنے جامد ثابت ہوئے کہ سیلاب ان کے اوپر سے گزر جائے اور وہ اپنی جگہ ہی پتھر کی طرح پڑے رہ جائیں۔ درحقیقت یہی گنتی کے افراد ہیں جنہوں نے تمام طوفانوں اور تھپیڑوں کے اندر امت کے سفینہ کی ناخدائی کی ہے اور اس کو غرق ہونے سے بچایا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آج ہمارے لیے یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہوتا کہ ہماری تاریخ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں پر جا کر ختم ہوئی۔ ہم صحرا میں ایک کھوئے ہوئے قافلہ کی مانند ہوتے جسے کچھ پتا نہیں کہ کدھر سے آئے ہیں اور کدھر جانا ہے۔

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کے اسباب کا علاج

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کے ان چاروں اسباب پر نگاہ ڈالیے تو ان کی تہ میں یا تو شعور کی کمی نظر آئے گی یا ہمت کی۔ جو لوگ وقت اور زندگی کی ناقدری کے سبب سے یہ روش اختیار کر لیتے ہیں ان کے اندر شعور اور بیداری کا فقدان ہے اور جو لوگ مشکلاتِ کار یا ہمہ گیر بگاڑ سے مرعوب ہو کر وبائے عام میں مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، ان کے اندر عزم اور یقین ناپید ہے۔ شعور کو بیدار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ مفید چیز صالح لٹریچر کا مطالعہ اور ذی شعور لوگوں کی صحبت ہے۔ آدمی کو برابر ایسی چیزیں پڑھتے رہنا چاہیے جن میں زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے، جو دل کو بیدار کرنے والی اور کانوں اور آنکھوں کو کھولنے والی ہیں، جو عقل کو جلا دیتی اور روح کو گرماتی ہیں، جن سے ایمان کو غذا ملتی ہے اور اس عالم فانی کی جگہ عالم باقی کی محبت پیدا ہوتی ہے، جن کے اندر معرفت کا نور اور علم حقیقی کی روشنی ہے۔ ایسی چیزوں میں سب سے اونچا درجہ کتاب اللہ اور احادیثِ رسول کا ہے۔ ان کے حرف حرف اور سطر سطر کے اندر خالص حقیقت اور بالکل بے آمیز علم ہے۔ ان کے بعد زبور، انجیل، امثالِ سلیمان اور صالحین و مصلحین امت کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں یا پھر ایسے حکیموں اور فلسفیوں کی چیزیں ہیں جنھوں نے فی الواقع زندگی کے مسائل پر غور کیا ہے اور اس کے حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ان چیزوں کے اندر کچھ ملاوٹیں اور آمیزشیں بھی ہیں اور جگہ جگہ ان میں فکرِ انسانی کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن جو لوگ ان کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پڑھتے ہیں وہ نہایت آسانی سے ان کے حق و باطل میں خود امتیاز کر لیتے ہیں۔

ہمت اور عزیمت پیدا کرنے کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں ان میں سے اکثر تو ایسی ہیں جن کا تعلق عمل سے ہے اور ہم ان کی تفصیل آگے چل کر تزکیہ عمل کے تحت کریں گے۔ یہاں جس بات کا بتانا مناسب اور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک حقیقت — جیسی کچھ بھی وہ ہے — پہلے آدمی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینی چاہیے۔ ایک حقیقت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ان تیاریوں میں بہت معین ہوا کرتا ہے جو آدمی کو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کرنی پڑتی ہیں۔

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ جتنی بھی اعلیٰ قدریں ہیں وہ فطرت کو محبوب ہونے کے باوجود، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، مشقت طلب اور صبر آزما ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ان کے چاہنے والے تو ہمیشہ زیادہ رہے لیکن عملاً ان کے اختیار کرنے والے ہمیشہ تھوڑے ہی نکلے۔ ان کی خوبیوں اور برکتوں کے گن تو بزدلوں اور پست ہمتوں نے بھی گائے لیکن ان کے حاصل کرنے کے لیے جن قربانیوں کی ضرورت تھی، ان کے پیش کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے۔ اس صورتِ حال کی وضاحت اس راہ کے داعیوں نے ہمیشہ خود ہی کر دی ہے تاکہ وہی لوگ اس میں قدم رکھیں جو اس کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے اندر کچھ دم خم رکھتے ہوں۔ جو لوگ اس وادیٔ پرخار کی صعوبتوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے، بہتر ہے کہ وہ اس کا رخ ہی نہ کریں:

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں اور بدی کا راستہ فراخ ہے اور اس پر چلنے والے بہت ہیں:

> تنگ دروازہ سے داخل ہو کیونکہ وہ دروازہ چوڑا ہے اور وہ راستہ کشادہ ہے جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے اور اس سے داخل ہونے والے بہت ہیں o کیونکہ وہ دروازہ تنگ ہے اور وہ راستہ سکڑا ہے جو زندگی کو پہنچاتا ہے اور اس کے پانے والے تھوڑے ہیں۔
>
> (انجیل متی: باب ۷: ۱۳-۱۴)

اسی حقیقت کو قرآن مجید نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

> اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ o وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ o (العنکبوت ۲۹: ۲-۳)
>
> کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟ اور ہم نے تو ان لوگوں کو بھی آزمایا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ سو اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بھی نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ اس دنیا میں اگرچہ خبیث اور خباثت پسندوں کی اکثریت ہے اور یہ اکثریت کمزوروں اور پست ہمتوں کو خباثت پسندی پر اکساتی بھی ہے لیکن خدا کی میزان میں بہرحال وزن طیب ہی کا ہے اور فلاح پانے والے وہی ہوں گے جو خبیث کی اس کثرت سے مرعوب نہ ہوں بلکہ طیب کو اختیار کریں، اگرچہ یہ خود بھی کم ہو اور اس کے لیے بازیاں کھیلنے والے بھی کم ہی ہوں:

قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ. (المائدۃ۔۵:۱۰۰)

کہہ دو کہ ناپاک اور پاک دونوں ایک نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہیں فریفتہ کرنے والی ہو۔ پس اللہ سے ڈرتے رہو، اے اہل عقل!

ان تنبیہات کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص حقیقت کو، جیسی کچھ وہ ہے، اچھی طرح سمجھ لے۔ کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ ادنیٰ کے مقابل میں اعلیٰ کی طلب کوئی آسان بازی ہے جس کو ہر شخص کھیل سکتا ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ چاہنے کی چیز اگر کوئی ہے تو یہی ہے، کرنے کا کام کوئی ہے تو یہی ہے، کامیابی اور فلاح کی راہ ہے تو یہی ہے، انسان کے شرف و عزت کے مطابق اور اس کے مرتبہ اور درجہ کے شایان شان کوئی چیز ہے تو یہی ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ اس راہ کے خطرات کا مقابلہ کرنا اور اس کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونا ہر بوالہوس اور ہر مدعی کا کام نہیں ہے۔ اس میں کامیابی انہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو ایک عاشق صادق کا جنون اور ایک مرد مجاہد کا عزم و حوصلہ رکھتے ہوں۔

اس صورت حال کو سمجھ لینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی جس کام کے لیے اٹھے اگر اس کے تقاضوں اور اس کے نتائج سے پوری طرح باخبر ہو اور اس کے لیے اپنے عزم و ارادہ کو اچھی طرح تول کے اٹھے تو مشکلات سے لڑنے اور ان پر قابو پانے کی صلاحیت اس کے اندر بہت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس طرح کے کسی معرکے کے لیے وہ بالکل بے خبرانہ اٹھ کھڑا ہو تو پہلی ہی چوٹ میں وہ ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ اگر ایک شخص شیر کے شکار کے ارادہ سے نکلے اور اس کو شیر سے سابقہ پیش آ جائے تو وہ خطرات میں اپنے حواس بجا رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات اس میں

وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص گیدڑ کے شکار کے لیے نکلے اور اس کو سابقہ پیش آ جائے شیر سے تو وہ کس طرح اپنے اوسان قائم رکھ سکتا ہے؟

اس حقیقت نفس الامری سے کما حقہ واقفیت کے علاوہ دوسری چیز جو آدمی میں عزم و ہمت پیدا کرتی ہے وہ مردانِ حق کی معیت و رفاقت ہے۔ یہ معیت و رفاقت ذہنی طور پر بھی حاصل کی جاتی ہے اور عملی طور پر بھی۔ ذہنی طور پر اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی سیرتوں کا برابر مطالعہ کیا جاتا رہے جنہوں نے راہ حق میں مصیبتیں جھیلی ہیں، جنہوں نے اعلیٰ اقدار کی طلب میں دنیا کی جھوٹی عزتوں اور شہرتوں کو نہایت حقارت سے ٹھکرایا ہے، جو نیکی اور سچائی کی راہ پر چلنے کے لیے یکہ و تنہا اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اپنے عزم و حوصلہ سے انہوں نے دوسروں کے لیے اس راہ پر چلنا آسان کر دیا ہے، جنہوں نے جہل کی ظلمت میں علم کے دیے جلائے ہیں اور ان کو بادِ حوادث سے محفوظ رکھا ہے، جنہوں نے باطل کے غوغائے عام میں حق کا نعرۂ مستانہ بلند کیا اور پھر یا تو باطل کو مغلوب کر لیا ہے یا اس سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے اپنا نقش قدم ایک نشانِ ہمت کی حیثیت سے یادگار چھوڑا ہے۔ ایسے لوگوں کے حالات زندگی کا مطالعہ آدمی کے اندر ہمت پیدا بھی کرتا ہے اور پیدا شدہ ہمت کو برقرار بھی رکھتا ہے۔

عملی طور پر اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے آدمی کو ایسے لوگوں کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو اس راہ میں اس کی رہنمائی کر سکیں اور اگر رہنمائی نہ کر سکیں تو کم از کم رفاقت ہی کا حق ادا کر سکیں۔ یہ دنیا جب تک قائم ہے اس میں جس طرح برے لوگ موجود رہیں گے اسی طرح اچھے لوگ بھی موجود رہیں گے۔ اگر بروں کو لیڈر بھی مل جاتے ہیں اور ساتھی بھی میسر آ جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک خیر کے طالب کو ساتھی اور رہنما نہ مل سکیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی خلوص کے ساتھ تلاش کرے اور جب پا جائے تو ان کی معیت و رفاقت حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت دینے پر تیار ہو جائے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے لیے آدمی کو گھربار اور ملک و وطن بھی چھوڑنا پڑ جائے تو یہ بازی بھی وہ جی کڑا کر کے کھیل ہی ڈالے۔ یہ خدا کی راہ میں اس کی ہجرت ہوگی اور ہجرت کی راہ آدمی کے لیے ہمیشہ کھلی ہوئی ہے۔ ہجرت کا اصلی مقصد ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ایک اعلیٰ نصب العین کی خاطر ایک ناسازگار ماحول کو چھوڑ کر ایک سازگار ماحول تلاش کیا جائے۔ یہ ماحول زندگی کے بناؤ

اور بگاڑ میں بڑا مؤثر عامل ہے جس کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ماحول ناسازگار ہو تو بسا اوقات بڑی اعلیٰ صلاحیتیں بھی برباد ہو کے رہ جاتی ہیں اور اگر ماحول سازگار مل جائے تو معمولی صلاحیتیں بھی جلا پا کر ذرہ سے آفتاب بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام تک کا یہ حال رہا ہے کہ انہوں نے اچھے ماحول اور اچھے ساتھیوں کے لیے دعائیں کی ہیں اور ان کے حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی بازیاں کھیلی ہیں۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام اپنی عزیمت واستقامت کے اعتبار سے بجائے خود ایک عالم رہے ہیں۔ انہوں نے دوسروں کو اپنی حرارت سے گرمی پہنچائی ہے، کبھی دوسروں سے حرارت حاصل کرنے کے محتاج نہیں ہوئے اور اپنی ذات سے اپنے ماحول کو روشن کیا ہے، کبھی ماحول سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ان کو نہیں پیش آئی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آدمی کی صلاحیت اگر قوی ہو تو بسا اوقات وہ تاریکی سے بھی روشنی حاصل کر لیتا ہے اور راہ کی ٹھوکروں سے بھی اس کو رہنمائی مل جاتی ہے۔ علامہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ابوالہیثم نامی ایک چور کے لیے اکثر دعائے خیر فرماتے رہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایک چور کے لیے دعائے خیر کیوں فرماتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میرے ابتلاء کے زمانہ میں اس نے اپنے عملی نمونہ سے مجھے نہایت قیمتی درس دیا تھا۔ جب مجھے بیڑیوں میں جکڑ کر اونٹ پر سوار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو یہ شخص ایک جگہ راہ میں مجھے ملا اور اس نے مجھ سے کہا: 'ابن حنبل! چوری کے جرم میں مجھے اتنی بار قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں اور اتنے سو دُرّے میری پیٹھ پر برسے ہیں، تاہم میں اپنی اس حرکت سے باز نہیں آیا۔ اگر میں شیطان کی راہ میں یہ مصائب جھیل کر اس طرح استوار رہ سکتا ہوں تو حیف ہے اگر تم خدا کی راہ میں ان مصائب کو پامردی سے نہ برداشت کر سکو! حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی اس جرأت وصلابت سے مجھے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اسی طرح جو لوگ اپنے اندر اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں، ان سے یہ توقع بعید نہیں ہے کہ وہ ان جانبازیوں سے راہ حق کے لیے درس حاصل کریں جو آج باطل کے علم بردار باطل کو سربلند کرنے کے لیے دکھا رہے ہیں۔ لیکن ایسے غیر معمولی عزم وحوصلہ کے لوگ زیادہ نہیں ہو سکتے۔ زیادہ لوگ تو ایسے ہی ہو سکتے ہیں، جن کو اچھے ساتھی ملیں

تو اچھے بن سکتے ہیں، لیکن اگر برے ساتھی مل جائیں تو اندیشہ ہے کہ ان کی برائیاں ان پر غالب آ جائیں۔ اس وجہ سے انسان کی عام فطرت کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ جو لوگ اپنی خوبیوں کو پروان چڑھانا چاہتے ہوں وہ سازگار ماحول اور اچھے ساتھیوں کی تلاش سے غافل نہ رہیں۔

آخری چیز جو اس مقصد کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے وہ بندے کا اللہ کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اگر دل کا سفینہ اس لنگر کے ساتھ بندھا ہوا ہو تو خواہ کیسی ہی باد مخالف چلے اور کیسی ہی خطرناک موجیں اٹھیں لیکن کشتی ہچکولے کھا کر بھی سلامت رہتی ہے اور طوفانوں کے اندر سے گزرتی ہوئی ساحل مراد پر پہنچ ہی جاتی ہے۔ رہنما غلطی کر سکتے ہیں اور رفقاء ساتھ چھوڑ سکتے ہیں لیکن خدا کبھی ان لوگوں کو نہیں چھوڑتا جو بہرحال اور بہر صورت خدا کو پکڑے رہنا چاہتے ہیں۔ اس نے خود فرمایا ہے کہ جو لوگ میری راہ پر چلنا چاہتے ہیں اور اس راہ کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، میں ان کے لیے مشکلات کے اندر سے راہ پیدا کرتا ہوں:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت۔۲۹:۶۹)

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔

اور اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو لوگ اس راہ کی مشکلات کے مقابل میں ثابت قدم رہنا چاہتے ہیں ان کو یہ چیز اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب وہ میرے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط واستوار رکھیں اور میری یاد سے غافل کبھی نہ ہوں — وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ. اور تم ثابت قدمی نہیں حاصل کر سکتے مگر اللہ کے تعلق سے۔

باب ۹

کتمانِ علم کے اسباب
اور اس کا علاج

علم — خواہ ہمارے اپنے تجربات کا حاصل کردہ ہو یا خدا کا نازل کردہ — بندوں کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اس امانت کا پہلا حق تو یہ ہے کہ ہر نسل اس کی پوری پوری حفاظت کرے، اس سے کما حقہ فائدہ اٹھائے، اس کو اپنے امکان کی حد تک ترقی دے۔ اور دوسرا حق یہ ہے کہ پوری احتیاط و دیانت کے ساتھ اس کو اپنے بعد آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کر دے۔ اسی دیانت دارانہ توریث و توارث پر اس دنیا کی تمام مادی و روحانی خوشحالیاں اور ترقیاں مبنی ہیں، یہ دنیا مادی اعتبار سے جو باغ و بہار نظر آ رہی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ پچھلی نسلوں نے جو تجربات جمع کیے تھے وہ ہم تک منتقل ہوتے رہے اور ہم نے ان سے فائدہ بھی اٹھایا اور ان کو ترقی بھی دی۔ اگر یہ ہم تک منتقل نہ ہو پاتے یا ہم نے ان کو حاصل کرنے یا ان کو ترقی دینے کا اہتمام نہ کیا ہوتا تو یہ دنیا آج جو ہے اس سے بہت پیچھے ہوتی۔

اسی طرح ضروری ہے کہ جو روحانی اور اخلاقی علوم اللہ تعالیٰ نے اتارے ہیں وہ بھی صحیح طور پر ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتے رہیں۔ اگر ان کے منتقل ہوتے رہنے کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ روشنی کی جگہ تاریکی نے اور اسلام کی جگہ جاہلیت نے اپنا تسلط جما لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امت کو بھی اپنی شریعت کا علم دیا اس پر جہاں یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ اس پر اخلاص کے ساتھ عمل کرے، وہیں یہ ذمہ داری بھی ڈالی کہ وہ اس کو

پوری دیانت کے ساتھ بعد کی نسلوں کی طرف منتقل بھی کرے۔ چنانچہ اہل کتاب کو جب اللہ تعالیٰ نے اس علم کی امانت سونپی تو ان سے یہ عہد لیا کہ:

لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران۔۳:۱۸۷)

تم لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی طرح ظاہر کرنا، اسے چھپانا مت۔

اسی طرح انہیں یہ حکم بھی دیا گیا:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ۔۲:۴۲)

اور حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو، حق کو چھپانے کے لیے درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔

یہود نے جب اس عہد اور اس تنبیہ کی کوئی پروا نہ کرتے ہوئے محض طمع دنیا میں خدا کے اس علم کو چھپایا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ (البقرۃ۔۲:۱۵۹)

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی کھلی کھلی نشانیوں اور ہماری ہدایت کو، بعد اس کے کہ ہم نے وہ کتاب میں کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر دی تھیں، تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ (البقرۃ۔۲:۱۷۴)

بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو خدا نے اپنی کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں۔

اور ان سے یہ امانت چھین کر امت مسلمہ کے سپرد کی اور اس پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ جس طرح اللہ کے آخری رسول (ﷺ) نے ان کو خدا کا یہ دین پہنچایا ہے اسی طرح یہ اس کو دوسروں تک پہنچاتے رہیں۔ چنانچہ اس امت کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (البقرۃ۔۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس علم پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں پر بھی قیامت تک اس کی شہادت دیتی رہے اور اگر اس میں کوئی کوتاہی کرے تو عند اللہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہے۔

اس ذمہ داری سے فرار اختیار کرنے یا اس میں کوتاہی کرنے کے بھی کچھ خاص اسباب ہیں جو ہم یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ یہ اسباب بجائے خود ایسے ہیں کہ ان کے نگاہوں کے سامنے آ جانے کے بعد توقع ہے کہ ہر شخص، جس کے اندر ایمان کی کوئی رمق ہے، وہ ان سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کے اسباب کا جان لینا ہی ان کے علاج کے لیے کافی ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی شخص صحت کا سچا طالب ہو۔

معاشرہ کی ذمہ داری سے بے خبری

اس کتمانِ علم کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ سرے سے معاشرہ کی اصلاح و درستگی سے متعلق اپنی کوئی ذمہ داری سمجھتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک آدمی پر جو کچھ بھی ذمہ داری ہے وہ صرف اس کے اپنے نفس کی ہے۔ اگر اس کو اس نے ٹھیک رکھنے کی کوشش کی ہے تو اس نے دین اور علم دین کا حق ادا کر دیا، اس بات سے اس کی دینداری میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ جس معاشرہ میں وہ رہ رہا ہے اس کا کیا حال ہے اور اس کو دین سے باخبر رکھنے میں اس نے کوئی حصہ لیا ہے یا نہیں۔ وہ اس کو ایک پرایا جھگڑا سمجھتے ہیں جس میں اپنی ٹانگ نہ پھنسانا ہی ان کے نزدیک تقوٰی ہے۔ بعض لوگوں کے اندر تو یہ تصور اس طرح جم جاتا ہے کہ وہ زندگی کا ایک بالکل ہی راہبانہ نقطۂ نظر اختیار کر لیتے ہیں اور معاشرہ کے برے اور بھلے سے یک قلم کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ اس حد تک تو معاشرہ سے بے تعلقی نہیں اختیار کرتے لیکن وہ بھی اس ذمہ داری کو وہ اہمیت

نہیں دیتے جو فی الواقع دین میں اس کی ہے۔ ان کے نزدیک اگر یہ نیکی ہے تو ایک نفلی نیکی ہے جس کے کرنے سے آدمی کے اجر و ثواب میں کچھ اضافہ تو ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ نہ کرے تو اس کو کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔ اس طرح کے کسی کام کو اگر وہ کرتے بھی ہیں تو اس کو وہ خود اپنے فرائض کا کوئی جزو نہیں سمجھتے بلکہ دوسروں کے فرائض کا ایک حصہ سمجھتے ہیں جس کو تبرعاً یہ انجام دے رہے ہیں۔ یہ رائے رکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ نہ تو کوئی شخص معاشرہ کی جہالت اور اس کے بگاڑ کا حقیقی دکھ محسوس کر سکتا اور نہ لوگوں کے ذہن و فکر اور ان کے اعمال و اخلاق کے بدلنے کے لیے کوئی مؤثر اور نتیجہ خیز جد و جہد ہی کر سکتا ہے۔ اول تو وہ کچھ کرے گا ہی نہیں اور اگر کرے گا بھی تو اس کی نوعیت محض چھدا اتارنے کی ہوگی۔ وہ لوگوں کو ان کی حقیقی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے اور ان کے بگاڑ کے اصلی اسباب سے پردہ اٹھانے کے بجائے ہمیشہ کچھ اوپری قسم کی لیپ پوت کر کے اپنی مصلحیت کی دھونس جمانا چاہے گا۔ ایسے شخص کے لیے یہ نہایت مشکل ہے کہ وہ لوگوں کی کسی ایسی برائی کو برائی کہنے کی جرأت کر سکے جس کو لوگ بھلائی بنائے ہوئے بیٹھے ہوں اور جس کو برائی کہنے سے وہ غضب ناک ہوتے ہوں۔ بالخصوص ان برائیوں کو برائی کہنا تو ایسے شخص کے لیے بالکل ہی محال ہے جن کے جواز کا فتوٰی وقت کے اربابِ اقتدار نے دے رکھا ہو جن کو وہ عملاً اپنائے ہوئے ہوں۔ ایسے لوگ قرآن بھی پڑھتے پڑھاتے ہیں، حدیث بھی سکھاتے ہیں اور فقہ و تصوف کے رموز بھی بتاتے ہیں اور یہ سب کچھ بظاہر وہ علم دین کی اشاعت ہی کے لیے کرتے ہیں لیکن یہ ساری چیزیں وہ اس طرح سکھاتے اور پڑھاتے ہیں گویا یہ ماضی بعید کی حکایتیں ہیں جن کا کوئی حرف بھی حال پر منطبق نہیں ہوتا۔

بہت سے لوگ جان بوجھ کر یہ روش، اپنے آپ کو ذمہ داریوں سے بچانے کے لیے، اختیار کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ عام طور پر لوگ معاشرہ سے متعلق اپنی ذمہ داری کی حقیقی نوعیت سے آگاہ ہی نہیں ہیں۔ وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ اسلام نے ہر شخص پر اصلاح کی دوہری ذمہ داری ڈالی ہے۔ ایک خود اس کی اپنی ذات سے متعلق ہے اور دوسری اپنے علم و استعداد کی حد تک، اپنے کنبہ، اپنے قبیلہ اور اپنے معاشرہ کی اصلاح سے متعلق ہے۔ اور اس ذمہ داری کی اہمیت اس قدر ہے کہ ایک شخص خود اپنی تعلیم و تربیت سے بے پروائی کی

سزا جس طرح دنیا میں بھگتتا ہے اور آخرت میں بھگتے گا، اسی طرح اگر وہ معاشرہ کی اصلاح اور اس کی تعلیم و تربیت سے بے پروائی اختیار کرلے تو اس کی سزا دنیا میں بھی بھگتے گا اور آخرت میں بھی۔ ہم یہاں چند حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے اس فرض کی حقیقی اہمیت واضح ہوگی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: من رای منکرًا فلیکرہ بیدہ. و من لم یستطع فبلسانہ. ولم یستطع فبقلبہ. و ذالک اضعف الایمان.
(سنن الترمذی: کتاب الفتن باب ۱۱)

میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جو شخص بھی تم میں سے کوئی بگاڑ دیکھے تو اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے اگر اس کی طاقت رکھتا ہو۔ اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اور اگر زبان سے بھی اس کی اصلاح کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل سے اس کو برا سمجھے۔ اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

انّ رسول اللہ ﷺ قال: ما من نبی بعثہ اللہ فی امۃ قبلی الا کان لہ من امتہ حواریّون و اصحاب یاخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ. ثم انھاتخلف من بعدھم خلوف یقولون ما لا یفعلون ویفعلون ما لا یؤمرون. فمن جاھد ھم بیدہ فھو مؤمن و من جاھد ھم بلسانہ فھو مؤمن و من جاھد ھم بقلبہ فھو مؤمن. ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل.
(صحیح مسلم: کتاب الایمان باب ۲۰)

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جتنے پیغمبر بھی مجھ سے پہلے گزرے ہیں، ان کی امتوں میں ان کے جان نثار اور ان کے صحابی ہوتے رہے ہیں جو ان کی سنت کی پیروی اور ان کے احکام کی اقتدا کرتے رہے ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین پیدا ہوئے جو کہتے تھے وہ کچھ جو کرتے نہیں تھے اور کرتے تھے وہ کام جن کا ان کو حکم نہیں ملا ہوا تھا۔ تو ایسوں سے

جس نے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن، جس نے ان سے دل سے جہاد کیا وہ مومن اور جس نے ان سے زبان سے جہاد کیا وہ مومن۔ اس کے پیچھے ایمان کا کوئی درجہ رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قال النبی ﷺ: مثل المدھن فی حدود اللّٰہ والواقع فیھا مثل قوم استھموا سفینۃ. فصار بعضھم فی اسفلھا وصار بعضھم فی اعلاھا. فکان الذی فی اسفلھا یمرّون بالماء علی الذین فی اعلاھا فتاذّوا بہ فاخذ فاسا فجعلَ ینقر اسفل السفینۃ. فاتوہ فقالوا: مالک؟ قال: تاذیتم بی ولا بدّلی من الماء. فان اخذو علی یدیہ انجوہ و نجوا انفسھم و ان ترکوہ ھلکوہ و اھلکوا انفسھم. (صحیح البخاری: کتاب الشھادات باب ۳۰)

نبی ﷺ نے فرمایا کہ حدودِ الٰہی کے معاملہ میں سستی کرنے والے اور ان کے اندر جا پڑنے والے کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کچھ لوگ ایک کشتی کے اوپر اور نیچے کے حصوں پر قرعہ ڈالیں۔ کچھ کے حق میں نیچے کا قرعہ نکلے اور وہ نچلے حصہ میں بیٹھیں اور کچھ اس کے اوپر والے حصہ میں بیٹھیں۔ نیچے والوں میں سے کسی کو پانی کی ضرورت پیش آئے تو اس کو اوپر والوں کے پاس سے گزرنا پڑے، جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں، یہ دیکھ کر کوئی نیچے والا کلہاڑا اٹھا کر کشتی کے پیندے ہی میں سوراخ کرنا شروع کردے۔ جب اوپر والے آ کر پوچھیں کہ یہ کیا؟ تو وہ جواب دے کہ ہمارے اوپر جانے سے آپ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور ہمارے لیے ناگزیر ہے تو اس کے سوا کیا چارۂ کار؟ اب اگر اوپر والے اس کا ہاتھ پکڑ لیں تو اس کو بھی بچائیں گے اور اپنے آپ کو بھی بچائیں گے اور اگر اس کو آزاد چھوڑ دیں گے تو اس کو بھی ہلاک کریں گے اور اپنے آپ کو بھی ہلاک کریں گے۔

حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کہ ہے:

عن النبی ﷺ انہ قال: انہ یستعمل علیکم امراء فتعرفون و تنکرون. فمن کرہ فقد برئ و من انکر فقد سلم. و لکن من رضی وتابع.
(صحیح مسلم: کتاب الامارۃ باب ۱۶)

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم پر ایسے لوگ حاکم بنائے جائیں گے جن سے معروف اور منکر دونوں طرح کی باتیں صادر ہوں گی۔ تو جس نے ان کی بری باتوں کو برا سمجھا تو وہ تو بری ہوا اور جس نے ان کی برائیوں کے خلاف آواز اٹھائی وہ سلامت رہا۔ البتہ ان کی خیر نہیں ہے جو راضی رہا اور جس نے ان کی پیروی کی۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عن النبی ﷺ قال: والذی نفسی بیدہ! لتامرنّ بالمعروف و لتنھون عن المنکر اولیوشکنّ اللّٰہ ان یبعث علیکم عقابا منہ ثم تدعونہ فلا یستجاب لکم. (سنن الترمذی: کتاب الفتن باب ۹)

نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کہ تم نیکی کی طرف دعوت دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا، ورنہ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور پھر تم اس کو پکارتے رہو لیکن تمہاری کوئی شنوائی نہ ہو۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

انّ النبی ﷺ قال: انّ من اعظم الجھاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر.
(سنن الترمذی: کتاب الفتن باب ۱۳)

کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ سب سے اعلیٰ جہاد کسی حق سے ہٹے ہوئے بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہہ گزرنا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

ایھا الناس! انکم تقرء ون ھذہ الآیۃ: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ ۚ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ. (المائدۃ۔ ۵: ۱۰۵) و انی سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: انّ الناس اذا رأوا الظالم فلم یاخذوا علٰی یدیہ اوشک ان یعمّھم اللّٰہ بعقاب منہ. (سنن الترمذی: کتاب الفتن باب ۸)

اے لوگو! تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو: [اے ایمان والو! تم اپنی فکر رکھو۔ اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا]۔ (یعنی اس آیت سے تم یہ غلط استدلال کرتے ہو کہ

آدمی پر بس اپنے ہی نفس کی اصلاح کی ذمہ داری ہے، دوسروں کی کوئی ذمہ داری اس کے سر نہیں ہے۔) میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں لیکن اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ ان پر کوئی ایسا عذاب بھیج دے جس کی لپیٹ میں سب ہی آ جائیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قال رسول اللّٰہ ﷺ: من سئل عن علم فکتمہ الجمہ اللّٰہ بلجام من نار یوم القیامۃ. (سنن ابی داؤد: کتاب العلم باب ۹)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا ہے لیکن اس نے چھپائی تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے منہ میں آگ کی لگام لگائے گا۔

ان حدیثوں پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ دین کی باتوں کو آشکارا کرنا، لوگوں کی جہالت کو دور کرنا، مخالف اسلام حرکتوں کے خلاف خطرات سے بے پروا ہو کر آواز اٹھاتے رہنا اور جو کچھ حق ہے بے خوف لومۃ لائم لوگوں کو بتاتے رہنا صرف ایک نفلی نیکی نہیں ہے بلکہ ہر شخص پر اس کی صلاحیت اور استعداد کے لحاظ سے یہ واجب ہے۔ اگر کوئی شخص علم اور صلاحیت رکھتے ہوئے برائیوں کی اصلاح کی کوشش نہیں کرے گا تو وہ جرم اور اس کی سزا دونوں میں اصلی مجرمین کا شریک ٹھہرے گا۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ شخص ہوگا جو ہاتھ اور زبان سے اصلاح کی سرے سے طاقت ہی نہ رکھتا ہو۔ ایسے اشخاص سے اسلام کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ وہ برائی کو برائی سمجھتے رہیں اور اپنے آپ کو اس سے دور رکھیں۔

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی شخص محض خیالی اندیشوں یا محض معمولی مشکلات وخطرات کا بہانہ بنا کر اپنے آپ کو اصلاح معاشرہ کی ذمہ داریوں سے بری نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ بعض اوقات معاشرہ اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ اس کی اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر ایک شخص اصلاح کی کوشش نہ کرے تو اس کو معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن معاشرہ کا ہر درجہ کا بگاڑ وہ بگاڑ نہیں ہے جس کی آڑ لے کر ایک شخص گھر میں بیٹھ رہے اور یہ اعلان کر دے کہ لوگوں کے حالات اس درجہ خراب ہو چکے ہیں کہ ان کی اصلاح وتعلیم میں وقت

ضائع کرنے کے بجائے اب خانہ نشین ہو جائے اور صرف اپنے ایمان و اسلام کے سنبھالنے کا وقت آگیا ہے۔ اسلام نے معاشرے کے بگاڑ کی وہ حد خود بتا دی ہے جس کے بعد ایک شخص کے لیے یہ بات جائز ہو جاتی ہے کہ وہ عوام کی اصلاح کی ذمہ داری سے کنارہ کش ہو کر صرف اپنے ہی دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرے۔ وہ حد یہ ہے کہ معاشرے میں سرے سے دین کی کوئی رمق باقی ہی نہ رہ گئی ہو، ہر شخص حقوق ادا کرنے کے بجائے حرص و طمع کو معبود بنائے بیٹھا ہو، شریعت کے بجائے ہر جگہ خواہشات کی پیروی ہو رہی ہو، ہر جگہ دین پر دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہو، ہر شخص اپنی اپنی رائے اور اپنے اپنے خیال میں مگن ہو اور کسی کی بہتر سے بہتر بات بھی سننے کے لیے تیار نہ ہو۔ یہاں تک کہ یہ بات نہایت واضح طور پر نظر آنے لگے کہ اب اس معاشرہ کو بدلنا تو ممکن نہیں ہے البتہ یہ خطرہ نہایت قوی ہے کہ آدمی اگر اس کے اندر پڑا رہا تو خود تبدیل ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں ایک شخص کے لیے بے شک یہ بات جائز ہے کہ وہ لوگوں کو چھوڑ کر صرف اپنا ایمان بچانے کی کوشش کرے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے:

حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ سے عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (المائدۃ۔۵:۱۰۵) (اے ایمان والو! تم اپنی فکر رکھو۔ اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا) والی آیت کے بارے میں روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> اما واللّٰہ لقد سألت عنها رسول الله ﷺ فقال: بل ائتمروا بالمعروف و تناهوا عن المنكر. حتّٰى اذا رايت شحاً مطاعاً و هوًى متبعاً و دنيا مؤثرةً و إعجابَ كلِّ ذي رأي برأيه فعليك بخاصة نفسك و دع العوامَ.
> (سنن الترمذی: کتاب تفسیر القرآن باب ۶)

خدا کی قسم! میں نے اس آیت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا (سوال غالباً یہی ہوگا کہ لوگ عام طور پر اس آیت سے دلیل لاتے ہیں کہ ہر آدمی پر صرف اس کے اپنے ہی نفس کی ذمہ داری ہے) تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کو معروف کی تعلیم دو اور منکر سے روکو۔ ہاں! جب دیکھو کہ بخل مسلط ہو چکا ہے، خواہشات کی پیروی ہو رہی ہے، دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے، ہر صاحب رائے اپنی رائے پر فریفتہ ہے اور تمہیں یہ بھی صاف نظر آنے لگے کہ اب تمہیں خود اپنے ایمان کے

بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے تو بس اپنے کو بچاؤ اور عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

ایک اور حدیث میں یہ حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

> انّ رسول الله ﷺ قال: كيف بكم و بزمان او يوشك ان ياتي زمانٌ يغربل الناس فيه غربلة تبقى حثالة من الناس قد مرجت عهودهم و اماناتهم و اختلفوا فكانوا هكذا وشبک بين اصابعه. فقالوا: و كيف بنا يا رسول الله؟ قال: تاخذون ما تعرفون و تذرون ما تنكرون و تقبلون على امر خاصتكم و تذرون امر عامتكم. (سنن ابی داؤد: کتاب الملاحم باب ۱۷)

کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت تم کیا کرو گے جب تمہیں ایسے لوگوں کے اندر زندگی گزارنی پڑے گی جو بالکل بھوک کی مانند ہوں گے، نہ ان کے اندر عہد کا کوئی احساس ہوگا، نہ امانت کا، اور ان کے اندر جھگڑے اور اختلافات برپا ہو جائیں گے جس کے سبب سے وہ اس طرح (ہاتھ کے اشارے سے آپؐ نے سمجھایا) ہو جائیں گے۔ تو لوگوں نے پوچھا: ایسے حالات کے لیے آپؐ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو جو معروف ہے اس پر عمل کرو اور جو منکر ہے اس سے بچو۔ اپنی ذات کی فکر کرو اور عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

اس مضمون کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہی بات اجمال اور تفصیل کے مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ آدمی کو عوام کی اصلاح سے بے تعلق ہونے کی اجازت صرف اس صورت میں ہے جب وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے کہ اب لوگوں کے اندر کوئی اچھی بات سننے اور قبول کرنے کی سرے سے کوئی صلاحیت باقی ہی نہیں رہ گئی ہے اور ان کو پانے کی کوشش میں اندیشہ ہے کہ کہیں وہ خود اپنے آپ کو نہ کھو بیٹھے۔

اوپر والی حدیث میں حثالة کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بھوک، چھلکے، بھوسی اور ایسی ردی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے اب کچھ حاصل ہونے کی توقع نہ ہو۔ یعنی لوگ بالکل ہی

بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئے ہوں۔

خوف اور طمع

دوسری چیز جو آدمی کو جانتے بوجھتے امر حق کے اظہار و بیان سے روک دیتی ہے وہ طمع یا خوف ہے۔ جن لوگوں سے آدمی اپنا کوئی دنیوی مفاد وابستہ کر لیتا ہے یا جن سے اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ان کی خواہشات کے خلاف اس نے کوئی بات زبان سے نکالی تو وہ اس کو نقصان پہنچاویں گے، ان کے سامنے کسی ایسے حق کا اظہار جو ان کو پسند نہ ہو ایک کمزور آدمی کے لیے نہایت دشوار ہے۔ ہمارے اندر کتنے واعظ اور خطیب ہیں جو مسجدوں کے منبروں پر چڑھ کر گھنٹوں داد خطابت دیتے ہیں لیکن وہ کوئی ایسی بات زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں کرتے جس کو ان کے سامعین پسند نہ کرتے ہوں اگرچہ دین کے اندر وہ بات کتنی ہی پسندیدہ اور مسلمہ حقیقت کیوں نہ ہو۔ کتنے عالمان دین ہیں جو دین کی فروعی باتوں پر تو روز مباحثے اور مناظرے کے مورچے قائم کرتے پھرتے ہیں لیکن جانتے بوجھتے ان مخالف دین بلکہ ہادم دین سرگرمیوں کے مقابل میں بالکل گونگے بہرے بن جاتے ہیں جن کے متعلق ان کو اندیشہ ہو کہ اگر ان کے خلاف زبان ہلائی تو ارباب اقتدار کی ناراضگی مول لینی پڑے گی۔ کتنے دینی مدارس ہیں جو کھولے تو جاتے ہیں دین کی تعلیم و تبلیغ کے نام پر لیکن وہ اصل دین کے علاوہ ان لوگوں کی خوشنودی اور رضا جوئی کا اہتمام کرتے ہیں جو ان کو چندہ دیتے ہیں اور ان کی سرپرستی کرتے ہیں۔ یہی حال عام طور پر مصنفوں اور مؤلفوں کا ہے۔ یہی رنگ ادیبوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کا ہے۔ حد یہ ہے کہ یہی انداز عام طور پر تزکیہ نفس کرنے والے مزکیوں اور مرشدوں کا بھی ہے۔ وہ بھی اپنے روحانی مریضوں کے علاج اور پرہیز دونوں میں استیصال مرض سے زیادہ مریضوں کی پسند و ناپسند اور ان کی خواہشوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور ان باتوں کو بیماری کہنے کے بجائے صحت ہی کہنا پسند کرتے ہیں جن کو بیماری کہنا کم از کم ان کے مالدار اور بااثر مریدوں کو ناگوار ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام صورتوں میں حق پوشی کی اصلی وجہ صرف طمع ہے۔ چنانچہ جناب کعب الاحبارؓ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ علماء کے سینوں سے علم کو کس چیز نے نکالا؟ انہوں نے جواب

دیا کہ طمع نے۔ (سنن دارمی)

اس تمام کتمان علم کو مصلحت بینی پر محمول کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس جہل و فساد کے زمانہ میں لوگوں کو سارا دین بتانے کی کوشش کی جائے تو لوگ اس کا بوجھ سہار نہ سکیں گے بلکہ اندیشہ ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ بھی چھوڑ بیٹھیں۔ بعضوں کے نزدیک دین کے ان اجزاء کا بیان کرنا، جن کو ارباب اقتدار پسند نہیں کرتے، ان سے ٹکر لینے کے ہم معنی ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی خارجیت ہے۔ بعض حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ جن امور میں مسلمان ایک خاص پہلو پر جم چکے ہیں، اگرچہ وہ غلط ہی سہی، اب ان پر کلام کرنا لوگوں کے ذہنوں کو تشویش میں ڈالنا ہے۔ الغرض مختلف مصلحتیں ہیں جن کو اس علم پوشی کے لیے بہانہ بنایا جا رہا ہے، حالانکہ یہی جھوٹی مصلحت پرستیاں اور بہانہ بازیاں ہیں جنہوں نے معاملہ کو اس حد تک خراب کیا ہے۔ مصلحت کی اہمیت سے ہم کو انکار نہیں ہے لیکن دین کی مصلحت اور اپنی ذاتی مصلحت میں بڑا فرق ہے۔ دین کی مصلحت پر نگاہ رکھنے والے تو یہ سوچتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہر بات بہر حال ہمیں لوگوں تک پہنچانی ہے، البتہ یہ لحاظ رکھنا ہے کہ ہر بات صحیح وقت پر، صحیح طریقہ سے، صحیح مخاطب کو پہنچے۔ لیکن جو لوگ صرف اپنی ذاتی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہیں وہ ہمیشہ سے یہ دیکھتے ہیں کہ کن باتوں کا بتانا اور سکھانا ہمارے مصالح کے موافق ہوگا اور کن باتوں کے اظہار سے ان مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روش خدا کے دین کے ساتھ صریح چالبازی ہے اور اگر کوئی شخص اس کو مصلحت کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے تو درحقیقت صریح منافقت کو مصلحت کا نام دینا چاہتا ہے۔

مسلمانوں سے اللہ کے رسول ﷺ نے جن باتوں پر عہد لیا ہے، حضرت عبادہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق ان میں ایک نہایت اہم بات یہ بھی شامل ہے کہ:

> و علی ان نقول بالحق اینما کنا. لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم.
> (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ باب ۸)
>
> اور اس بات پر ہم نے بیعت کی کہ ہم حق کہیں جہاں کہیں بھی ہوں۔ اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ کریں۔

اس حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے معاشرہ کے ان لوگوں کے حالات کا جائزہ لیجیے جن پر حق

کے اظہار و اعلان کی اصلی ذمہ داری ہے کہ وہ کس حد تک اس کو نباہ رہے ہیں۔ حدیث تو منبر سے لے کر دار تک اور مدرسہ و مسجد سے لے کر بادشاہوں کے دربار تک ہر جگہ حق کے اعلان کا مطالبہ کر رہی ہے لیکن یہاں حال یہ ہے کہ لوگ دین کے معاملہ میں بڑی بڑی دھاندلیاں دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ دھاندلی ہے، ظلم ہے، بہتان ہے لیکن ان کے خلاف محض اس اندیشہ سے زبان نہیں کھولتے کہ کہیں اپنے گروہ اور برادری سے خارج نہ کر دیے جائیں یا اپنے حلقہ کے لوگوں کے طعن و تشنیع کا انہیں ہدف نہ بننا پڑے۔

سنن ترمذی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے ایک طویل حدیث نقل ہوئی ہے جس کے مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ:

> الا! لا یمنعنّ رجلاً منکم ھیبة الناس ان یقول بحق اذا علمه.
> یاد رکھو! جب تم ایک حق کو جانتے ہو تو لوگوں کا خوف اور رعب تمھیں اس کے اظہار سے مانع نہ ہو۔
>
> قال: فبکی ابو سعید فقال: قد واللّٰه! رأینا اشیاء فھبنا.
> (سنن الترمذی: کتاب الفتن باب ۲۶)
> راوی کہتے ہیں کہ یہ بیان کر کے جناب ابو سعیدؓ رونے لگے کہ خدا کی قسم! آج ہم منکر چیزیں دیکھ رہے ہیں لیکن ہم لوگوں سے خوفزدہ ہو گئے ہیں۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ اس زمانہ کے حالات پر نگاہ کر کے رونے لگے جبکہ حق کی پامالی اور مظلومی کے واقعات کہیں شاذ و نادر ہی مشاہدہ میں آتے تھے اور اگر آتے بھی تھے تو جان کی بازیاں کھیل کر اس حق کی حمایت و نصرت کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے بھی معاشرے میں کم نہیں تھے۔ بنو امیہ کے دور میں بعض سفاکوں کی خون آشامی ضرب المثل رہی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر حق کے لیے اتنے بے شمار سر کٹنے کے لیے موجود نہ ہوتے تو ان سفاکوں کی خون آشامی کو یہ شہرت دوام کہاں سے حاصل ہوتی؟ البتہ رونے کا زمانہ آج ہے جبکہ حق پوشی ہی کو دین بنا لیا گیا ہے اور مطعون وہ نہیں کیے جاتے جو حق کو قتل کرتے یا اس کو چھپاتے ہیں بلکہ وہ لوگ کیے جاتے ہیں جو حق کے اظہار و اعلان کی جرأت کرتے ہیں۔

بے حمیتی

کتمان علم یا کتمان حق کا ایک سبب بے حمیتی اور بے غیرتی بھی ہے۔ حق اور علم حق ایک متاع مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ہر شخص کے اندر ان کی حفاظت اور ان کی حمایت و نصرت کے لیے غیرت و حمیت ہونی چاہیے۔ اللہ اور رسول ﷺ نے علم و عرفان کے جو چراغ جلائے ہیں وہ بلا تخصیص و امتیاز سب کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہیں، اس وجہ سے اگر ان میں سے کوئی چراغ بھی گل کیا جا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سب کو روشنی سے محروم کیا جا رہا ہے۔ پس ہر شخص کا فرض ہے کہ ان چراغوں کی حفاظت کرے اور اگر دیکھے کہ کوئی شخص ان کو گل کر رہا ہے تو یہ سمجھے کہ گویا اس کے اپنے ہی گھر کا دیا گل کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو حقوق قائم کر دیے ہیں، جو حدود مقرر کر دیے ہیں اور ہماری سلامتی کے لیے جو قوانین بنا دیے ہیں وہ سب بھی متاع مشترک کی نوعیت رکھتے ہیں۔ اس کی بقا میں سب کی بقا اور ان کی بربادی میں سب کی بربادی ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے امکان کی حد تک ان کی حفاظت کرے اور ان کو کوئی نقصان نہ پہنچنے دے۔ اگر ایک شخص کا مال لٹتا ہے لیکن پاس پڑوس کے لوگ اس کی حمایت کے لیے نہیں اٹھتے، ایک شخص اگر قتل کر دیا جاتا ہے لیکن علم رکھنے والے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی مدد نہیں کرتے، اگر ایک عفیفہ کی آبرو سر بازار لٹتی ہے لیکن دیکھنے والے دم سادھ لیتے ہیں، نہ مظلومہ کو بچانے کے لیے اٹھتے ہیں اور نہ ظالم کے مقابل میں شہادت ہی دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں، اگر دین و شریعت کے اصولوں کی بھری مجلس میں توہین ہو رہی ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے لیکن مجلس کے بڑے بڑے ثقات کے کانوں پر بھی غیرت کی جوں نہیں رینگتی تو صاف الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے اندر خود اپنی غیرت، خود اپنے ناموس اور خود اپنی جان و مال کے لیے بھی کوئی احساس غیرت باقی نہیں رہا ہے اور وہ اس بات پر راضی ہیں کہ خود ان کی ماؤں یا بہنوں یا بیٹیوں کی عزت و آبرو خود ان کے سامنے لٹے اور وہ اس تماشا کو دیکھیں۔
قرآن مجید نے حق کے متاع مشترک ہونے کے اسی اصول کی بنیاد پر یہ فرمایا ہے کہ:

> أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ط

وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط (المائدۃ ۔۵:۳۲)

کہ جس نے کسی کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا تو گویا سب کو بچایا۔

غور کیجیے کہ قاتل اگر کسی کو ناحق قتل کر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ سب کو کس طرح قتل کر دیتا ہے اور اگر ایک شخص کسی کو ناحق قتل ہونے سے بچا لیتا ہے تو وہ سب کو کس طرح زندہ بچا لیتا ہے؟ وہ اس طرح کہ درحقیقت وہ حرمت جان کے اس مقدس اور ابدی قانون کو قتل کر دیتا ہے جو سب کی جانوں کا محافظ ہے اور ایک بچا لینے والا اس قانون کی حفاظت کرتا ہے جس کی حفاظت میں سب کے لیے امان ہے۔ اس سے یہ بات لازمی طور پر نکلتی ہے کہ کسی معاشرہ کے اندر ہر قتل، ہر بے آبروئی اور ہر ظلم کو انفرادی حیثیت میں دیکھنے کے بجائے اس کو اجتماعی حیثیت میں دیکھا جانا چاہیے، گویا ہر شخص قتل ہوا، ہر شخص کی بے ناموسی ہوئی، ہر شخص پر ظلم ہوا اور پھر اسی حیثیت سے اس کے خلاف پورے معاشرے کے اندر ایک کھلبلی پائی جانی چاہیے۔ اگر یہ کھلبلی نہ پیدا ہو تو یہ چیز پورے معاشرہ کی بے حسی اور بے حمیتی کی دلیل ہے۔ اور ایسے معاشرہ کے اندر نیکی اور سچائی کے تمام نشانات یکے بعد دیگرے معدوم ہو کے رہتے ہیں اور پھر سب کے سب ظلم، جہالت اور تاریکی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر گھر جاتے ہیں۔

یہ بے حمیتی مختلف صورتوں میں معاشرہ پر چھاتی ہے۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور وہ بتدریج ہر شعبۂ زندگی پر چھانے لگتا ہے لیکن وہ لوگ جو بگاڑ کی اصلاح کر سکتے ہیں، اپنے انفرادی تزکیہ میں لگے رہتے ہیں، ان کی آنکھوں کے سامنے ہر طرح کے فسق و فجور کے ہنگامے برپا ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے مسند و سجادہ کے حدود سے باہر جھانک کر بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اللہ کی شریعت کی ہر جگہ علانیہ بے حرمتی ہوتی ہے لیکن یہ اپنے حال میں مست پڑے رہتے ہیں، ان کی پیشانی پر غیرت کی ایک لہر بھی نہیں اٹھتی۔ جب معاملہ اس حد کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے معاشرہ پر اپنا غضب نازل فرماتا ہے اور پھر اس وقت جس طرح اصلی مجرمین پر خدا کا غضب بھڑکتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ان اتقیاء و زہاد پر یہ غضب بھڑکتا ہے جن کی ناک کے نیچے یہ سارا فساد پرورش پاتا رہا اور وہ گونگے بہرے بنے ہوئے اس کا

تماشا دیکھتے رہے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو:

عن جابر قال: قال رسول اللہ ﷺ: اوحی اللہ عزّ و جلّ الی جبریل علیہ السّلام ان اقلب مدینۃ کذا و کذا باھلھا. فقال: یا ربّ! ان فیھم عبدک فلاناً لم یعصک طرفۃ عین؟ قال: فقال: اقلبھا علیہ و علیھم فان وجھہ لم یتمعّر فی ساعۃ قطّ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم بھیجا کہ فلاں بستی کو اس کے باشندوں سمیت الٹ دو! جبریلؑ نے عرض کی کہ اے رب! اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی تیری نافرمانی نہیں کی؟ حکم ہوا کہ اس پر اور تمام دوسروں پر اس کو الٹ دو کیونکہ اس شخص کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر تھوڑی دیر کے لیے بھی تمتمایا نہیں!

اس کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتے دیکھ کر جو لوگ اس کی اصلاح کی صلاحیت رکھنے والے ہوتے ہیں وہ اصلاح کے لیے اٹھتے تو ہیں لیکن ان کے اندر وہ لگن نہیں ہوتی جو اس میدان میں اترنے والوں کے اندر ہونی چاہیے۔ وہ اس راہ کی مشکلات کے مقابلہ کے لیے اپنے اندر دم داعیہ نہیں رکھتے، ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کی اصلاح تو ہو لیکن اس طرح کہ نہ تو کسی کی ناراضگی مول لینی پڑے اور نہ کوئی نقصان اٹھانا پڑے۔ وہ سانپ کو تو مارنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے اپنی عصائے مقدس کو قربان نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی عام روش یہ ہوتی ہے کہ وہ وعظ کی مجلسوں میں وعظ فرما دیتے ہیں، درس کے حلقوں میں قرآن و حدیث کا درس دے دیتے ہیں، معاشرہ کی برائیوں پر کبھی کبھی چبھتے ہوئے کچھ طنز بھی فرما جاتے ہیں، کبھی کبھی مرشدانہ انداز میں کچھ دردمندانہ نصیحتیں بھی سنا جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس رو میں بہے چلے جاتے ہیں جس رو میں سب بہہ رہے ہوتے ہیں۔ ان کے بہنے اور دوسروں کے بہنے میں اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو بس یہ ہوتا ہے کہ دوسرے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو بہاؤ کے رخ پر ڈال دیتے ہیں اور یہ بہنے والوں کے ساتھ بہتے ہوئے کبھی کبھی یہ بھی یاددہانی کرتے جاتے ہیں کہ "ہم کہتے نہ تھے کہ یہ تم غلاظت میں بہے جا رہے ہو؟" ظاہر ہے کہ اگر اصلاح کی محض خواہش

ہی خواہش ہو، برائیوں کے خلاف حق کی حمایت کے لیے وہ بچی تمیت نہ ہو، جو آدمی کو اس بات پر مجبور کردے کہ اگر لوگ غلط سمت میں بگٹٹ چلے جا رہے ہیں تو وہ هـذا فـراق بـيـنـي و بـيـنـک کہہ کر اپنی راہ بدل لے اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرے کہ اس کے کن کن مفادات پر زد پڑتی ہے تو اس خواہش اصلاح کا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟ اور وہ اپنے آپ کو اس انجام سے کس طرح بچا سکتا ہے جو اس طرح کے بگاڑ کے لیے مقدر ہے؟

عن عبدالله بن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ : ان اول ما دخل النقص على بنى اسراء يل كان الرجل يلقى الرجل فيقول: يا هذا! اتق الله و دع ماتصنع فانه لا يحلّ لک. ثم يلقاه من الغد فلا يمنعه ذالک ان يكون اكيله و شريبه وقعيده. فلما فعلوا ذالک ضرب الله قلوب بعضهم ببعض. ثم قال: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ○ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○ (المائدۃ۔۵: ۷۸۔۸۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں بگاڑ کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب کوئی شخص کسی ایسے شخص سے ملتا جو کسی برائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا تو وہ اس سے کہتا: اے فلاں! اللہ سے ڈرو اور یہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باز آ جاؤ، یہ بات تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔ لیکن جب وہ دوسرے دن اس سے ملتا اور دیکھتا کہ وہ اپنی اسی روش پر قائم ہے تو اس کے اندر اتنی غیرت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ کھانے پینے اور مل بیٹھنے میں اس کا ساتھی بننے سے انکار کر دے۔ جب لوگوں نے یہ کرنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک کے دل کی سیاہی دوسرے کے دل پر بھی تھوپ دی۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں: [بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت ہوئی۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔

جس برائی کو اختیار کر لیتے اس سے باز نہ آتے۔ نہایت ہی بری بات تھی جو یہ کرتے تھے۔ تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ نہایت برا توشہ ہے جو انہوں نے اپنے لیے بھیجا کہ خدا کا ان پر غضب ہوا اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے بنے۔ اگر یہ اللہ پر، نبی پر اور اس پر جو اس کی طرف اترا، ایمان رکھنے والے ہوتے تو ان کفار کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے تو اکثر نافرمان ہیں۔]

ثم قال: كلا والله! لتأمرنّ بالمعروف و لتنهون عن المنكر ولتاخذنّ على يدى الظالم ولتاطرنه على الحق اطرًا ولتقصرنه على الحق قصرًا.

(سنن ابی داؤد: کتاب الملاحم باب ۱۷)

پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز نہیں! خدا کی قسم! یا تو یہ ہوگا کہ تم نیکی کا حکم دو گے، برائی سے روکو گے، ظالموں کا ہاتھ پکڑو گے اور انہیں حق پر قائم رہنے پر مجبور کر دو گے یا یہ ہوگا کہ تم میں سے ایک کے دل کی سیاہی دوسرے کے دل پر بھی چھا جائے گی۔

یہی حدیث ترمذی میں بایں الفاظ وارد ہوئی ہے:

عن عبد اللّه بن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ : لما وقعت بنو اسراء يل فى المعاصى نهتهم علماء هم. فلم ينتهوا. فجالسوهم فى مجالسهم واكلوهم و شاربوهم فضرب الله قلوب بعضهم ببعض و لَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ قال: فجلس رسول الله ﷺ وكان متكئًا فقال: لا! والذى نفسى بيده! حتّٰى تاطروهم على الحق اطرًا. (سنن الترمذی: کتاب تفسیر القرآن باب ۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بنی اسرائیل برائیوں میں مبتلا ہونے لگے تو شروع شروع میں ان کے علماء نے ان کو روکا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو باز ہی نہیں آتے تو انہوں نے ان کی مجلسوں میں اٹھنا بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک گروہ کے دلوں کی سیاہی دوسرے گروہ کے دلوں پر بھی تھوپ دی اور ان پر لعنت کی۔ (داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے)۔ راوی

فرماتے ہیں کہ: نبی ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تھے، یہ فرماتے ہوئے آپ اٹھ بیٹھے اور پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: نہیں، اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے! جب تک تم انھیں حق کی طرف موڑ نہ دو اس وقت تک خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

ان حدیثوں سے صاف واضح ہے کہ جس طرح وہ شخص بے حمیت اور خدا کی لعنت کا مستحق ہے جو سرے سے معاشرے کے اندر ابھرنے والی برائیوں کے خلاف زبان ہی نہیں کھولتا اسی طرح وہ شخص بھی بے حمیت اور غضب الٰہی کا مستحق ہے جو زبان تو برائیوں کے خلاف کھولتا ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی تنقیدیں لوگوں کا رخ پھیرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ غیرت کا ثبوت دے اور ان سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لے، انھی کا ہم نوالہ و ہم پیالہ بن جاتا ہے۔ اس طرح کے لوگ حق کا اظہار تو دبی زبان سے کرتے ہیں لیکن باطل کی تائید اپنے کھلے عمل سے کرتے ہیں۔ اس وجہ سے خدا کے ہاں ان کی ان بے جا تنقیدوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ ان کا شمار بھی کاتمین حق ہی میں ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جتنا کتمان حق اس طرح کے لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے اتنا شاید دوسروں کے ہاتھوں نہیں ہوا ہے۔

مداہنت

کتمان حق کا چوتھا سبب مداہنت اور چشم پوشی ہے۔ آدمی جن لوگوں سے قرابت و رشتہ داری رکھتا ہے، جن سے اس کے دوستانہ روابط ہوتے ہیں، جن کو وہ اپنے خاندان اور برادری کا سمجھتا ہے یا جن کے لیے اس کے دل میں احترام و عقیدت کا جذبہ ہوتا ہے، بسا اوقات ان کے سامنے وہ اظہار حق میں کمزور پڑ جاتا ہے۔ وہ ایک معاملہ میں صاف جانتا ہے کہ حق کیا ہے لیکن محض اس وجہ سے وہ سچی شہادت دینے سے یا تو کترا جاتا ہے یا صریح جھوٹ بول دیتا ہے کہ معاملہ اس کے کسی عزیز و قریب یا دوست یا خاندان کے آدمی کا ہے۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے ایک کھلی ہوئی کمزوری بلکہ صریح نافرمانی اللہ اور رسول کی دیکھتا ہے لیکن چپ سادھے رہتا ہے کیونکہ معاملہ اس کے اپنے بیوی بچوں اور عزیزوں کا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ صاف جانتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس کے شیخ یا استاد یا مرشد سے صریح زیادتی ہو رہی ہے لیکن وہ محض اس وجہ سے ٹوکنے کی جرأت نہیں کرتا کہ

اپنے استاد یا مرشد کو کیا کہے اور کیسے کہے؟

اس طرح کے لوگوں کے ذہن کا اور ان کے اس طرز عمل کا تجزیہ کیا جائے تو چند باتیں نہایت آشکارا ہو کر سامنے آتی ہیں: ایک تو یہ کہ اس طرح کے لوگ سچی خیر خواہی اور جھوٹی محبت میں امتیاز نہیں کرتے، دوسری یہ کہ یہ خدا کے مقابل میں شیطان پر زیادہ بھروسا رکھتے ہیں، تیسری یہ کہ یہ ارادت و عقیدت کے تقاضوں کو حق سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں۔

ایک شخص اگر اپنے کسی بچے یا کسی عزیز میں ایک خطرناک مرض کے آثار پا رہا ہو لیکن وہ محض اس خیال سے اس کو زبان پر نہ لائے یا اس کے علاج کی فکر نہ کرے کہ یہ چیز اس کی طبیعت پر بار ہوگی اور اس کو انجیکشن اور آپریشن کے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑے گا تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ محبت کا تقاضا تو ہے لیکن یہ محض ایک جھوٹی محبت ہے جس کے نتائج نہایت خطرناک ہیں۔ سچی محبت یا بالفاظ دیگر خیر خواہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں اس کا نوٹس لیا جائے اور قبل اس کے کہ اس کی بیماری لاعلاج ہو جائے اس کا علاج کر ڈالا جائے اگرچہ یہ علاج کتنا ہی تکلیف دہ اور ناگوار کیوں نہ ہو۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح سمجھایا ہے کہ بجائے اس کے تمہاری مداہنت اور چشم پوشی سے بگڑ کر تمہارے اہل و عیال خدا کے سخت گیر ملائکہ کی گرفت میں آئیں اور دوزخ کا ایندھن بنیں، تمہاری سچی خیر خواہی اور سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ تم خود ہی اپنے احتساب اور اپنی تادیب کے نیچے رکھ کر ان کو خدا کی رحمت کا مستحق بناؤ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰۤىِٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

(التحریم۔۶:۶۶)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ جس پر درشت مزاج اور سخت گیر ملائکہ مامور ہوں گے۔ اللہ ان کو جو حکم دے گا اس کی تعمیل میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اور وہ وہی کریں گے جس کا ان کو حکم ملے گا۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے خدا اور اس کے قانون سے فرار اختیار کیا ہے تو بجائے اس کے کہ

ہم اس کے معاملہ میں جھوٹی شہادت دے کر یا سچی شہادت کو چھپا کر اس کو اللہ سے اور دور کر دیں اور خدا کے مجرم کی حمایت کر کے خود بھی مجرم ٹھہریں، خود ہمارے لیے بھی یہ ہے کہ ہم اس کو خدا اور اس کے قانون کے حوالہ کریں۔ اگر ہم اس کو خدا کے قانون سے بچانے کی ناجائز کوشش کرتے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اس کے معاملے میں خدا سے زیادہ شیطان کے اوپر اعتماد رکھتے ہیں اور اس کو شیطان کے حوالہ کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت کے الفاظ پر خوب اچھی طرح غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جائے گی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○

(النساء ۴:۱۳۵)

اے ایمان والو! حق پر جمے رہو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے۔ اگرچہ یہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات، تمہارے والدین اور تمہارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ حقدار ہے تو تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ۔ اور اگر کج کرو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ، جو کچھ تم کر رہے ہو، اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔

یعنی تمہاری شہادت بالکل بے لاگ لپیٹ ہونی چاہیے۔ اس میں اس وجہ سے کوئی فرق ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ایک شخص تمہارا عزیز اور رشتہ دار ہے اور دوسرا شخص نہیں ہے یا ایک شخص غریب ہے اور دوسرا مالدار ہے۔ کوئی شخص یگانہ ہو یا بیگانہ، امیر ہو یا غریب، خدا کا حق دونوں پر یکساں ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق پر مقدم ہے، اس وجہ سے بجائے اس کے کہ غربت و امارت اور یگانگی و بیگانگی کا لحاظ کر کے کسی پر خدا کا قانون چلایا جائے شہادت حق کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں پر اس کو یکساں چلایا جائے کیونکہ خدا کے قانون کے تحت مر جانا اس جینے سے کہیں بہتر ہے جو خدا کے قانون کے تحت نہ ہو۔

یہی حقیقت مخزومیہ عورت کے اس واقعہ سے واضح ہوتی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب مخزومیہ عورت نے چوری کی تو قریش کو اس کی بڑی فکر ہوئی۔ وہ اس امر پر غور کرنے لگے کہ اس کے بارے میں کوئی شخص رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کرے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بھلا ایسے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کے چہیتے اسامہ بن زیدؓ کے سوا کس کی مجال ہے کہ حضور ﷺ کے سامنے کچھ کہنے کی جرأت کر سکے؟ چنانچہ حضرت اسامہؓ نے حضور ﷺ سے گفتگو کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد کے باب میں سفارش کرنے آئے ہو؟ اس کے بعد آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں کو اسی چیز نے ہلاک کیا کہ جب ان کے اندر کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس سے چشم پوشی کر جاتے اور اگر کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے لیکن خدا کی قسم! میں تو اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتا!

اب ان لوگوں کے معاملے کو لیجیے جو شیخ یا استاد یا مرشد یا لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کو جانتے بوجھتے نظر انداز کرنے کی چند وجہیں ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر وجہ پر غور کیجیے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ ایک سے ایک بڑھ کر افسوس ناک بلکہ شرمناک ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ محسوس کریں کہ اپنے شیخ یا استاد یا لیڈر سے نہایت سخت قسم کی زیادتی ہو رہی ہے لیکن محض اس کا لحاظ اور احترام آپ کے لیے اس زیادتی کے خلاف زبان کھولنے سے مانع ہو۔ اگر یہ صورت ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ استاد یا شیخ کا احترام حق سے بھی زیادہ کرتے ہیں اور شیخ اور استاد کے احترام کے تقاضوں کو خدا کے اور رسول کے صریح مطالبات سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے کسی بزرگ میں کوئی غلطی صریحاً دیکھ تو رہے ہیں لیکن آپ کی کوئی چھوٹی یا بڑی غرض اس بزرگ سے وابستہ ہے جس کے سبب سے آپ کے منہ میں لگام لگی ہوئی ہے اور آپ اس کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر رہے ہیں۔ اگر یہ وجہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی غرض اور اپنے مطلب کو حق اور سچائی اور خدا اور رسول سب پر مقدم رکھتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو اپنے شیخ یا استاد کے علم اور تقویٰ پر اتنا بھروسا اور اس کی رائے پر اتنا گہرا اعتماد ہے کہ آپ محسوس تو کرتے ہیں کہ اس کا فلاں فعل یا فلاں قول بالکل حقیقت کے خلاف ہے لیکن محض اس خیال سے اس کو ٹوکنے سے احتراز کریں کہ ایک ایسا

صاحب علم وتقویٰ کوئی غلط کام کس طرح کر سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ میں ہی غلطی پر ہوں، اس وجہ سے خاموشی ہی بہتر ہے۔ اگر یہ وجہ ہے تو یہ وہی اندھی تقلید ہے جس میں مبتلا ہو کر لوگوں نے اپنے بزرگوں اور مشائخ کو ہم پایہ خدا یا بالفاظ دیگر اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنا ڈالا اور اس کے نتیجہ میں حق شناسی کی نعمت سے ایسے محروم ہوئے کہ سورج کی طرح چمکتا ہوا حق بھی ان کو نظر نہ آ سکا۔ اس کی چوتھی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے لیڈر یا مرشد کی غلطی اور کوتاہی جاننے کے باوجود محض سہل انگاری کے سبب سے حق نصیحت سے تغافل برت رہے ہوں۔ اگر یہ سبب ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا حق آپ پر سب سے بڑا ہے آپ اسی کے معاملے میں مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔ ایک شخص نے آپ کو تعلیم دی، آپ کی تربیت کی، آپ کو راہ پر لگایا لیکن جب اس نے خود کہیں ٹھوکر کھائی تو بجائے اس کے کہ آپ اس کو دوڑ کر سنبھالتے اور جھپٹ کر اٹھاتے، اس کو چھوڑ کر چلتے بنے۔ یہ ایک کھلی ہوئی ناسپاسی اور احسان فراموشی ہے۔ پانچویں اور آخری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اس کے ٹھوکر کھا کر گرنے ہی کے متمنی رہے ہیں اور جبکہ وہ گر چکا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کو سنبھالنے کی کوشش کرتے اس کو کیچڑ میں لت پت اور دلدل میں پھنسا ہوا دیکھ کر آپ مطمئن ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو یہ ایک بدترین خیانت اور سنگین ترین بے وفائی ہے جو کوئی شخص اپنے کسی بزرگ یا اپنے لیڈر کے ساتھ کر سکتا ہے۔

بہرحال اس میں سے جو وجہ بھی ہو اور انہی میں سے کوئی نہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے، ہر وجہ نہایت افسوسناک اور نہایت شرمناک ہے، بلکہ یہ کہنا بھی شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ عقیدے کے اعتبار سے ان کے ڈانڈے شرک سے ملتے ہیں اور اخلاق گراوٹ کے پہلو سے دیوثیت سے۔ پھر جب آدمی ان پر اس پہلو سے نگاہ ڈالتا ہے کہ ایک مرشد یا ایک پیشوا اور لیڈر کی غلطی محض ایک شخص ہی کی غلطی اور کوتاہی نہیں ہے بلکہ یہ ہزاروں اور لاکھوں کی غلطی اور خرابی کی موجب ہے، اس سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں، جماعتوں کی جماعتیں گمراہی کے راستے پر چل پڑتی ہیں، اور بالآخر قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں تو ان کی سنگینی سو گنی بلکہ ہزار گنی بڑھ جاتی ہے۔

باب ۱۰

بدعت، اس کے اسباب اور اس کا علاج

بدعت کی تعریف

بدعت نام ہے اس چیز کا جو دین کی نہیں ہے اور وہ دین میں لا گھسائی جائے۔ کسی چیز کے دین کی چیز ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ قرآن میں بیان ہوئی ہو۔ اگر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو کسی قابل اعتماد حدیث ہی میں آئی ہو، اگر حدیث میں بھی نہ ہو تو کم از کم قیاس واجتہاد سے یہی ثابت ہو کہ یہ بات قرآن وحدیث سے موافقت اور مناسبت ہی رکھتی ہے۔ اگر اس طرح کا کوئی تعلق بھی اس کا کتاب وسنت سے ثابت نہ پایا جائے تو پھر یہ بات دین کی بات نہیں ہو سکتی۔ اگر دین کے ساتھ اس کا خواہ مخواہ جوڑ ملانے کی کوشش کی گئی تو یہ بدعت ہوگی اور اس طرح کی ہر بدعت ضلالت اور گمراہی ہے۔

اس امر کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس طرح کی کوئی بات بدعت اسی صورت میں قرار پائے گی جب اس کا پیوند دین سے لگانے کی کوشش کی جائے۔ اگر دین سے اس کا جوڑ نہ ملایا جائے تو اس پر بدعت کا اطلاق نہ ہوگا۔ فرض کیجیے ایک شخص گانا سنتا ہے لیکن وہ اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ یہ چیز دین کا کوئی جزو ہے یا معرفت الٰہی کا کوئی ذریعہ ہے یا شریعت سے یہ ثابت ہے تو اس کے اس فعل کو بدعت نہیں کہیں گے کیونکہ اس نے اس چیز کا جوڑ دین سے نہیں ملایا ہے۔ اس کو شریعت کے احکام کی روشنی میں جانچیں گے اور فیصلہ کریں گے کہ اس کا یہ فعل جائز ہے یا ناجائز، اور اگر ناجائز ہے تو کس درجہ میں ناجائز ہے۔ لیکن اگر وہی شخص اپنے اس گانے سننے کے متعلق یہ

دعویٰ کر بیٹھے کہ یہ معرفت الٰہی کا کوئی ذریعہ یا تزکیہ نفس و اصلاح باطن کا کوئی نسخہ ہے تو اس سے سوال ہوگا کہ اس نے کتاب و سنت کی کس دلیل یا ان کے کس اشارہ سے یہ بات اخذ کی ہے؟ اگر وہ کسی نص یا اشارہ کا حوالہ دے گا تو اس کی روشنی میں اس کا فیصلہ ہوگا اور اگر وہ کوئی حوالہ نہ دے سکے بلکہ محض اپنے وجدان یا ذوق یا تجربہ کو اس کی دلیل ٹھہرائے تو یہ بدعت ہوگی کیونکہ وہ دین کے حرم میں ایک ایسی چیز گھسا رہا ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

یہاں سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے اس میں کوئی اضافہ یا ایجاد یا کوئی نئی راہ نکالنا یا نئی طرح ڈالنا بدعت کے تحت نہیں آتا۔ اس دائرے میں ہم آزاد ہیں کہ جو چاہیں اضافے کریں اور جس طرح کی چاہیں کیاں کریں۔ لیکن یہاں معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام میں دین اور دنیا کی اس قسم کی کوئی تفریق ہے بھی؟ اگر ہے تو ان کے درمیان وہ حد فاصل کیا ہے جس سے ایک شخص بغیر کسی اشتباہ کے معلوم کر سکے کہ یہ دین کے حدود ہیں اور یہاں سے دنیا کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں؟

دین اور دنیا کے حدود

اس سوال کے پہلے حصہ کا جواب تو یہ ہے کہ اسلام میں اس معنی میں تو دین اور دنیا کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے جس معنی میں عیسائیت میں ان کے درمیان تفریق ہے کہ شخصی زندگی کے ایک نہایت محدود گوشے کے سوا بقیہ ساری اجتماعی و سیاسی زندگی دین کے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ اسلام اس پہلو سے تو ایک کلیت پسند دین ہے کہ اس نے ہماری زندگی کے ہر حصے سے بحث کی ہے، خواہ وہ انفرادی ہو یا سماجی یا سیاسی، لیکن اس پہلو سے اس میں بھی دین اور دنیا کی تفریق موجود ہے کہ وہ ہمارے ہر گوشۂ زندگی کی ساری تفصیلات و جزئیات سے بحث نہیں کرتا بلکہ صرف ان کے چاروں گوشے متعین کر دیتا ہے، ان کو متعین کر دینے کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ ہم جس طرح چاہیں ان کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی رائے اور فکر کی آزادی استعمال کریں اور اپنی قوت ایجاد و اختراع کا مظاہرہ کریں۔

اس بات کو چند مثالوں سے سمجھیے۔

ہماری زندگی سے ایک بڑا قریبی تعلق رکھنے والا مسئلہ کھانے پینے کا مسئلہ ہے۔ اس میں اسلام نے دخل تو دیا ہے لیکن اس دخل کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ پہلے ساری کھانے پینے کی چیزوں کی تفصیل سنائی ہو، پھر یہ بتایا ہو کہ ان میں سے کیا کیا چیزیں جائز ہیں اور کیا کیا چیزیں ناجائز، پھر ان کے پیدا کرنے، ان کے سنبھالنے اور ان کے پکانے اور محفوظ رکھنے کی تدبیریں بتائی ہوں۔ اسلام کو ان تفصیلات سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اس نے صرف یہ کیا ہے کہ چند متعین چیزوں کو جو حرام ہیں بتا دیا کہ یہ حرام ہیں، ان کا کھانا پینا ناجائز ہے، اب جو چیزیں ان کے حکم میں آتی تھیں وہ آپ سے آپ ان کے تحت حرام یا مکروہ ہو گئیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ کی ساری چیزوں کو انسان کی طلب، اس کے ذوق اور اس کی قوت اکتساب و ایجاد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی طبعی ضرورتوں اور اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرے۔

اسی طرح ہمارے لباس کا مسئلہ ہے۔ اس بارے میں اس نے یہ کیا کہ چند اخلاقی نوعیت کی حدیں مقرر کر دیں۔ مثلاً یہ کہ لباس ساتر ہو۔ مرد مسرفانہ لباس، مثلاً ریشم کا استعمال نہ کریں۔ لباس سے شہدپن اور غنڈاپن کا اظہار نہ ہو، مثلاً تہمد یا شلوار زمین پر گھسٹتی ہوئی یا ٹخنوں سے نیچے نہ ہو۔ عورتیں مردوں کا سا یا مرد عورتوں کا سا لباس نہ پہنیں۔ بس اس طرح کی چند شرطیں عائد کر کے ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہم جس طرح کے کپڑے چاہیں ایجاد کریں، جس طرح کے چاہیں سلوائیں اور جس ڈھب سے انہیں چاہیں پہنیں۔ ان سارے امور کا انحصار ہمارے ملک کی آب و ہوا، ہماری قومی روایات، ہمارے فطری ذوق آرائش اور ہماری قابلیت اختراع و ایجاد پر ہے، مذہب ان چیزوں میں کوئی دخل نہیں دیتا۔

اسی طرح ہمارا معاشرتی مسئلہ ہے۔ اس میں بھی اسلام نے چند اصول دے دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی بنیاد جائز رشتۂ مناکحت پر ہو، اس میں مرد کی قوامیت کے ساتھ عورت اور مرد دونوں کے لیے حقوق اور دونوں کے اوپر ذمہ داریاں ہوں، اولاد کی پرورش و تربیت ایک مشترک ذمہ داری ہو۔ اگر اس رشتہ کو توڑنے کی نوبت آئے تو وہ یوں ہی واقع نہ ہو جائے بلکہ طلاق، عدت، مہر اور رضاعت کے چند متعین ضوابط کے تحت ہو۔ عورتوں اور مردوں کو آزادانہ اختلاط کی اجازت نہ ہو بلکہ گھروں کے اندر بھی اور گھروں کے باہر بھی چند معلوم حدود کی پابندی کی جائے۔

ان چند اصولی باتوں کے بعد ازدواجی زندگی کو خوشگواری کے ساتھ گزارنا اور اجمال میں تفصیل کا رنگ بھرنا میاں اور بیوی کا اپنا کام ہے، اسلام اندرون خانہ کی روزمرہ زندگی کی جزئیات میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔

اسی طرح ہماری سیاسی زندگی کا معاملہ ہے کہ اس کے متعلق بھی اسلام نے چند بنیادی باتیں طے کر دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسلام کا نظام حکومت خدا کی حاکمیت کے نظریہ پر مبنی ہو۔ اس میں قانون کا ماخذ خدا کی شریعت ہو۔ اس کے چلانے والے تقویٰ اور صلاحیت کے اوصاف سے متصف ہوں۔ جہاں شریعت الٰہی کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو، وہاں سارے معاملات شوریٰ کے ذریعے سے طے کیے جائیں۔ یہ اور اسی طرح کے چند بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک سیاسی نظام کو بنانا اور چلانا اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق اس کو ڈھالنا اور ترقی دینا ہمارا اپنا کام ہے۔ اسلام ان تفصیلات میں نہیں پڑتا جو بالکل انتظامی نوعیت کی ہیں اور جن کا شعور ہر معاشرے کی فطرت کے اندر ودیعت ہے۔

یہ چند چیزیں محض بطور مثال ذکر کی گئی ہیں۔ ہمارا مقصود یہاں نہ تو تمام شعبہ ہائے زندگی کا استقصاء کرنا ہے اور نہ ان اصولوں کی تفصیل کرنا ہے جو ان شعبہ ہائے زندگی سے متعلق اسلام نے دیے ہیں۔ یہ چیزیں ہر صاحب علم، قرآن اور حدیث سے اخذ کر سکتا ہے۔ ہم تو یہاں صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام اگر ایک کلیت پسند دین ہے تو وہ کس معنی میں کلیت پسند ہے؟ وہ کلیت پسند تو بے شک ہے، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، اس کلیت پسندی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی سے متعلق وہ بنیادیں متعین کر دیتا ہے جن پر اس کو مبنی ہونا چاہیے۔ یہ معنی اس کلیت پسندی کے نہیں ہیں کہ وہ اس شعبۂ زندگی سے متعلق ساری جزئیات و تفصیلات بھی بتاتا ہو۔ یہی حقیقت ہے جس کو ہمارے فقہاء اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ اصل ہر چیز میں اباحت ہے۔ یعنی ہر شعبۂ زندگی کے اندر اسلام کچھ حدود متعین کر دیتا ہے، اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ ان حدود کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے فکر و عمل کی وہ صلاحیتیں استعمال کریں جو ہمارے اندر ودیعت ہیں۔

حد بندی اور اباحت، پابندی اور آزادی کا یہی وہ امتزاج ہے جو اسلام کو نہ صرف دوسرے

مذاہب پر فوقیت بخشتا ہے بلکہ اس کو ایک ابدی دین کا مقام عطا کرتا ہے۔ ہمارے ہر شعبۂ زندگی کو چند پابندیوں کے ساتھ یہ جو باندھ دیا گیا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ خواہ اس پر کتنے ہی تغیرات اور حوادث طاری ہوں لیکن وہ ان حقائق سے منحرف نہ ہونے پائے جو فطرت کے اٹل حقائق ہیں۔ یہ حقائق اگر قائم ہیں تو زندگی کا ہر تغیر اسلام ہی کے تحت ہے۔ اس تغیر سے معاشرہ یا تمدن یا سیاست میں کسی فساد کے پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ حقائق اپنی جگہ قائم نہ رہ سکیں تو پھر ہماری زندگی اس جہاز کے مانند ہے جس کا لنگر ٹوٹ چکا ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چٹان سے جا ٹکرائے۔ اور یہ جو ایک وسیع دائرہ آزادی کا رکھا گیا ہے، جس کے اندر ہم خود اپنی فکری و عملی صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں، تو یہی وہ چیز ہے جو اسلام کے اندر وہ لچک پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ زمانہ کے ہر اس صالح تغیر کو اپنا لیتا ہے جو اس کے بنیادی اصولوں سے بے جوڑ نہیں ہوتا۔ یہ چیز آپ نہ موسائیت میں پائیں گے اور نہ مسیحیت میں اور نہ دنیا کے کسی اور مذہب یا دھرم میں۔

اس روشنی میں غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام ایک طرف تو ہماری ساری زندگی پر حاوی بھی ہے اور دوسری طرف اس میں دین اور دنیا کے الگ الگ دائرے بھی ہیں۔ ان میں سے ایک دائرہ کے اندر ہم پابند ہیں اور دوسرے دائرہ کے اندر ہم آزاد۔

یہی دائرہ جس کے اندر ہم آزاد ہیں، قرآن کے بعض مقامات اور متعدد احادیث میں دنیا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دنیا کا لفظ یوں عام طور پر تو آخرت کے مقابل میں آتا ہے اور اس وقت اس سے عالم باقی کے مقابل میں عالم فانی مراد ہوا کرتا ہے لیکن جب اس خاص مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو یہ لفظ دین کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس سے مراد ہماری زندگی کا وہ دائرہ ہوا کرتا ہے جس کی چاروں حدیں متعین کر دینے کے بعد ہمیں اس میں آزادی بخشی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا. (لقمان۔۳۱:۱۵)

اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو اس چیز کو میرا شریک ٹھہرا، جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو ان کی بات نہ مانو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو۔

اس آیت میں فِی الدُّنْیَا کا لفظ دین کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد ہماری معاشرتی زندگی کا وہ دائرہ ہے جس کے اندر خدا نے ہمیں آزاد چھوڑا ہے، کسی حکم یا ممانعت کے ذریعہ سے ہماری آزادی پر کوئی پابندی عائد نہیں کر دی ہے۔ اس دائرہ میں ہمیں ہدایت ہے کہ ہم والدین کے ہر حکم کی اطاعت کریں کیونکہ یہاں ان کی اطاعت اور خدا کی اطاعت میں کسی تصادم کا اندیشہ نہیں ہے۔ تابیر نخل والی مشہور حدیث میں حضور ﷺ نے یہ جو ارشاد فرمایا: انتم اعلم بامور دنیا کم. تم اپنی دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ تو اس سے ہماری زندگی کا یہی دائرہ مراد ہے۔

اب مذکورہ بالا سوال کے دوسرے حصہ پر آیئے۔ یعنی اس سوال پر کہ ہمارے دین اور ہماری دنیا کے درمیان وہ حدِ فاصل کیا ہے جو ان دونوں دائروں کو اس طرح ایک دوسرے سے نمایاں اور ممتاز کر دے کہ دونوں میں کوئی التباس اور اشتباہ باقی نہ رہ جائے تاکہ ہم اپنے اختیار اور اپنی آزادی کے استعمال میں حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے مجرم نہ ٹھہریں بلکہ ٹھیک ٹھیک اسی دائرے کے اندر اپنی آزادی استعمال کریں جس کے اندر ہمیں اس کے استعمال کا حق ملا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دنیا سے مراد وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں ہمیں خدا اور رسول کی طرف سے نفی یا اثبات کی صورت میں کوئی ہدایت نہ دی گئی ہو اور دین سے مراد وہ امور و مسائل ہیں جن میں خدا اور رسول کی جانب سے نفی یا اثبات کی صورت میں کوئی ہدایت دی گئی ہو، یہ ہدایت خواہ قرآن کے ذریعے سے دی گئی ہو یا حدیث کے ذریعے سے یا قرآن و حدیث کے کسی اشارے یا کسی اجتہاد و استنباط سے نکلتی ہو۔ جس طرح کی بھی ہدایت ہو وہ جس امر سے متعلق موجود ہو وہ دین کا دائرہ ہے، اس میں ہمارے فکر و عمل کی آزادی بس اس حد تک ہے کہ ہم اچھی طرح جانچ پرکھ کر دیکھ لیں کہ جو نص ہے وہ اپنے مفہوم و مدعا میں واضح ہے یا نہیں، جو حدیث ہے وہ ثابت ہے یا نہیں اور جو استنباط و اجتہاد پیش کیا گیا ہے وہ اپنی کوئی اساس رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ان پہلوؤں سے اس میں کوئی ضعف نہیں ہے تو اس سے انحراف، دین سے

انحراف ہے۔

بدعت کا دائرہ

یہی دائرہ ہے جس میں بغیر کسی شرعی دلیل کے محض اپنے جی سے کوئی اضافہ کر دینا اسلام کی اصطلاح میں بدعت ہے اور اس بدعت کو اسلام نے گمراہی اور ضلالت قرار دیا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ کا ارشاد ملاحظہ ہو۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ:

اما بعد! فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمد ﷺ وشر الامور محدثاتھا و کل بدعۃ ضلالۃ. (صحیح مسلم: کتاب الجمعہ باب ۱۳)

یاد رکھو کہ بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد ﷺ کی ہدایت ہے اور بدترین چیزیں وہ بے جوڑ اضافے ہیں جو ان میں کر دیے جائیں۔ اس طرح کی ہر چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

ایک دوسری حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یوں مروی ہے کہ:

قال رسول اللہ ﷺ: من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو ردٌ.
(صحیح مسلم: کتاب الاقضیۃ باب ۸)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز گھسائی جو اس میں کی نہیں ہے تو وہ شے مردود ہے۔

یہی بات بخاری شریف میں بایں الفاظ وارد ہوئی ہے:

و من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو ردٌ.
(صحیح البخاری: کتاب البیوع باب ۶۰)

اور جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کی تائید میں ہمارے دین کی کوئی دلیل نہیں ہے تو وہ بات مردود ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ:

وایاکم والامور المحدثات فان کل بدعة ضلالة.
(سنن ابن ماجہ: المقدمۃ باب ۶)
اور بدعت کی باتوں سے بچو کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان النبی ﷺ قال: ابغض الناس الی اللہ ثلاثة: ملحد فی الحرم و مبتغ فی الاسلام سنة الجاهلية ومطلب دم امرئٍ بغير حق ليهريق دمه.
(صحیح البخاری: کتاب الدیات باب ۸)
کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین قسم کے آدمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ غضب کے مستحق ہیں: ایک وہ شخص جو عین حرم میں کسی بے دینی کا ارتکاب کرے، دوسرا وہ شخص جو اسلام کے اندر جاہلی طریقہ گھسانے کی کوشش کرے، تیسرا وہ شخص جو ناحق کسی شخص کی جان کے درپے ہوتا کہ اس کا خون بہائے۔

حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انّہٗ من احیا سنةً من سنتی قد امیتت بعدی فان له من الاجر مثل ومن عمل بها من غیر ان ینقص من اجورهم شیئاً. و من ابتدع بدعة ضلالةً لا تُرضی اللّٰه و رسوله کان علیه مثل و آثام من عمل بها لاینقص ذالک من اوزار الناس شیئا. (سنن الترمذی: کتاب العلم باب ۱۶)
کہ جس نے میری سنتوں میں سے کوئی ایسی سنت زندہ کی جو میرے بعد ختم کردی گئی تھی تو اس کو ان لوگوں کے برابر اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو۔ اور جس نے کوئی ایسی بدعتِ ضلالت ایجاد کی جو اللہ اور رسول کی پسند نہیں ہے تو اس کو اس پر عمل کرنے والوں کے برابر گناہ ہوگا اور اس سے عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

دین کے دائرہ کے اندر اس نوع کی کسی مداخلت کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو بات دین کی ہے وہ تو نکال باہر کی جائے اور اس کی جگہ یہ نو ایجاد چیز لے لی جائے جس کے لیے دین میں کوئی سند نہیں ہے۔ اس وجہ سے ایک بدعت کرنے والے کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے ہاتھ کا گہر پھینک کر اس کے بجائے کوئی مینگنی اٹھالے یا اپنے ہاتھ کی مچھلی چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی سانپ پکڑ لے۔ اس حقیقت کی طرف ایک حدیث میں حضور ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا ہے کہ:

ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة. فتمسک بسنة خیر من احداث بدعة. (مسند احمد: ج ۴ ص ۱۰۵)
جس قوم نے کوئی بدعت ایجاد کی تو اسی کے مانند ان کے اندر سے ایک سنت اٹھالی گئی۔ تو ایک سنت کو تھامے رکھنا ایک بدعت ایجاد کر لینے سے کہیں بہتر ہے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بدعت دین کی تخریب کا دوسرا نام ہے۔ جو شخص ایک بدعت قائم کرتا ہے تو گویا ایک سنت کو ڈھا دیتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام میں جس طرح بدعت کو ضلالت قرار دیا گیا ہے، اسی طرح کسی صاحب بدعت کے ساتھ احترام اور محبت کے تعلق کو ہدمِ اسلام سے تعاون سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی هدم الاسلام.
جس نے کسی صاحب بدعت کی عزت کی تو گویا اس نے اسلام کے ڈھانے میں تعاون کیا۔

اس تفصیل سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بدعت کا مفہوم کیا ہے، یہ ہماری زندگی کے کس دائرہ کے اندر ظہور کرتی ہے، شریعت میں یہ کس درجہ کا جرم ہے اور یہ کس طرح علم حق کے آثار اور اس کی نشانیوں کو مٹانے والی ہے؟ اب ہم آگے اس کے اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔

بدعت کے دو بڑے سبب

ہمارے نزدیک بدعت کے بڑے سبب دو ہیں: ایک غلو پسندی اور دوسرے خواہشاتِ نفس کے لیے شرعی جواز پیدا کرنے کی خواہش۔ اب ہم ان دونوں اسباب کی، کتاب وسنت کی روشنی میں،

وضاحت کرتے ہیں۔

غلو پسندی

انسان کے اندر یہ ایک عام کمزوری پائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کے ساتھ اس کا تعلق محض عقلی ہی نہیں، بلکہ جذباتی بھی ہوتا ہے، ان کے معاملے میں وہ بسا اوقات غیر متوازن اور غیر معتدل ہو جایا کرتا ہے۔ آدمی اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے تو صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات اس محبت میں وہ ایسا اندھا ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ عداوت بھی کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس اندھے پن میں اُس کو خدا کے حقوق کا بھی کچھ ہوش نہیں رہ جاتا۔ اگر اسے اپنے قبیلہ یا قوم یا ملک سے محبت ہے تو ان کی عصبیت اس پر بسا اوقات اتنی غالب آجاتی ہے کہ وہ ان کے لیے پوری انسانیت کا دشمن بن جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کی حمایت میں خود خدا سے بھی لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہی چیز مذہب کے دائرہ میں آکر اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ مذہب کے ساتھ اولاً تو عام لوگوں کا تعلق عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہوتا ہے اور اگر عقلی ہوتا بھی ہے تو بھی اس معاملے میں انسان کے جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عقل کے لیے ان کو ضبط میں رکھنا آسان کام نہیں ہوتا۔ یہ جام وسنداں کی بازی کھیلنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ چنانچہ اس دائرہ کے اندر ایسا بہت ہوتا ہے کہ آدمی کو جس حد پر رک جانا چاہیے وہاں آکر وہ نہیں رکتا بلکہ اس حد کو لانگ کر آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ اگر ایک شخص اس کا مرشد ہے تو وہ اس کو مرشد ہی کے درجہ پر نہیں رکھے گا بلکہ اس کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ کسی طرح اس کو رسالت کے مرتبہ پر فائز کر دے۔ اسی طرح اگر ایک ذات کو خدا نے منصب رسالت سے سرفراز فرمایا ہے تو یہ اپنے جوش عقیدت میں یہ چاہے گا کہ اس کو خدا کی صفات میں بھی کچھ نہ کچھ شریک کر دے۔ اگر اس سے کسی کام کا مطالبہ پاؤ سیر کیا گیا ہے تو وہ چاہے گا کہ وہ اس کو بڑھا کر سیر بھر کر دے۔ اس غلو پسندی نے دنیا میں بڑی بڑی بدعتوں کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ اسی کے سبب سے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا، اسی کے سبب سے انہوں نے اپنے صوفیوں اور عالموں کو اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کا درجہ دیا اور یہی چیز تھی جس نے ان کو رھبانیت کے فتنہ میں مبتلا کیا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے ان کی اس

غلو پسندی پر کئی جگہ ان کو ملامت کی ہے:

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ ط اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ ج اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ ز فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ قف وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَۃٌ ط اِنْتَھُوْا خَیْرًا لَّکُمْ ط اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ط سُبْحٰنَہٗٓ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ م لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ۝ (النساء۔۴:۱۷۱)

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا دعویٰ نہ کرو، باز آجاؤ! یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس تنہا اللہ ہی ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمان میں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ کارساز بس ہے۔

اللہ کی رضا جوئی ہر دین میں بحیثیت اصلی نصب العین کے پیش نظر رہی ہے اور اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے ہر مذہب نے ایک معتدل اور متوازن پروگرام، جو قوم کے مناسب حال ہو، خود تجویز کر دیا ہے۔ یہ پروگرام نصاریٰ کے پاس بھی موجود تھا اور وہ اس پر کاربند ہو کر اس نصب العین کو حاصل کر سکتے تھے لیکن ان کے علماء اور صوفیاء اتنے ہی پر قانع نہیں ہوئے جتنا حضرت مسیح علیہ السلام ان کو بتا گئے تھے بلکہ انہوں نے اپنی حد اس سے آگے بڑھ کر قائم کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں انہوں نے رھبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ قرآن مجید نے ان کی اس بدعت کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

وَرَھْبَانِیَّۃَ نِ ابْتَدَعُوْھَا مَا کَتَبْنٰھَا عَلَیْھِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا (الحدید۔۵۷:۲۷)

اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کی۔ ہم نے ان کے اوپر صرف اللہ کی خوشنودی کی طلب فرض کی تھی تو انہوں نے اس کے حدود کما حقہ ملحوظ نہیں رکھے۔

مسلمانوں کو اس غلو پسندی کی بیماری سے بچانے کے لیے ایک طرف تو نصاریٰ کی تاریخ سنائی گئی کہ وہ کس طرح اس بیماری کے سبب سے بدعتوں میں مبتلا ہوئے اور پھر اس کے نتیجے میں دین حق کی نعمت سے محروم ہوئے، دوسری طرف قرآن وحدیث دونوں میں ان کو افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صحیح نقطۂ اعتدال پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

جاء ثلاثة رهط الى بيوت ازواج النبى ﷺ يسالون عن عبادة النبى ﷺ. فلما اخبروا كانهم تقالّوها فقالوا: واين نحن من النبى ﷺ؟ قد غفر الله له ما تقدم من ذنبه وما تاخر! قال احدهم: اما انا فانى اصلّى الليل ابدًا. و قال اخر: انا اصوم الدهر ولا افطر. و قال اخر: انا اعتزل النساء فلا اتزوّج ابدًا. فجاء رسول الله ﷺ فقال: انتم الذين قلتم كذا و كذا؟ اما والله! انى لاخشاكم للّٰه واتقاكم له. لكنى اصوم و افطر واصلى وارقد واتزوّج النساء. فمن رغب عن سنتى فليس منى!

(صحیح البخاری: کتاب النکاح باب ۱)

تین جماعتیں نبی ﷺ کی ازواجؓ کے پاس آنحضرت ﷺ کی عبادت کا حال پوچھنے آئیں۔ جب ان کو آپؐ کی عبادت کا حال بتایا گیا تو انہوں نے اس کو اپنے گمان وتوقع سے بہت کم پایا۔ وہ بولے کہ ہمارا اور نبی ﷺ کا کیا مقابلہ؟ آپؐ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیے ہیں! ان میں سے ایک صاحب بولے: میں تو رات بھر نمازیں پڑھا کروں گا۔ دوسرے صاحب نے کہا: میں برابر روزے رکھوں گا، کبھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے صاحب نے فرمایا: میں عورتوں سے ہمیشہ دور رہوں گا، کبھی شادی نہ کروں گا۔ اتنے میں نبی ﷺ تشریف لائے۔ آپؐ نے فرمایا: تمہی لوگ تھے جو یہ باتیں کر رہے تھے؟ خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کے حدود کا پاس کرنے والا ہوں، لیکن روزے بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور شادی بیاہ بھی کرتا ہوں۔ تو جس نے میرے طریقے سے انحراف اختیار کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

صنع النبى ﷺ شيئًا فرخص فيه. فتنزّه عنه قوم. فبلغ ذالك النبى ﷺ فخطب فحمد الله ثم قال: مابال اقوام يتنزّهون عن الشيء اصنعه. فوالله! انّى لاعلمهم بالله و اشدهم له خشيةً.

(صحیح البخاری: کتاب الادب باب ۷۲)

رسول اللہ ﷺ نے ابتداءً بعض کام کیے، پھر آپؐ نے ان کے بارے میں لوگوں کو رخصت دے دی۔ کچھ لوگوں نے رخصت سے فائدہ اٹھانا کچھ اچھا نہیں سمجھا۔ جب حضور ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں حمد وثنا کے بعد فرمایا: بعض لوگوں کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی چیزوں کے کرنے سے احتراز کرتے ہیں جو میں خود کرتا ہوں؟ خدا کی قسم! میں ان سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور ان سے زیادہ اس کا ڈر رکھتا ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

انّ رسول الله ﷺ كان يقول: لا تشددوا على انفسكم فيشدد عليكم. فانّ قومًا شددوا على انفسهم فشدد الله عليهم. فتلك بقاياهم فى الصوامع والديار [ورهبانيةً ابتدعوها ما كتبنٰها عليهم]

(سنن ابی داؤد: کتاب الادب باب ۵۲)

نبی ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ دین کے معاملے میں اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی کرے۔ ایک گروہ نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ یہ انہی کے بقایا ہیں جن کو تم گرجوں اور خانقاہوں میں دیکھ رہے ہو۔ (پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی) [اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کی ہم نے تو ان کے اوپر اس کو فرض نہیں کیا تھا]۔

اس آخری حدیث کے یہ الفاظ کہ 'تم دین کے معاملے میں اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی کرے' ایک نہایت اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کو نیکی اور تقویٰ کے انہی پیمانوں سے ناپنا چاہتا ہے جو اس نے خود مقرر کر دیے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ان پیمانوں کو حقیر ٹھہرا دے اور خود اپنی ایجاد سے کچھ نئے

پیمانے بنائے جو اس کے زعم میں خدا کے پیمانوں سے بڑے ہوں تو پھر خدا بھی اس کو ان ہی پیمانوں سے ناپے گا اور اگر وہ خود اپنے ہی مقرر کیے ہوئے پیمانوں پر پورا نہیں اترے گا تو پھر بغیر کسی رعایت کے اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ اگر کسی شخص نے زہد، توکل، صبر، رضا اور محبت وغیرہ کے ایسے معیارات بنا لیے ہیں جو خدا اور رسول کے مقرر کیے ہوئے معیارات سے اونچے ہیں تو وہ انھی معیارات سے جانچا جائے گا اور اگر ان پر پورا نہ اترے گا تو کھوٹا قرار پائے گا۔ یہ مطلب ہے اس بات کا کہ 'ایک گروہ نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی'۔

لیکن ان نہایت واضح تاکیدات وتنبیہات کے باوجود مسلمانوں کے اندر بھی غلو پسندی کی یہ بیماری پھیلی اور اس سے ہمارے فکر وعمل کے ہر گوشے میں مختلف قسم کی بدعتیں داخل ہوگئیں۔ اس سے عقائد بھی متاثر ہوئے، احکام وقوانین بھی متاثر ہوئے اور عبادات واخلاق بھی اس کی زد میں آئے۔

عقائد ونظریات میں یہ فتنہ بیشتر علم کلام کی راہ سے گھسا اور عبادات واخلاق میں زیادہ تر تصوف کی راہ سے۔ اس طرح کی ساری چیزوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہم صرف مثال کے طور پر اشاعرہ کے جبر، معتزلہ کے نظریۂ اختیار، معطلہ ومجسمہ کے نظریاتِ تعطیل وتجسیم اور حضرات صوفیہ کے نظریۂ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ نجات کے معاملے میں خوارج کی تنگ گیری اور مرجیہ کی بے قیدی اور اباحت بھی اسی ذیل میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو خلق قرآن کے جس فتنہ کے سبب سے ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا، وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اسی طرح فقہ میں بعض خود ساختہ اصولوں کو اساس بنا کر تخریج در تخریج کا جو سلسلہ شروع ہوا اور خیالی صورتیں فرض کر کر کے جو مسائل پیدا کیے گئے، اس کے سبب سے ہماری فقہ میں بھی ہر باب کے تحت ایسی بے شمار جزئیات داخل ہوگئیں جو زندگی کو بالکل تنگ کر دینے والی اور آدمی کے فکر وعمل کی آزادی کو بالکل سلب کر لینے والی ہیں۔ جو باتیں شریعت نے ہر آدمی کی سمجھ بوجھ پر چھوڑ دی تھیں اور جن میں وہ اپنی عقل سے کام لے کر ان کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی

اختیار کر سکتا تھا ان کی ایک خاص شکل معین کر دی گئی اور اس کو اس درجہ اہمیت دے دی گئی کہ اس سے معمولی انحراف، خود دین سے انحراف سمجھا جانے لگا۔

اس غلو پسندی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ان مسائل میں ہوا ہے جو مختلف فقہی مذاہب میں کسی سبب سے مابہ النزاع بن گئے ہیں۔ یہ مسائل ہیں تو عموماً بالکل جزوی اور فروعی نوعیت کے لیکن ہر مسلک کی کتابوں میں اتنی شد ومد سے ان پر بحثیں ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اصلی مسائل یہی ہیں اور انسان کی نجات کا تمام تر انحصار انھی کے اختیار کرنے یا نہ کرنے پر ہے۔ یہ بحثیں ہر مسلک کے حامیوں کی طرف سے تصنیفات وتالیفات میں بھی پورے زور وقوت کے ساتھ اٹھائی گئی ہیں اور انھی پر ایک ایک مسجد اور ایک ایک مدرسہ میں آئے دن مناظرہ کی مجلسیں بھی گرم ہوتی رہتی ہیں، بلکہ بسا اوقات ان کے سبب سے مسلمانوں کے اندر جنگ وجدال، تکفیر وتفسیق، گرفتاری ومقدمہ بازی اور قتل وآتش زنی تک نوبتیں پہنچتی ہیں۔

غلو کے سبب سے عبادات واخلاق میں زیادہ تر بدعتیں تصوف کی راہ سے آئی ہیں۔ صوفیہ نے تزکیۂ نفس، تقرب الٰہی اور ذکر وعبادت کی بعض ایسی صورتیں ایجاد کی ہیں جن کا کتاب وسنت میں کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ پر مشقت ریاضتیں، چلہ کشی اور عملیات کی ان کے ہاں ایسی مثالیں موجود ہیں جن کا دین میں بہتر ہونا تو در کنار، ان کا جواز بھی مشکل ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے بلکہ ان میں سے بعض کے تو بدعت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ایک پاؤں پر کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ اس طرح کی چیزیں صرف بدعت پسند صوفیوں ہی کے ہاں پائی جاتی ہیں، جو صوفیہ کتاب وسنت پر عامل ہیں ان کے ہاں اس طرح کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہ خیال اگر حقیقت کے مطابق ثابت ہو جائے تو مجھے اس سے نہایت خوشی ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تصوف کا جو حصہ پاکیزہ ہے بعض چیزیں اس میں بھی ایسی ملتی ہیں جن کے بدعت ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ تصور شیخ کو محبت الٰہی کا ایک زینہ سمجھا گیا ہے اور ہمارے صوفیانہ لٹریچر میں اس کی جو توجیہ عموماً کی گئی ہے اس کی روشنی میں یہ کتاب وسنت کے صریح خلاف نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے قائل بعض ایسے لوگ بھی

ہیں جن کے لائق احترام ہونے میں کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔

صوفیانہ لٹریچر میں اس غلو کا سب سے زیادہ مظاہرہ اس حصے میں ہوا ہے جہاں یہ حضرات صبر، شکر، زہد، قناعت، توکل، انابت، عبودیت، خشیت اور محبت و رضا وغیرہ کی حقیقتیں بیان کرتے ہیں۔ یہ بحثیں آپ تصوف کی کسی قابل اعتماد کتاب میں پڑھیے۔ میں اس کے لیے رسالہ قشیریہ یا قوت القلوب یا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء العلوم کے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ یہ کتابیں صوفیانہ لٹریچر میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اصلاح نفس کے نقطۂ نظر سے ان کتابوں کو نہ صرف پڑھنا بلکہ بار بار پڑھتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ ان کتابوں میں جب آدمی ان مباحث کو پڑھتا ہے تو پہلی نظر میں ان کی دل کشی مسحور کر لیتی ہے لیکن جب آدمی ان کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہے اور یہ چیز بھی اس کے پیش نظر ہوتی ہے کہ ان کو عملی زندگی میں اپنانا بھی ہے تو پھر وہ اکثر جگہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ باتیں اگرچہ بڑی ہی اعلیٰ، بڑی ہی پاکیزہ اور بڑی ہی زریں ہیں لیکن ان کو اپنانا صرف ان ہی بزرگوں کا کام تھا جنہوں نے یہ لکھی ہیں یا جو گزر چکے ہیں، اس زمانے میں انسان کا یہ ظرف نہیں ہے کہ وہ ان مقامات تک پہنچ سکے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ یہ رائے قائم کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے بشری تقاضوں سے دست کش ہوئے بغیر شاید ان کو اپنا ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج السالکین میں سلوک کے مقامات پر بحث کرتے ہوئے جگہ جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فلاں چیز کی حقیقت یہ ہے جو ارباب تصوف پیش کرتے ہیں تو پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اس مقام کو صحابہ رضی اللہ عنہم بلکہ انبیاء علیہم السلام بھی حاصل نہ کر سکے۔

علامہ ابن قیمؒ کی مدارج السالکین، جیسا کہ میں اوپر کہیں عرض کر چکا ہوں، ایک مشہور صوفی شیخ ابو اسماعیل ہرویؒ کی کتاب منازل السائرین کی شرح اور اس پر ایک قسم کا تبصرہ ہے۔ شیخ ابو اسماعیل نے توبہ، توکل، صبر، رضا وغیرہ کی شرح میں یہ طریق اختیار کیا ہے کہ ہر چیز کے تین درجے بیان کرتے ہیں — ہم اس کی بعض مثالیں اس کتاب کے پچھلے ابواب میں نقل کر آئے ہیں — پہلا درجہ عوام کا، دوسرا درجہ خواص کا اور تیسرا درجہ اخص الخواص یا بالفاظ دیگر کاملین و عارفین کا۔ عموماً پہلے درجے ہی کا معیار وہ ایسا بلند قائم کرتے

ہیں کہ آدمی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ قرآن آدمی کو جہاں تک لے جانا چاہتا ہے وہ تو بس یہیں تک ہے اور اگر اس میں کسی پہلو سے کوئی کسر ہے تو دوسرے میں تو وہ بہر حال پوری ہو جاتی ہے۔ رہا تیسرا درجہ تو وہ صاف ایک مافوق بشریت درجہ معلوم ہوتا ہے جو شیخ کے نزدیک تو کاملین کا درجہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص کتاب و سنت کو معیار کامل مان کر اس کا تجزیہ کرے تو عموماً اس کے متعلق وہ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس درجے یا اس مقام کا اگر کوئی وجود ہے تو وہ صرف شیخ کے ذہن میں ہے، نہ کتاب و سنت میں اس کا کوئی اشارہ ملتا ہے اور نہ عقل اور قیاس کی وہ گرفت میں آتا ہے۔

یہ صورت حال آدمی کو سخت حیرانی میں ڈال دیتی ہے اگر وہ یہ مانے کہ یہ ایک مقام ہے تو سہی لیکن کتاب و سنت میں اس کا بیان اس وجہ سے نہیں ہوا ہے کہ وہ صرف متوسط درجہ کے لوگوں ہی کی تعلیم کے لیے ہے جیسا کہ صوفیہ کے ایک گروہ کا خیال ہے، تو اس پر کسی ایسے شخص کا دل مطمئن نہیں ہو سکتا جو کتاب و سنت اور انبیائے کرام ہی کو معیار کامل مانتا ہے۔ اگر وہ خیال کرے کہ اس درجہ کا بیان تو کتاب و سنت میں ہوا ہے لیکن لکلٍّ ظھرٌ بطنٌ کے صوفیانہ نظریہ کے مطابق یہ حقائق کتاب و سنت کے پردوں میں اس طرح چھپے ہوئے ہیں کہ ان تک صرف خاص خاص لوگ ہی پہنچ سکے ہیں، قرآن کے الفاظ سے ان تک رسائی نہیں حاصل کی جا سکتی تو اس سے بھی دل کو اطمینان نہیں ملتا کیونکہ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نظریہ اور باطنیت کے درمیان فرق کیا ہے؟ اگر وہ یہ فرض کرے کہ یہ معیارات بتائے ہوئے اور سکھائے ہوئے تو انبیائے کرام ہی کے ہیں لیکن امت میں ان کے منتقل ہونے اور پھیلنے کے ذریعے سفینے نہیں بلکہ خواص کے سینے ہیں تو یہ چیز اور بھی متوحش کرتی ہے کیونکہ یہ چیز پورے نظام دین ہی کو ڈھا دیتی ہے۔ اگر وہ مانے کہ ان کے معلوم کرنے کا ذریعہ وحی نہیں بلکہ کشف ہے تو اس سے اور بھی الجھن بڑھتی ہے، کیونکہ کسی کشف کو وحی کی کسوٹی پر جانچے بغیر بجائے خود سند مان لینا اسی شخص کے لیے ممکن ہے جو اپنے دین و ایمان کے معاملے میں اتنا بے پروا ہو کہ وہ ان کو ہر خواب اور ہر وسوسہ پر قربان کر سکتا ہو۔

اگر ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں مانی جا سکتی تو آخر اس کے سوا کیا چارۂ کار ہے

کہ آدمی یہ مانے کہ جس مقام کی تشریح و توضیح میں کتاب و سنت کے قائم کردہ معیار سے تجاوز کیا گیا ہے یہ محض غلو کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ علامہ ابن قیمؒ نے تنقید کر کے دکھایا ہے کہ شیخ ابو اسماعیل کے قائم کردہ معیارات کتاب و سنت کے معیارات سے اونچے ہیں اور چونکہ صحیح انسانی فطرت کے مطابق معیارات وہی ہو سکتے ہیں جو کتاب و سنت میں قائم کیے گئے ہیں اس وجہ سے لازماً یہ معیارات غلط ہیں۔

اس غلو کے سبب سے صوفیائے کرام کے ان معیارات سے یا تو آدمی پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے اور وہ ان کو اپنانے کی ہمت ہی نہیں کرتا یا اگر کرتا ہے تو علمی پہلو سے وہ تفلسف اور باطنیت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور عملی پہلو سے جوگ اور رہبانیت کا۔ علم و معرفت کی بحث میں ابو اسماعیل ہروی کی کتاب سے چند اقتباسات میں اوپر پیش کر آیا ہوں، وہ میرے خیال کی تائید کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ یہ تو تصوف کے صرف ایک خاص سکول کی ترجمانی ہوئی، دوسرے صوفیائے کرام کا طرزِ فکر اس سے مختلف ہے، تو میری جانب سے اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ جن صوفیائے کرام کا طرزِ عمل اس سے مختلف ہے، جو کتاب و سنت ہی کو معیارِ کامل مانتے ہیں، مجھے ان پر اعتراض نہیں ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ کوئی ایسی کتاب منتخب کیجیے، جس میں ہر مکتبِ خیال کے صوفیوں کی ترجمانی کی گئی ہو اور اس کو اس نقطۂ نظر سے پڑھیے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، پھر دیکھیے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔ میرے خیال میں اس مقصد کے لیے رسالہ قشیریہ ایک موزوں کتاب ہے، اس میں ہر باب کے تحت تقریباً اکثر اکابرِ تصوف کے اقوال و افکار موجود ہیں۔ اس کو تنقید کے ساتھ پڑھیے تو اس میں بھی قدم قدم پر وہ بے اعتدالی موجود ملے گی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ میں اس کتاب سے بعض مثالیں پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر واضح کر سکتا ہوں لیکن چونکہ آگے یہ ساری بحثیں تزکیۂ عمل اور تزکیۂ تعلقات و معاملات کے ابواب میں تفصیل کے ساتھ آ رہی ہیں اس وجہ سے یہاں بیچ راستہ میں ناظرین کو روکنا نہیں چاہتا۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی

بدعت کا دوسرا سبب خواہشاتِ نفس کی پیروی ہے۔ انسان کے اندر یہ بھی ایک کمزوری ہے کہ بسا اوقات وہ ایک نظریہ یا ایک رویہ اختیار تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اس کی خواہشاتِ نفس کے مطابق ہوتا ہے، اس سے اس کے کسی مخفی منصوبے کی تکمیل ہو رہی ہوتی ہے، اس سے کسی ایسے شخص کی خوشنودی اسے حاصل ہوتی ہے جس کی خوشنودی اسے اپنے دنیوی اغراض کے نقطۂ نظر سے مطلوب ہوتی ہے، اس سے اس کے وہ ارمان پورے ہوتے ہیں جو نفس کی اکساہٹ سے اس کے اندر ہر وقت گدگدیاں پیدا کر رہے ہوتے ہیں، لیکن وہ اتنی جرأت و ہمت نہیں رکھتا کہ ان چیزوں کی تکمیل کے لیے وہ صاف صاف نفس پرستی اور دنیا پرستی کے نام سے میدان میں اترے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اپنی اس دنیاداری اور نفس پرستی کے لیے دین داری کی کوئی آڑ بھی تلاش کر لے تاکہ رندکا رند بھی رہ سکے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جانے پائے۔ اس خواہش کے تحت وہ مختلف قسم کے نظریات بناتا ہے اور ان کو مذہب کے اندر گھسانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر گھسانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ان سے اپنی خواہشوں کے بند دروازوں کے کھولنے میں کلید کا کام لیتا ہے، خواہشاتِ نفس کے تحت فتوے لکھتا ہے اور ان کو کتاب و سنت کی طرف منسوب کرتا ہے، بعض سفلی جذبات کی تسکین کے لیے بہت سے کام کرتا ہے اور ان کو معرفتِ الٰہی اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بتاتا ہے۔

یہود نے جب چاہا کہ اپنی نفس پرستیوں کے لیے کوئی شرعی سند جواز پیدا کریں تو انہوں نے یہ نظریہ بنایا کہ ہم چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد اور خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں، اس وجہ سے ہم خواہ کچھ بھی کر گزریں، ہمارے لیے دائمی عذابِ دوزخ نہیں ہے۔ اول تو ہم دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے لیکن اگر ڈالے بھی گئے تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔ اپنے اس نظریے کو، جو محض نفس پرستی کی تحریک سے پیدا ہوا تھا، انہوں نے اپنے دین میں گھسا دیا تو ظاہر ہے کہ ان کی ساری شریعت ان کی خواہشوں کے سانچے میں ڈھل گئی۔ اس کے اندر جو حقوق اور جو درجے اور مرتبے ان کے لیے بیان ہوتے تھے ان کا تو وہ

اپنے آپ کو پورا پورا موروثی حقدار سمجھتے تھے لیکن جو ذمہ داریاں اس میں بیان ہوئی تھیں، ان کی سرے سے ان کو کوئی پرواہی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اپنے مذکورہ نظریہ کی بدولت جزا اور سزا اور دوزخ کی فکر سے بالکل فارغ البال ہو گئے تھے، اس وجہ سے قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کو اپنی خواہشوں کا ایک مجموعہ بنا رکھا ہے، جس میں وہی باتیں لکھی ہوئی ہیں جو ان کے نفس کو پسند ہیں۔

اسی طرح جب ان کے اندر سود کا رواج ہوا تو انہوں نے یہ نظریہ پیدا کیا کہ سود اگر حرام ہے تو خود اپنی قوم کے افراد، یعنی بنی اسرائیل، سے لینا حرام ہے نہ کہ دوسری کافر قوموں سے۔ اس نظریہ کو انہوں نے اپنے دین میں گھسایا اور پھر اس راہ سے انہوں نے اپنے سارے سودی کاروبار کو جائز کر لیا۔

اسی طرح عیسائیوں میں پال نے جب رومیوں میں عیسائیت کو مرغوب و مقبول بنانا چاہا تو اس نے سود اور شراب کو جائز قرار دے دیا اور اس کے لیے تاویل یہ کی کہ سود اور شراب کی حرمت اگر وارد ہے تو تورات میں وارد ہے نہ کہ انجیل میں، اس وجہ سے بنی اسرائیل کے افراد کے لیے تو یہ چیزیں بے شک ناجائز ہیں لیکن دوسری قوموں کے جو لوگ مسیحیت قبول کریں، ان کے لیے اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مسلمانوں پر اتباع ہوا کے تحت بدعتوں کا حملہ مختلف طرف سے ہوا۔ سب سے زیادہ یہ جنس باطنیہ نے پیدا کی۔ انہوں نے شریعت کی تمام قیود سے اپنے آپ کو آزاد کر لینے اور خواہشات نفس کی پوری پوری چھوٹ دے دینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شریعت کی تمام اصطلاحات کا مفہوم ہی یکسر بدل کے رکھ دیا۔ ان کی تعریف کے لحاظ سے نہ نبی، نبی رہا، نہ قرآن، قرآن اور نہ روزہ، روزہ رہا اور نہ نماز، نماز۔ ہر چیز کے ظاہر و باطن کو انہوں نے اس طرح مسخ کر دیا کہ شریعت کا پورا حلیہ ہی بگڑ کے رہ گیا۔ مثلاً نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ کا فیضان ہوا، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف لوٹ آنا ہے، جنابت سے مراد افشائے راز ہے، غسل سے مراد تجدید عہد ہے، زنا سے مراد علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا ہے جو عہد میں شریک نہ ہو، طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے سوا ہر مذہب سے برات

ہے، صلوٰۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت اور زکوٰۃ سے مراد ذی صلاحیت لوگوں میں علم کی اشاعت ہے۔ فرقہ اسماعیلیہ اور بابیوں بہائیوں کا سارا نظام اسی طرح کے عجائب و غرائب پر کھڑا ہے۔ شیعوں کے ہاں متعہ اور اس طرح کی بعض دوسری چیزیں اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ قادیانیوں نے بھی باطنیہ سے بہت کچھ لیا ہے۔

لیکن اس زمانہ میں باطنیہ کے حقیقی وارث منکرین حدیث ہیں۔ انہوں نے سنت کا انکار کرنے کے بعد تمام شرعی اصطلاحات — روزہ، نماز، حج، قربانی، جنت، دوزخ اور آخرت وغیرہ — کی جو تاویلیں کرنی شروع کی ہیں، ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے مقصد اور باطنیہ کے مقصد اور ان کے طریق تاویل اور باطنیہ کے طریق تاویل میں سر مو فرق نہیں ہے۔ آپ باطنیہ کے نظریات و عقائد اور ان کے نظریات و عقائد، ان کی تاویلیں اور باطنیہ کی تاویلیں آمنے سامنے رکھ لیجیے تو یہ حقیقت آپ پر بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ دونوں ایک ہی اب وجد کی اولاد اور ایک ہی شجرۃ الزقوم کے برگ و بار ہیں۔

اسی اتباع ہوا کا ایک مظہر ہمارے بعض اہل علم کا یہ نظریہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے جرموں اور گناہوں کی سزا اللہ تعالیٰ اسی دنیا کے مصائب و شدائد کے ذریعہ سے پوری کر دیتا ہے، دوزخ کی سزا ان کے لیے نہیں ہے۔ نیز بے علم اور کم عقل عوام کے ساتھ آخرت میں وہ معاملہ ہوگا جو کیڑوں مکوڑوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کو جزا و سزا کی اس کسوٹی پر نہیں پرکھا جائے گا جس کا ذکر قرآن و حدیث میں ہوا ہے۔

یہ نظریہ یہودیوں کے اس نظریہ سے بالکل مشابہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہم کو دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی اور اس نظریہ نے ان کو شریعت کی حدود توڑنے کے لیے بالکل بے خوف و بے باک بنا دیا تھا۔ اسی طرح ہمارے ان نئے متکلمین نے بھی یہ نظریات عوام کو ان کی بے خبری اور شریعت سے بے پروائی پر مطمئن رکھنے کے لیے ایجاد فرمائے ہیں تاکہ لوگ جس غلط روش پر ہیں اس پر جمے رہنے کے لیے ان کو ایک عقیدہ کا سہارا فراہم کر دیا جائے اور آخرت کی باز پرس کی جو خلش بعض اوقات ستاتی رہتی ہے اس سے کم از کم حیلہ جو طبیعتوں کو بالکل ہی رہائی مل جائے۔

رخصت اور غنیمت کا فلسفہ بھی، کم از کم اپنی موجودہ صورت میں، اتباع ہوا کا ایک مظہر ہے۔ دین کے اکثر مطالبات کے جواب میں آج بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان مطالبات کے دین کے مطالبات ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن حالات و مصالح کے تحت اسلام نے آخر رخصت سے بھی تو فائدہ اٹھانے کا حق دیا ہے؟ موجودہ زمانہ چونکہ ان باتوں کے لیے سازگار نہیں ہے، اس وجہ سے جو کچھ ہو رہا ہے اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

تصوف کے حلقوں سے وابستہ لوگوں کی جو بدعتیں اتباع ہوا کے تحت آتی ہیں وہ یوں تو بہت سی ہیں لیکن دو چیزیں بہت نمایاں ہیں: ایک تو ساز کے ساتھ نغمہ بدعت، دوسری یہ بدعت کہ بہت سے لوگ اس وسوسہ میں مبتلا ہو کر کہ وہ خدا رسیدہ ہو چکے ہیں، اپنے آپ کو شریعت کی تمام پابندیوں اور ذمہ داریوں سے یک قلم آزاد کر لیتے ہیں۔ خانقاہوں اور مزارات پر اور عرسوں میں جو صریح منکر باتیں ہوتی ہیں ان کا حوالہ میں اس وجہ سے نہیں دیتا کہ ان چیزوں کی ذمہ داری تصوف کے حامیوں کی طرف سے عموماً عوام پر ڈال دی جاتی ہے لیکن مذکورہ دونوں چیزوں کے متعلق تو یہ عذر کسی طرح نہیں پیش کیا جا سکتا۔

فقہی طرز کی جو بدعتیں آج محض ہوا پرستی کی تحریک سے سامنے آ رہی ہیں ان کا ایک بہترین نمونہ عائلی کمیشن کی وہ رپورٹ ہے جو مسلمانوں کے ازدواجی مسائل سے متعلق حکومت پاکستان کے ایک مقرر کردہ کمیشن نے پیش کی ہے۔ اس رپورٹ کے مرتبین نے دعویٰ تو قدم قدم پر یہ کیا ہے کہ اس میں انہوں نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ تمام تر کتاب و سنت پر مبنی ہیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اس میں بیشتر مغربی ملکوں کے ازدواجی قوانین کی نقالی کی گئی ہے اور ان کو شریعت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے شرعی احکام کو پوری بے باکی کے ساتھ توڑا مروڑا گیا ہے۔

بدعت کا علاج

بدعت کے اسباب واضح ہو جانے کے بعد اس کا علاج خود بخود سامنے آ گیا۔ وہ یہ کہ آدمی پوری مضبوطی کے ساتھ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر قائم رہنے اور دوسروں کو بھی قائم رکھنے

کا اہتمام و التزام کرے۔ جس چیز کی جو حد کتاب و سنت میں قائم کر دی گئی ہے اس میں نہ کوئی زیادتی کرے نہ کوئی کمی۔ جس کا جو مرتبہ شریعت میں متعین کر دیا گیا ہے اس سے اس کا مرتبہ نہ اونچا کرنے کی کوشش کرے نہ نیچا۔ جو چیز دین میں جتنی مقدار میں مطلوب ہے اس میں محض اپنے جی سے نہ کوئی اضافہ کرے نہ کوئی تخفیف۔ اسی طرح اپنی خواہشوں میں سے کسی خواہش کو شریعت کا جامہ پہنانے کی کوشش نہ کرے۔ اپنے من گھڑت نظریات کو دین میں نہ گھسائے۔ اپنے ذاتی میلانات و رجحانات کو قرآن و حدیث کے نام سے پیش کرنے کا خواہش مند نہ بنے۔ یہ کام کہنے میں آسان ہے لیکن کرنے میں بڑا مشکل ہے۔ اس زمانہ میں حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ شریعت نے جن چیزوں کو منکر قرار دیا ہے وہ سوسائٹی میں معروف بن چکی ہیں اور جن چیزوں کو شریعت نے معروف بتایا ہے وہ منکر قرار دے دی گئی ہیں۔ اس فساد حال کے سبب سے اگر کوئی شخص صحیح سنت پر قائم رہنا چاہے تو وہ سوسائٹی میں بالکل کو بن کے رہ جاتا ہے، ہر جگہ اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ہر مجلس میں وہ خود بھی اپنے آپ کو اجنبی اور بیگانہ محسوس کرتا ہے اور دوسرے بھی اس کو اجنبی اور بیگانہ محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اصلاح کی بھی کوشش کرے تو یہ بے گانگی فوراً اختلاف اور کشمکش کی صورت اختیار کر لیتی ہے، پھر ہر جگہ اس کے خلاف ایک محاذ جنگ قائم ہو جاتا ہے۔ یگانے اور بیگانے دونوں ہی اس سے الجھتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں، عزیز اور دوست دشمن بن جاتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں جو یا تو پہلے سے اس کے ہم خیال و ہم مسلک ہوں یا اس کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر اس کے ہم خیال بن چکے ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنا معمولی عزم و ہمت کے آدمی کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دوسروں کی ناراضگیاں مول لے سکتے ہیں، جو حق کے لیے رشتوں اور قرابتوں سے بے پروا ہو سکتے ہیں، جو اللہ کے لیے ہر طرح کا نقصان گوارا کر سکتے ہیں اور جو بدعت کے مقابل میں سنت کی حمایت و نصرت کے لیے پہاڑ کی طرح مضبوط ہو کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

اس راہ میں آدمی کو سب سے زیادہ قیمتی رہنمائی حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کے عملی نمونوں سے ملتی ہے۔ اگر آدمی انبیائے کرام اور صحابہ،

کرام کے حالات کا برابر مطالعہ کرتا رہے تو بدعات سے لڑنے کے لیے اس کے اندر برابر حرارت قائم رہتی ہے۔ اس امت میں سنت کے اہتمام اور بدعت کی مخالفت کے پہلو سے صحابہ کرام کے بعد میرے نزدیک سب سے اونچا درجہ حضرت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ ان کی زندگی سراپا سنت ہے اور ان کا ایک ایک قول و فعل بدعت کے خلاف کھلم کھلا بغاوت۔ جب آدمی ان کے حالات کا مطالعہ کرتا ہے تو سنت کی حمایت اور بدعت کی مخالفت کے جذبہ سے اس کا دل سرشار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے اندر اس جذبہ کو زندہ رکھنا چاہیں، میں ان کو حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی کا بار بار مطالعہ کرتے رہنے کا مشورہ دوں گا۔

تزکیۂ عمل

باب ۱۱

تزکیۂ عمل

علم کے تزکیہ کے بعد عمل کے تزکیہ کی باری آتی ہے۔ عمل کے تزکیہ سے مطلب یہ ہے کہ عمل بجائے خود بھی ٹھیک ہو اور اس کا محرک بھی ٹھیک ہو۔ محرک کو کسی عمل کی پاکیزگی میں سب سے زیادہ دخل ہوا کرتا ہے۔ بسا اوقات ایک عمل ظاہر میں بڑا معصومانہ نظر آتا ہے لیکن تحقیق کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا محرک نہایت مکروہ اور گھناؤنا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ایک ڈاکٹر ایک مریض کا کوئی عضو کاٹ کر اس کے جسم سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ بظاہر یہ فعل نہایت ظالمانہ ہے لیکن اس کے اس فعل کو کوئی شخص بھی برا نہیں کہتا کیونکہ اس نے یہ کام مریض کے بقیہ اعضاء کو عضوِ فاسد کے زہر سے بچانے کے لیے کیا ہے۔ کارپوریشن ایک بنی بنائی عمارت کو منہدم کرا دیتی ہے۔ بظاہر یہ ایک غلط اور نقصان رساں کام ہوتا ہے لیکن اس کے اس اقدام پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ اس مکان کے انہدام میں ایک پورے شہر کی مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک شخص یتیم خانہ قائم کرتا ہے، مسجد تعمیر کراتا ہے، مدرسے بنواتا ہے، ظاہر میں یہ سارے کام دین کی اور قوم کی خدمت کے کام ہیں لیکن ثابت ہو جائے کہ یہ سارے کام محض دین بازی اور زر اندوزی کے لیے کیے گئے ہیں تو کسی بھی شخص کی نظر میں ان کاموں کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اعمال کے بارہ میں نیت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کسی شخص کا نیک سے نیک عمل بھی خدا کے ہاں کوئی وقعت نہیں پاتا اگر وہ نیت کی نیکی کے ساتھ انجام نہ دیا گیا ہو اور ایک آدمی اپنے برے عمل کے مواخذہ سے بھی بچ جائے گا اگر وہ عمل اس سے بلا ارادہ و نیت کے صادر ہو گیا ہو یا نیت تو اچھی رہی ہو لیکن کسی غلطی کے سبب سے فعل غلط صادر ہو گیا ہو۔

انسان کے کسی قول و فعل سے متعلق نیت اور محرک کا سوال ایک لازمی نتیجہ ہے اس کے ایک ذی ارادہ اور ذی اختیار ہستی ہونے کا۔ انسان کوئی پتھر، کوئی درخت، کوئی جانور نہیں ہے کہ اس کی صرف ظاہری حرکتوں ہی کو دیکھا جائے۔ ان حرکتوں کے پیچھے جو محرکات ہیں، ان کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے۔ اگر محرکات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایک انسان اور ایک حیوان میں فرق ہی کیا رہا؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں انسان کے صرف انہی اعمال کی اہمیت ہے جو ارادہ اور نیت کے تحت صادر ہوئے ہوں۔ جو اعمال جبر و اکراہ یا سہو یا بلا کسی قصد و ارادہ کے صادر ہو جاتے ہیں، اسلام ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ یہی اعمال ہیں جن کی خدا کے ہاں قبولیت یا عدم قبولیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر آدمی نے کسی کام کو نیک نیت اور نیک محرک کے تحت کیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل کو قبول فرمائے گا اور اگر اس نے کسی کام کو برے محرک کے تحت کیا ہے تو خواہ وہ عمل بظاہر کتنا ہی اچھا ہو لیکن وہ اصل محرک کے کھاتے ہی میں محسوب ہوگا۔ یہی بات حدیث شریف میں بیان ہوئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: انما الاعمال بالنیّة. و انما لامریٔ ما نوی. فمن کانت ھجرتہ الی اللّٰہ و رسولہ فھجرتہ الی اللّٰہ و رسولہ. و من کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأة یتزوّجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ.

(صحیح البخاری: کتاب الایمان والنذور باب ۲۳)

میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ ہر آدمی کے سامنے اس کی نیت ہی آئے گی۔ تو جس نے اپنی ہجرت اللہ اور رسول کے لیے کی تو اس کی ہجرت فی الواقع اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ لیکن جس کی ہجرت کسی غرض دنیوی کے لیے ہے جس کو

وہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی عورت کے لیے ہے جس سے وہ شادی کا طالب ہے تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہے جس کے لیے اس نے فی الواقع ہجرت کی ہے۔

اسلام میں اس نیت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بسا اوقات ایک آدمی ایک برائی کا ارتکاب نہیں کرتا لیکن خدا کے ہاں وہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھ لی جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسی طرح بسا اوقات وہ ایک نیکی کے کرنے کی سعادت سے محروم رہ جاتا ہے لیکن وہ بھی اس کے نامۂ اعمال میں درج ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے کرنے کی دل سے آرزو رکھتا تھا لیکن کسی رکاوٹ کے سبب سے وہ اس آرزو کو پورا نہ کر سکا۔ دو حدیثیں ملاحظہ ہوں جن سے ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا کہ:

اذا التقی المسلمان بسیفیھما فالقاتل والمقتول فی النار. قلت: یا رسول اللّٰہ! ھذا القاتل فما بال المقتول؟ قال: انہ کان حریصاً علی قتل صاحبہ.

(صحیح البخاری: کتاب الدیات باب ۱)

جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں سونت کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ میں نے عرض کی کہ جو قاتل ہے اس کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آتا ہے یا رسول اللہ! لیکن یہ مقتول کیوں جہنم میں جائے گا؟ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

دوسری حدیث جو نیک ارادہ سے متعلق ہے، وہ ملاحظہ ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان رسول اللّٰہ ﷺ رجع من غزوة تبوک فدنا من المدینة فقال: ان بالمدینة اقواماً ما سرتم مسیراً و لا قطعتم وادیاً الا کانوا معکم. قالوا: یا رسول اللّٰہ! وھم بالمدینة؟ قال: و ھم بالمدینة. حبسھم العذر.

(صحیح البخاری: کتاب المغازی باب ۷۶)

کہ نبی ﷺ غزوۂ تبوک سے لوٹ رہے تھے کہ مدینے کے قریب پہنچ کر آپ نے ارشاد فرمایا

کہ ہمارے پیچھے مدینہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کا حال یہ رہا ہے کہ تم نے جو گھاٹی بھی پار کی اور جس وادی سے بھی تم گزرے ہو اس میں وہ تمہارے ساتھ رہے ہیں۔ لوگوں نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! جبکہ وہ مدینہ میں ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ہاں! وہ مدینہ میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو کسی عذر کے سبب سے رکنا پڑا۔

عمل کے محرکات

نیت اور محرک کی اس اہمیت کے واضح ہو جانے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنا اچھی طرح نفسیاتی تجزیہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ہمارے اندر وہ کیا کیا محرکات ہیں جو ہمیں کسی عمل پر اکساتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ محرکات ظاہر میں تو بہت نظر آتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے ان کا جائزہ لیا جائے تو ان سب کو پانچ بنیادی محرکات کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہیں:

ضروریات، خواہشات، شہوات، جذبات اور نفس ناطقہ یا روح ملکوتی۔

مناسب ہوگا کہ اختصار کے ساتھ ان محرکات کا ہم تعارف بھی کرا دیں۔

ضروریات سے ہماری مراد زندگی کی وہ ابتدائی اور بنیادی ضروریات ہیں جن کے فراہم ہونے ہی پر ہماری ذات کی بقا منحصر ہے۔ یہ ضروریات انسان کو بہت سے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً اسے بھوک لگتی ہے تو وہ کھانا کھاتا ہے۔ پیاس لگتی ہے تو پانی پیتا ہے۔ تن ڈھانکنے کے لیے لباس پہنتا ہے۔ خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے پناہ گاہیں تلاش کرتا اور اسلحہ تیار کرتا ہے۔ موسم کی ناہمواریوں اور ناساعدتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے غذا کے ذخیرے جمع کرتا ہے۔ اور سردی، گرمی اور برسات کی تکلیفوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے مکان بناتا ہے۔

خواہشات کی منزل ضروریات سے ایک قدم آگے ہے۔ مثلاً کھانے پینے اور پہننے کی جہاں تک اصل ضرورت کا تعلق ہے وہ تو بہت معمولی غذا اور نہایت موٹے جھوٹے اور کھردرے کپڑوں سے بھی پوری ہو سکتی ہے لیکن انسان کی فطرت کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ صرف کسی نہ کسی طرح پیٹ پال لینا ہی نہیں چاہتا بلکہ قسم قسم کے لذیذ کھانوں اور لذیذ مشروبات کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ وہ صرف تن ڈھانکنے ہی پر کفایت نہیں کرتا بلکہ آرائش و زیبائش کا ذوق و شوق بھی رکھتا

ہے۔ وہ صرف گرمی اور برسات سے بچنے کے لیے اپنے سر پر ایک چھت ہی نہیں چاہتا ہے بلکہ آراستہ و پیراستہ کوٹھیوں اور بنگلوں کی خواہشیں بھی رکھتا ہے۔ یہی خواہشیں ہیں جو انسان کو ہزاروں لاکھوں کام کرنے پر آمادہ کرتی ہیں، بلکہ سچ پوچھیے تو اس دنیا کی ساری چہل پہل انسان کی ان خواہشوں ہی کی پیدا کردہ ہے۔ تعلیم و تہذیب اور تمدن و ترقی کے ناموں سے آج جو کچھ ہو رہا ہے، یہ سب انہی خواہشوں کے جلوے اور کرشمے ہیں۔ آرٹ اور صنعت و حرفت کے جو مظاہر آپ دیکھ رہے ہیں، سب کی تہ میں یہی خواہشیں کام کر رہی ہیں۔ یہی خواہشیں ہیں جو ایک خاص قسم کے نظامِ اخلاق کو وجود میں لاتی ہیں جس میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ عزت و شہرت کی خواہش، بقائے دوام کی آرزو، تفوق اور غلبہ کی کشمکش اور مقابلہ اور تنافس کی کشاکش کو حاصل ہوتی ہے۔

شہوات کو اگرچہ خواہشات کے عنوان کے تحت بھی لایا جا سکتا تھا، لیکن ہم نے اس کا ذکر ایک مستقل محرک کی حیثیت سے اس وجہ سے کرنا مناسب خیال کیا کہ اس میں اصل خواہش جنس کی ہوتی ہے۔ اس مرکزی خواہش سے دوسری خواہشیں جو ابھرتی ہیں ان سب کی حیثیت اسی خواہش کے لوازم و توابع کی ہوتی ہے۔ اگرچہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ زندگی کے مختلف میدانوں میں انسان کے وہ کیا کیا اقدامات ہیں جو محض اس کی شہوات کے مظاہر ہیں، کیونکہ اس میں بہت کچھ اختلاف رائے ہو سکتا ہے، لیکن اس بدیہی حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آج آرٹ میں، صنعت میں، ادب میں اور معاشرت و تمدن میں جو نمایاں مقام اس محرک کو حاصل ہے شاید ہی کسی دوسرے محرک کو حاصل ہو۔

جذبات سے ہماری مراد محبت و ہمدردی، نفرت و عداوت، رشک و حسد، غیرت و حمیت، غصہ و انتقام وغیرہ کے جذبات ہیں۔ یہ جذبات نفسِ انسانی کے اندر بڑی گہری جڑیں رکھتے ہیں اور جب ظاہر ہوتے ہیں تو بڑے زور و قوت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ انسان کو کسی عمل پر ابھارنے میں ان جذبات کو نہایت مؤثر عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ انسان کے بہت سے بھلے اور برے کام انہی جذبات کے مظاہر ہیں۔ ان کی مثال بھاپ کی ہے۔ بھاپ کو اگر صحیح طور پر کنٹرول میں رکھا جائے تو اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ اگر کنٹرول میں نہ رکھا جا سکے تو اس سے بہت سے خطرات بھی ظہور میں آ سکتے ہیں۔ جذبات بھی آدمی کے اندر بڑی طاقت

ہیں بشرطیکہ انسان ان پر قابو رکھ سکے۔ اگر ان کو قابو میں نہ رکھ سکے تو پھر ان سے زیادہ مہلک بھی کوئی اور چیز نہیں۔

نفسِ ناطقہ یا روحِ ملکوتی سے ہماری مراد وہ **نورِ یزدانی** (DIVINE SPARK) ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ڈالا ہے اور جس کو قرآن مجید میں وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر۔ ۱۵:۲۹) (اور اس میں — یعنی انسان — میں اپنی روح میں سے پھونک دوں) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی نورِ یزدانی سے مشرف ہونے کے بعد انسان فرشتوں کا مسجود بنا۔ یہی چیز ہے جس سے اس کو خیر اور شر کی معرفت حاصل ہوئی اور اس میں اعلیٰ اقدار کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ نور چونکہ انسان کو زمین سے نہیں بلکہ آسمان سے ملا ہے، اس وجہ سے اس کی لپک ہمیشہ خدا کی طرف رہتی ہے اور اگر نفس کے سفلی تقاضوں کے حجابات بہت سخت نہ ہوں تو یہ ہمیشہ انسان کو اوپر کی طرف اٹھاتا ہے۔ انسان کے تمام اعلیٰ اوصاف کا، جو اس کو حیوانات سے ممتاز کرتے ہیں، سرچشمہ یہی ہے۔ اسی نور کی وجہ سے انسان عقل کی رہنمائی سے نوازا گیا اور وحی و الہام کی ہدایت کے لائق ٹھہرا۔ یہ ایک ملکوتی محرک ہے جو انسان کو اعلیٰ کاموں پر ابھارتا ہے اور جب انسان کوئی اعلیٰ کام انجام دیتا ہے تو اس پر اس کی تحسین کرتا اور اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور اگر کوئی برا کام کر گزرتا ہے تو اس برے کام پر اس کو ملامت بھی کرتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی کو نفسِ لوّامہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے اور اس کو ایک روزِ جزا و سزا کے ثبوت میں ایک نہایت اہم انفسی دلیل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جو لوگ ڈارون کے مادہ پرستانہ نظریۂ ارتقاء کے اندھے بہرے معتقد ہیں وہ انسان کے اس باطنی نور سے بالکل بے خبر ہیں اور یہی بے خبری ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کے بہت سے میلانات کی یا تو سرے سے کوئی توجیہ کر ہی نہیں پاتے یا کرتے ہیں تو بالکل غلط کرتے ہیں۔ یہ لوگ ارتقاء کی بعض گم شدہ کڑیوں کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں حالانکہ اصلی کڑی، جس کی انہیں جستجو کرنی چاہیے، یہ ہے جس کی نشاندہی قرآن حکیم کر رہا ہے۔

مذکورہ محرکات کی حیثیت

یہی محرکات ہیں جو انسان کی تمام عملی سرگرمیوں کا منبع ہیں۔ اگر انسان کے اعمال کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کا ہر عمل انہی محرکات میں سے کسی نہ کسی محرک سے وابستہ نکلے گا۔

ان محرکات کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا انسان کے لیے یہ عقلاً و اخلاقاً مناسب ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان محرکات کے حوالہ کر دے اور یہ اس کو جس جس کوچہ اور جس جس وادی میں لیے پھریں وہ پھرتا رہے؟ اگرچہ دنیا میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جنہوں نے اپنی باگیں اپنی خواہشوں اور اپنے جذبات ہی کے حوالہ کر چھوڑی ہیں لیکن کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے مذکورہ بالا سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔ بلکہ ہر شخص یہی جواب دے گا کہ ان میں کوئی محرک بھی ایسا قابلِ اعتماد نہیں ہے کہ آدمی آنکھ بند کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اوپر کے چار محرکات — ضروریات، خواہشات، شہوات، جذبات — تو بالکل اندھے واقع ہوئے ہیں۔ یہ صرف اپنے تقاضے کو پورا کرنا اور اپنے مطلوب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ یہ جائز طریقہ سے حاصل کیے جائیں یا ناجائز طریقہ سے۔ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی انہیں سرے سے کوئی تمیز ہی نہیں ہے۔ یہ صرف اپنی تشنگی کے لیے سیرابی اور اپنی بھوک کے لیے غذا چاہتے ہیں اور اسی طرح چاہتے ہیں جس طرح ایک بیل، ایک گھوڑا اور ایک گدھا چاہتا ہے۔ وہ اس چاہنے میں نہ کسی قانونی حد کے پابند ہیں نہ کسی اخلاقی حد کے۔ جس حوض اور جس چراگاہ سے بھی ان کی ضرورت پوری ہو جانے کا امکان نظر آئے یہ ان کو اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں۔ یہ قناعت و ایثار اور اعتدال وغیرہ کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں۔ جس طرح ایک گدھے کے پاس ہر چیز کے ناپنے اور تولنے کا پیمانہ صرف اس کا پیٹ ہی ہے، اسی طرح یہ بھی ہر چیز کو بطن اور فرج ہی کے پیمانے سے ناپتے اور تولتے ہیں۔ جن لوگوں کی زندگیاں ان محرکات کے تحت گزرتی ہیں اور وہ ان سے بالاتر کسی شرعی و اخلاقی محرک کے قائل نہیں ہیں، وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے کہ:

يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (محمد۔ ۴۷:۱۲)

وہ اس طرح بہرہ مند ہو رہے ہیں اور کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں۔

ان میں سے پانچواں محرک — نفس ناطقہ یا روح ملکوتی — بلاشبہ اس اعتبار سے قابل اعتماد ہے کہ یہ ایک عقلی اور اخلاقی محرک ہے۔ اس کی روح ملکوتی اور اس کی پرواز ہمیشہ خدا کی طرف ہے، اس وجہ سے اس سے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ یہ انسان کو اسی دنیا کی کسی دلدل میں پھنسا دے۔ لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمام خوبیوں کے ساتھ ایک نقص اس کے اندر بھی ہے اور وہ ہے اس کے مزاج کا یک رخا پن۔ اپنے اس یک رخے پن کے سبب سے اس کا حال یہ ہے کہ اگر اس کو بغیر کسی روک ٹوک کے اپنی رو پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو یہ دوسرے محرکات کے ساتھ کوئی رواداری برتنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات ان کو نہ صرف نظر انداز کر کے بلکہ ان کو کچلتا اور پامال کرتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اس سے زندگی کے اندر وہ ناہمواریاں اور بے اعتدالیاں پیدا ہوتی ہیں جس کے مظاہر ہم جوگیوں، راہبوں اور درویشوں کی زندگیوں میں دیکھتے ہیں۔

خامیوں کا علاج

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان محرکات میں سے کوئی محرک بھی ایسا نہیں ہے جس پر آدمی پورا پورا اعتماد کر سکے۔ بعض اعتبارات سے اگر ان میں خوبیاں ہیں تو دوسرے پہلوؤں سے ان میں خرابیاں بھی ہیں۔ ہماری زندگی کی گاڑی کو پیچھے سے دھکیلتے رہنے کے لیے تو ان کا وجود نہایت ضروری ہے لیکن گاڑی میں جو جگہ ڈرائیور کی ہے اگر اس جگہ بھی انہی کو مسلط کر دیا جائے تو پھر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اندھے راہ دکھانے والے گاڑی کو کس کھڈ میں گرائیں۔

لیکن اگر یہ محرکات زندگی کے لیے ناگزیر بھی ہیں اور ساتھ ہی ان کے اندر نقائص بھی ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کیا طریقہ ہے کہ یہ اس افراط و تفریط سے پاک ہو سکیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے؟

افراط و تفریط سے پاک ہونے کے لیے اسلام نے دو باتیں ضروری قرار دی ہیں:

ایک یہ کہ ہمارے تمام محرکات کا حقیقی مطلوب اور اصلی نصب العین خدا کی رضا جوئی ہو۔

دوسری یہ کہ محرکات شتر بے مہار نہ ہوں بلکہ اپنی تمام سرگرمیوں میں خدا کی مقرر کی ہوئی حدود اور اس کی اتاری ہوئی شریعت کے قوانین کے پابند ہوں۔

خدا کی رضا جوئی کے نصب العین بن جانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے محرکات اپنے تمام مادی تقاضوں اور مطالبات سے دست بردار ہو جائیں گے۔ ان کے مادی تقاضے اور مطالبات بدستور قائم رہیں گے لیکن فرق یہ ہوگا کہ اب تک ان کی طلب اگر نفس کو خوش کرنے کے لیے تھی تو اب ان کی طلب خدا کو خوش کرنے کے لیے ہوگی۔ اب تک ہم جو کھاتے پیتے تھے تو اس لیے کہ نفس کا مطالبہ ہے لیکن نصب العین کے تبدیل ہو جانے کے بعد اس لیے کھائیں گے اور پہنیں گے کہ ہمارے رب کا حکم ہے۔ اب تک بیوی بچوں سے دلچسپی تھی تو اپنے نفس کی لذت و راحت کے لیے تھی لیکن اب ہوگی تو اس لیے کہ اس سے خدا راضی ہو۔ اب تک اگر کسی سے نفرت یا محبت تھی تو اپنے لیے تھی، اب اگر محبت ہوگی تو وہ بھی خدا کے لیے اور نفرت ہوگی تو وہ بھی خدا کے لیے۔

یہ نہ خیال کیجیے کہ یہ تبدیلی ایک ظاہری تبدیلی ہے یا کوئی معمولی تبدیلی ہے۔ یہ بڑی اہم تبدیلی ہے۔ جو فعل جس کی خاطر انجام دیا جائے گا اسی کا ذوق اور اسی کی پسند اس میں سب سے زیادہ نمایاں ہوگی۔ دوسروں کی پسند اور ناپسند کا لحاظ اس میں یا تو سرے سے ہوگا ہی نہیں یا ہوگا تو بس اسی قدر جس قدر کہ ان کی پسند اصل پسند کرنے والے کی پسند کے موافق ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بڑا فرق ہے اس غصہ میں جو ہم اپنے نفس کا انتقام لینے کے لیے کسی پر ظاہر کرتے ہیں اور اس غصہ میں جو ہم خدا کے کسی قانون کی بے حرمتی اور اس کی شریعت کی کسی اہانت پر ظاہر کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے اسلام میں ہمارے افعال و اعمال میں سے صرف وہی افعال و اعمال مقبول ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے نصب العین کے تحت انجام دیے گئے ہوں۔ اگر نصب العین یہ نہ ہو تو ایک عمل ظاہر میں کتنا ہی پاکیزہ ہو لیکن خدا کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس نصب العین کے ساتھ بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالنا بھی عبادت ہے لیکن اگر نصب العین بدل

جائے تو جہاد بھی نری دنیاداری بن کے رہ جاتا ہے۔ دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

انّ رسول اللہ ﷺ قال: انک لن تنفق نفقة تبتغی بها وجه الله الا أجرت علیها و حتّٰی ما تجعل فی فی امرأتک. (صحیح البخاری: کتاب الایمان باب ۴۰)

کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کچھ بھی تم خدا کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرو گے، اس پر اللہ کے ہاں اجر پاؤ گے یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی اجر پاؤ گے جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

جاء رجل الی النبی ﷺ فقال: الرجل یقاتل حمیّةً و یقاتل شجاعةً و یقاتل ریاءً فایّ ذالک فی سبیل الله؟ قال: من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا فهو فی سبیل الله. (صحیح البخاری: کتاب التوحید باب ۲۸)

رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص حمیت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے، دوسرا شخص شجاعت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے، تیسرا شخص ریا کی وجہ سے جنگ کرتا ہے، ان میں سے کس کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے حکم میں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے حکم میں صرف اس کی جنگ ہے جو اس لیے لڑے کہ خدا کے دین کا بول بالا ہو۔

خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کے معنی یہ ہیں کہ ان محرکات کو بگٹٹ ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر آگے بڑھتے ہوئے چلے جانے کے لیے چھوڑ نہ دیا جائے بلکہ ان کے منہ میں شریعت کی لگام لگائی جائے اور ان کے پاؤں میں حدودِ الٰہی کی زنجیریں ڈالی جائیں۔ خدا نے کھانے پینے، پہننے، شہوانی تقاضے پورے کرنے، محبت کرنے، نفرت کرنے، حتّٰی کہ عبادت کرنے تک پر بھی بہت سی شرطیں اور قیدیں لگائی ہیں جو حلال و حرام اور مکروہ و مباح کے امتیازات قائم کرتی ہیں اور ہر چیز کے فرض یا سنت یا مستحب ہونے کے درجے متعین کرتی ہیں۔ ان قیدوں اور شرطوں کا احترام نہایت ضروری ہے۔ ان کے احترام ہی سے خدا کی

رضا جوئی کے اعلیٰ نصب العین تک بندہ پہنچتا ہے اور زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبہ میں وہ اعتدال نمایاں ہوتا ہے جو انسان کے ہر قول و فعل کو عبادت بنا دیتا ہے اگرچہ وہ قول یا فعل بظاہر کتنا ہی دنیادارانہ ہو۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ان محرکات کے اندھے پن کا علاج وہ سرمۂ بصیرت ہے جو خدا کی رضا جوئی کے نصب العین سے حاصل ہوتا ہے اور ان کی افراط و تفریط کی بیماری شریعت کی پابندی سے دور ہوتی ہے۔

حدودِ الٰہی کی پابندی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت

یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد کہ زندگی کے محرکات کو صراطِ مستقیم پر پابرجا رکھنے کے لیے رضائے الٰہی کی طلب اور حدود اللہ کی پابندی ضروری ہے ایک نہایت اہم اور مشکل سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسان یہ مقام کس طرح حاصل کر سکتا ہے کہ خدا کی رضا جوئی کا نصب العین کبھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور زندگی کے تمام نشیب و فراز اور اس کے مخفی اور بعید سے بعید گوشوں میں بھی وہ حدودِ الٰہی کی نگہداشت قائم رکھ سکے؟

یہ مقام حاصل کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں: ایک ذکرِ الٰہی اور دوسری فکرِ آخرت۔ ان دونوں چیزوں پر مفصل بحث تو آگے اپنے اپنے مقام پر آئے گی لیکن مختصراً ان کا تعارف یہاں بھی ضروری ہے۔

ذکرِ الٰہی

ذکرِ الٰہی سے ہماری مراد ذکرِ الٰہی کی مداومت ہے۔ ہم چوبیس گھنٹوں میں جتنے موڑ بھی مڑتے ہیں، ہر موڑ پر خدا کو یاد کر لینا چاہیے۔ اس سے ہمیں یہ تنبہ ہوتا رہے گا کہ ہم کہیں کوئی غلط موڑ نہ مڑ جائیں۔ نیز ہر کام کے دوران میں بھی بار بار اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنا چاہیے تاکہ دورانِ کار میں ہم بھول کر کہیں سے کہیں نہ جا نکلیں۔ یہ یاد بیداری، ہوشیاری اور فہم و شعور کے ساتھ ہونی چاہیے تاکہ یہ زبان کی محض ایک ورزش بن کے نہ رہ جائے۔ اس کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی تکرار

کافی نہیں ہے بلکہ اس کی مختلف صفات کی یادداشت کا ذہن نشین ہونا بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ہر قدم پر خدا سے رہنمائی اور مدد بھی طلب کرتے رہنا چاہیے اور لغزشوں اور کوتاہیوں پر معافی بھی مانگتے رہنا چاہیے۔ اس یاد سے آدمی کا دل خدا پر جما رہتا ہے اور اگر شیطان کی چھوت سے کبھی قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سنبھال لیتا ہے۔

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ آدمی جب خدا کو بھول جاتا ہے تو خود اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اسے کچھ یاد نہیں رہتا کہ وہ دنیا میں کیوں آیا ہے؟ اس کو کس نے بھیجا ہے؟ اس دنیا کی حیاتِ چند روزہ کے بعد اس کو کہاں جانا ہے؟ اس کو جو نعمتیں ملی ہیں وہ کس نے بخشی ہیں اور کیوں بخشی ہیں؟ اس کو جو قوتیں اور صلاحیتیں ملی ہیں وہ کس نے دی ہیں اور کیوں دی ہیں؟ یہ اس کے شایانِ شان بھی ہیں یا نہیں؟ خدا کو بھولتے ہی وہ ان ساری باتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے نفس کی حقیر خواہشوں کے پیچھے پڑ کر حیوانات سے بھی نیچے اپنے آپ کو گرا دیتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ:

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۔ (الحشر۔۵۹:۱۹)

وہ اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے ان کو خود ان کی جانوں سے غافل کر دیا۔

برعکس اس کے جب آدمی خدا کو یاد رکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بھی یاد رکھتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کی قدر و قیمت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں خدا کا خلیفہ ہوں۔ وہ باخبر ہوتا ہے کہ میں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے مسجودِ ملائک ہوں۔ اس پر یہ حقیقت واضح رہتی ہے کہ اس حیاتِ چند روزہ کے امتحان میں اگر کامیاب ہو گیا تو میں ایک ابدی، لازوال خوشیوں اور مسرتوں کا حقدار بننے والا ہوں۔ یہ چیز اس کو اپنی زندگی کے سارے معاملات میں نہایت بیدار بنا دیتی ہے۔ وہ اپنی ایک ایک چیز کو اپنے رب کی امانت سمجھتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔

اس یاد کے لیے، جیسا کہ عرض کیا گیا، مداومت ضروری شرط ہے۔ جس طرح ہماری مادی زندگی کے بقا کے لیے ہر وقت سانس کی آمد و شد ضروری ہے اسی طرح ہماری روحانی زندگی کے بقا

کے لیے یہ یادِ الٰہی ہر وقت ضروری ہے۔ لیکن اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ آدمی زندگی کے سارے مشاغل چھوڑ کر بس یادِ الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو جائے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک خدا کی اس یاد کے لیے زندگی کی کش مکشوں سے الگ تھلگ ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس یاد کی اصلی برکت فکرِ معاش کی بھاگ دوڑ، تعلقات و روابط کی الجھنوں اور اقامتِ دین کی عملی و علمی سرگرمیوں ہی کے اندر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور زندگی کے تمام فرائض انجام دیتے ہوئے ہونی چاہیے۔ قرآن مجید سے ایسا ہی اشارہ نکلتا ہے۔ سورہ آل عمران کی اس آیت پر غور کیجیے:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (آل عمران۔۳:۱۹۱)

جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا!

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات نکلتی ہے کہ ذکرِ الٰہی اور فکرِ آخرت دونوں ساتھ ہوں تب یہ آدمی کو جادۂ حق پر استوار رکھنے میں معین ہوتے ہیں اور دوسری طرف قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ ذکر ایک چلتی پھرتی زندگی میں مطلوب ہے، اس کے لیے آدمی کو پاؤں توڑ کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ذکر سے متعلق ہم اس اصولی بحث ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ آگے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی بحث میں اس کے فوائد، آداب، اس کے اقسام اور طریقوں پر مفصل بحث کریں گے۔

فکرِ آخرت

فکرِ آخرت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ذکر کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یاد نتیجہ خیز اسی وقت ہوتی ہے جب بندہ اس ذکر کے ساتھ فکرِ آخرت کو بھی ملا لیتا ہے۔ یعنی آدمی اس حقیقت کا دھیان کرتا ہے کہ یہ زندگی اور اس زندگی کی تمام نعمتیں اور لذتیں فانی ہیں۔ جو پیدا ہوا ہے اس کے لیے مرنا ضرور ہے۔ یہ موت بچے کو بھی آتی ہے، جوان کو بھی آتی ہے اور بوڑھے کو بھی آتی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کس کی آخری گھڑی کب آ جائے گی۔ شاہ و گدا، عالم اور جاہل، کمزور اور طاقتور سب ہی اس کے حملہ کے آگے بے بس ہیں۔ قبر کی تاریکی و تنہائی سے سب ہی کو سابقہ پیش آتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اور یہ زندگی بے مقصد نہیں بنائی ہے کہ اسے ہم اچھی گزاریں یا بری، خدا کو اس سے کوئی بحث نہ ہو، وہ ضرور ہمارے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کا حساب کرے گا۔ ہم کوئی چیز بھی اس سے چھپا نہ سکیں گے۔ ہماری ہر خیانت، ہر چوری، ہر بے ایمانی پکڑی جائے گی اور کسی کی سفارش بھی خدا کی اجازت کے بغیر ہمیں نجات نہ دلا سکے گی۔ ایمان اور عمل صالح کے سوا کوئی چیز بھی کسی کو خدا سے قریب نہ کرے گی۔ خدا جس طرح غفور و رحیم ہے اسی طرح عادل اور منصف بھی ہے اور آخرت میں جس طرح اس کی رحمت ظاہر ہوگی، اسی طرح اس کا انصاف بھی ظاہر ہوگا۔ آخرت کی نعمتوں کی طرح اس کی سزائیں بھی ہمیشہ باقی رہنے والی ہوں گی اور جس طرح اس دنیا میں آخرت کی نعمتوں کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح آخرت کی سزاؤں کی شدت اور ہولناکی کا کوئی تصور بھی اس دنیا میں کرنا ممکن نہیں ہے۔

حجاباتِ ذکر و فکر

اگر اس ذکر و فکر کو آدمی برابر تازہ رکھ سکے تو نہ تو خدا کی رضا طلبی کا نصب العین اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگا اور نہ حدودِ الٰہی کی نگہداشت میں اس سے بے پروائی ہوگی۔ لیکن ہماری طبیعت کی بعض کمزوریاں ایسی ہیں جو اس ذکر و فکر کے لیے حجاب بن جاتی ہیں۔ ان حجابات میں سے سب سے زیادہ عام چیز غفلت ہے۔ دوسری چیز حیاتِ دنیا اور زخارفِ دنیا کی محبت ہے۔ تیسری چیز ہماری

خواہشات، شہوات اور ہمارے جذبات کے مطالبے ہیں۔

ان تینوں قسم کے حجابات پر اس سلسلہ کے پچھلے مباحث میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ان حجابات کو توڑنے کے لیے اسلام نے جو تدابیر بتائی ہیں ان پر مفصل گفتگو کی ضرورت ہے۔

غفلت کا علاج اسلام نے نماز بتایا ہے، محبتِ دنیا کا علاج انفاق فی سبیل اللہ ہے، شہوات و خواہشات کا زور روزہ سے ٹوٹتا ہے اور ان تمام امراض کا جامع اور آخری علاج حج ہے۔

اب ہم بالترتیب انہی پر گفتگو کریں گے۔

باب ۱۲

نماز، آفاتِ نماز اور ان کا علاج

خدا سے غفلت کو دور کرنے کا سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر نسخہ نماز ہے۔ یہ نسخہ خود اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا ہے۔ اس نے خود فرمایا ہے کہ مجھے یاد رکھنا چاہو تو نماز قائم کرو:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ٥ (طٰہٰ۔ ۲۰:۱۴)
اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام رکھیو۔

نماز کے شرائط، نماز کے اوقات، نماز کی صورت و ہیئت، نماز کی دعائیں، غرض اس کی ایک ایک چیز انسان کو بیدار کرنے والی اور جھنجوڑنے والی ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص نماز کا اس کے تمام شرائط و آداب کے ساتھ اہتمام کرے اور اس کے دل پر غفلت کا میل کچیل باقی رہ سکے۔ نفس انسانی پر اس کا جو اثر پڑتا ہے اور یہ جس طرح آدمی کو پاک اور بیدار رکھتی ہے اس کی حقیقت خود نبی ﷺ نے ایک حدیث میں نہایت عمدہ تمثیل کے ذریعہ سے سمجھا دی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

انه سمع رسول الله ﷺ يقول: أرأيتم لو انّ نهراً بباب احدكم يغتسل فيه كل يوم خمساً ما تقول: ذالك يبقى من درنه؟ قالوا: لا يبقى من درنه شيئا. قال: فذالك مثل الصلوات الخمس. يمحو الله بها الخطايا.
(صحیح البخاری: کتاب مواقیت الصلاۃ باب ۵)

کہ انہوں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا کہ بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ پانچ مرتبہ روزانہ نہاتا ہو تو کیا ایسے شخص پر میل کچیل کا کوئی اثر باقی رہے گا؟ لوگوں نے کہا نہیں، یا رسول اللہ ایسے شخص پر میل کچیل کا کوئی اثر باقی نہیں رہے گا۔ آپؐ نے فرمایا: یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے۔ ان کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالیٰ بندے کے گناہوں کو دھوتا رہتا ہے۔

انہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت ہے:

ان رسول الله ﷺ قال: يعقد الشيطان على قافية رأس احدكم اذا هو نام ثلاث عقد يضرب كل عقدة: عليك ليل طويل فارقد. فان استيقظ فذكر الله انحلّت عقدة. فان توضأ انحلّت عقدة. فان صلّى انحلّت عقدة. فاصبح نشيطا طيب النفس والا اصبح خبيث النفس كسلان.
(صحیح البخاری: کتاب التہجد باب ۱۲)

کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص سو جاتا ہے تو شیطان اس کے سر کے پچھلے حصے میں تین گرہیں لگا دیتا ہے اور ہر گرہ پر یہ پھونک مار دیتا ہے کہ ابھی بڑی رات پڑی ہے، سوتے رہو۔ پھر اگر وہ جاگ جاتا ہے اور اللہ کو یاد کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ وضو کر ڈالتا ہے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے اور اگر وہ نماز پڑھ ڈالتا ہے تو ساری گرہیں کھل جاتی ہیں اور وہ بالکل ہشاش بشاش اور چاق چوبند ہو جاتا ہے، ورنہ بالکل پژمردہ اور سست رہتا ہے۔

نماز کے شرائط

نماز کی یہ تاثیر کسی ایک ہی چیز کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان تمام چیزوں کو اس تاثیر میں دخل ہے جن سے نماز عبادت ہے۔ اس کے شرائط میں سے پاکی اور وضو ہے۔ ان کے اہتمام سے آدمی کو تازگی اور نشاط حاصل ہوتا ہے، طبیعت پر سے کسل کا گرد و غبار دھل جاتا ہے اور آدمی کا عضو عضو خدا کی بندگی سے سرشار ہو جاتا ہے اور بندگانِ خدا کے ساتھ آدمی کا ربط بڑھتا ہے

اور دعا و عبادت میں ان کا تعاون حاصل ہوتا ہے جس سے دعا و عبادت میں برکت ہوتی ہے کیونکہ انفرادی دعا کے مقابل میں جماعت کی دعا خدا کی رحمت کو زیادہ متوجہ کرنے والی ہے۔

نماز کے اوقات

اس کے لیے جو اوقات مقرر ہیں، یہ بھی عبادت کے لیے موزوں، قبولیت دعا کے لیے سازگار، بندہ کے ذہن کے لیے سکون بخش، عناصر کائنات کے اوقات تسبیح وتہلیل سے مطابق اور شمس وقمر اور شجر وحجر کے اوقات رکوع وسجود سے ہم آہنگ ہیں۔ فجر، چاشت، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور تہجد کے اوقات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی وقت بھی ایسا نہیں ہے جو مذکورہ بالا اعتبارات سے ایک خاص اہمیت نہ رکھتا ہو۔

فجر کا وقت فراغ خاطر اور سکون قلب کا خاص وقت ہے۔ آدمی شب میں آرام کرنے کے بعد جب اٹھتا ہے تو اس کا دل پوری طرح مطمئن ہوتا ہے۔ عبادت کے لیے ایک نئی حرکت کا آغاز ہوتا ہے، زندگی ایک نئے عزم کی محتاج ہوتی ہے اور یہ نیا عزم خدا کی طرف سے تازہ توفیق اور تازہ ہدایت کا طلبگار ہوتا ہے۔

ظہر کا وقت ایک دوسری حقیقت کا اعلان کرتا ہے۔ آدمی دیدۂ بینا رکھتا ہو تو اس وقت ایک اور حقیقت نظر آتی ہے اور وہ بھی آدمی کو رکوع وسجود کی دعوت دیتی ہے۔ وہ یہ کہ اس وقت سورج، جس کو نادانوں نے معبود کا درجہ دے کر مسجود بنایا، خود اپنے خالق کے آگے اپنی کمر خم کرتا ہے اور خود اپنے عمل سے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ خالق نہیں بلکہ مخلوق اور معبود نہیں بلکہ عابد ہے۔

عصر کا وقت ایک نئی حقیقت کی منادی کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ہر عروج کے لیے زوال، ہر جوانی کے لیے بڑھاپا اور ہر مد کے لیے جزر مقدر ہے۔ کائنات کی کوئی چیز بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ صرف ایک ہی ذات ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، اس کے سوا کسی کے لیے بھی بقا نہیں۔ جس طرح دن چڑھا اس کی دوپہر ہوئی اور اب غروب کے کنارے کھڑا ہے اسی طرح یہ دنیا بھی پیدا ہوئی، شباب کو پہنچی اور ایک دن خاتمہ کے قریب جا لگے گی۔ عصر کے وقت یہ خاموش تذکیر بندہ کو اس بات پر اکساتی ہے کہ وہ آخرت کو یاد کرے اور توبہ واستغفار کے لیے اپنے رب کے حضور

سجدہ ریز ہو۔

مغرب کے وقت زندگی ایک نئے دروازے میں داخل ہوتی ہے۔ یہ دروازہ حیات کے بعد موت اور زندگی کے بعد برزخ کے دروازہ سے مشابہ ہے۔ مصرّف کائنات دن کی نشانی کے بعد رات کی نشانی اور سورج کی تابانی کے بعد چاند کی چاندنی دکھاتا ہے۔ دن کے ہنگامے سرد پڑتے ہیں اور ستاروں کی بزم آراستہ ہوتی ہے، گرمی، لو اور دن کی شوراشوری کی تلخیاں کم ہوتی ہیں اور دن بھر کا تھکا ہارا انسان رات کی خنک لوریوں میں ایک نئی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ بے حس اور بلید لوگ ممکن ہے کائنات کے اتنے بڑے الٹ پھیر کو کچھ نہ محسوس کرتے ہوں، جس کے اندر حس موجود ہوگی وہ اس سے بے خبر کیسے گزر سکتا ہے؟ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ آدمی اتنی بڑی قدرت وحکمت کا مشاہدہ کرے اور جس قدیر وحکیم نے یہ قدرت وحکمت دکھائی ہے، اس سے بالکل بے پروا اور بے نیاز رہ سکے! اگر اس کے دل کے اندر زندگی کی کوئی رمق ہے تو وہ اس موقع پر ضرور متنبہ ہوگا اور اپنے اس خالق ومالک کے آگے اپنا سر نیاز جھکائے گا جس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اس نے آن کی آن میں پوری دنیا کو شب کی چادر میں چھپا دیا۔

عشاء کا وقت ایک احتساب کا وقت ہے۔ رات کی تاریکی بڑھ کر حرکت وعمل کے آخری آثار کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ آدمی ہر چیز سے کنارہ کش ہو کر سکون اور آرام کا طالب ہوتا ہے تاکہ آنے والی منزل کے سفر کے لیے تازہ ہو سکے۔ یہ وقت اس بات کے لیے نہایت موزوں ہوتا ہے کہ آدمی بستر پر جانے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے رب کے حضور میں حاضری دے لے۔ ممکن ہے یہ فرصت، آخری فرصت ہی ہو اور آج کے سونے کے بعد اس کو جاگنا نصیب نہ ہو۔

تہجد کا وقت راز ونیاز اور سرگوشی ومناجات کا وقت ہے۔ پرسکون اور سکون بخش ہونے کے لحاظ سے شب وروز کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ اس وقت سب سو رہے ہوتے ہیں۔ شاید شیطان بھی سو رہا ہوتا ہے۔ صرف وہ رب غفار وکریم جاگتا ہے جو کبھی نہیں سوتا یا پھر وہ جاگتا ہے جس کا بخت بیدار ہوتا ہے۔ اٹھیے اور ستاروں کی چھاؤں میں کھڑے ہو جائیے تو فی الواقع محسوس ہوگا کہ آسمان کے دریچے کھلے ہوئے ہیں اور سمائے دنیا سے توبہ اور رحمت کی منادی ہو رہی ہے۔ اس وقت کی

کیفیات ایسی واضح ہیں کہ اس کو دنیادار اور دیندار، رند اور زاہد دونوں ہی جانتے ہیں۔ سونے والے اس کو سونے کے لیے بہترین وقت سمجھتے ہیں اور جاگنے والے اس کو جاگنے کے لیے سب سے بہتر وقت سمجھتے ہیں اور فی الحقیقت ان دونوں کا سمجھنا صحیح ہے۔ جو وقت سونے کے لیے سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہوگا، وہی جاگنے کے لیے بھی سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہوگا۔ قربانی تو عزیز و محبوب ہی کی مقبول ہوتی ہے۔ چنانچہ اس وقت کو اللہ تعالیٰ نے بھی مقربین کی نماز کے لیے خاص کیا ہے۔ جن کے پہلو اس وقت بستر کی لذت کو چھوڑتے ہیں ان کی التجائیں اور دعائیں سننے کے لیے وہ خود سمائے دنیا پر اترتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی میری رحمت کا طالب کہ میں اس کو اپنی رحمت کے دامن میں چھپالوں؟

یہ اوقات ہیں جو نماز کے لیے مقرر ہیں۔ غور کیجیے کہ ان میں سے ایک ایک وقت اپنے اندر کتنی معنویت اور کتنی تاثیر رکھتا ہے۔

نماز کی ہیئت

اب آیئے، نماز کی ہیئت و صورت پر ایک نظر ڈالیے۔ نماز کے لیے جب بندہ کھڑا ہوتا ہے تو عجز و نیاز مندی کی تصویر بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ ہاتھ باندھے ہوئے، نگاہ نیچی کیے ہوئے، گردن جھکائے ہوئے، پاؤں برابر کیے ہوئے، دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے بالکل بے تعلق، سنجیدگی اور خاموشی کی تصویر، ادب اور وقار کا مجسمہ، کبھی اپنے خالق و مالک کے آگے سر جھکا دیتا ہے، کبھی اپنی ناک اور پیشانی زمین پر رکھ دیتا ہے، کبھی ہاتھ پھیلا کر اس سے دعا اور التجا کرتا ہے۔ غرض عاجزی اور تذلل کی جتنی شکلیں بندہ اختیار کرسکتا ہے، ادب اور وقار کے ساتھ ان ساری ہی شکلوں کو اختیار کرتا ہے۔ اس طرح ایک نماز پڑھنے والے کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ صاف گواہی دیتی ہے کہ بندہ اپنے مالک و مولیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر وہ دیکھ نہیں رہا ہے تو یہ یقین تو وہ ضرور رکھتا ہے کہ اس کا مالک و مولیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہی نماز ہے جس کو احسان کی نماز کہتے ہیں۔ یہ نماز فقہی نماز سے ایک مختلف مزاج رکھتی ہے۔ تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے معتبر نماز یہی ہے۔ یہ

نماز، نماز پڑھنے والے کے باطن کا عکس ہوتی ہے۔ اس نماز میں نمازی کے دل کا خضوع و خشوع جھلکتا ہے۔ اس میں خدا کے آگے بندہ کی صرف کمر ہی نہیں جھکتی بلکہ اس کا دل بھی جھک جاتا ہے۔ صرف اس کی پیشانی ہی خاک آلود نہیں ہوتی بلکہ اس کی روح بھی سجدہ ریز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص نفاق کی نماز پڑھتا ہے، اس کی کسل مندی، اس کی جمائیاں، اس کا بدن کو توڑنا مروڑنا، انگلیوں کا چٹخانا، سر کو کھجلانا، دامن اور گریبان سے کھیلنا، داڑھی کے بالوں سے شغل کرنا اور اس طرح کی دوسری حرکتیں صاف گواہی دیتی ہیں کہ اس کا جسم حاضر ہے لیکن اس کا دل غائب ہے۔ یہ آیا نہیں بلکہ لایا گیا ہے۔ اس کا بدن مسجد میں ہے لیکن اس کی روح بازار میں گردش کررہی ہے اور گو دوسروں کی دیکھا دیکھی یا رسم کی پابندی کی خاطر اپنی گردن یہ بھی جھکا دیتا ہے لیکن اس کا دل بدستور اکڑا ہی رہتا ہے۔

نماز کی دعائیں

اب ذرا ایک اجمالی نظر نماز کی دعاؤں پر ڈالیے۔

نماز کا آغاز ابراہیمی دعا سے ہوتا ہے۔ یعنی اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ. (الانعام۔۶:۷۹) (میں نے تو اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں)۔ جس میں بندہ سب سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنے رب سے جڑنے کے عزم کا اظہار کرتا ہے جس میں وہ اپنی نماز اور اپنی قربانی اور اپنی زندگی اور اپنی موت، ہر چیز کو صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کرنے کا اقرار کرتا ہے۔ وہ اس خدا کی خدائی میں آسمان و زمین میں سے کسی کی شرکت تسلیم نہیں کرتا اور پورے عزم کے ساتھ شرک سے اپنی براءت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مسلم ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ یہ صرف ایک کلمہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس یادگار اعلانِ حق کی ایک پوری تاریخ ہے جو انہوں نے اپنی قوم کے سامنے کیا ہے اور ہر قسم کی دشمنیوں اور دوستیوں، ہر قسم کے فوائد و مصالح اور ہر قسم کے خطرات و مصائب سے بالکل بے پروا ہو کر کیا ہے۔ اس اعلانِ حق کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کی

بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ اس میں انہوں نے خدا کے لیے ہر چیز سے جس دستبرداری کا اظہار فرمایا تھا، اس کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ان کو فی الواقع ہر چیز سے دامن جھاڑ کر اٹھنا پڑا اور وہ دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو محض استعارہ کی زبان میں نہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں زندگی اور موت کی بازیاں بھی کھیلنی پڑیں اور وہ ان بازیوں میں بھی سو فی صد کامیاب رہے۔

یہ یادگار کلمہ زبان سے ادا کر کے جب بندہ نماز میں داخل ہوتا ہے تو اس کی عظیم معنویت اور اس کی عظیم تاریخ، اس کی روح کو ابراہیمی اخلاص اور ابراہیمی حنفیت سے لبریز کر دیتی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں صرف ایک مصلی ہی نہیں ہوں بلکہ ایک صف شکن مجاہد بھی ہوں۔ وہ اپنے رب کے آگے اس کے ساتھ اپنی وفاداری کا عہد کرتا ہے لیکن یہ صرف وفاداری کا عہد نہیں ہوتا بلکہ دنیا کے ہر باطل سے بغاوت کا اعلان بھی ہوتا ہے اور اس راہ میں سب کچھ قربان کر دینے کا غیر متزلزل عزم بھی۔

اس دعا کے بعد بندہ خدا کی بڑائی کی گواہی دیتے ہوئے نماز میں داخل ہوتا ہے۔ یہ گواہی وہ ڈرتے اور سہمے ہوئے نہیں دیتا بلکہ دونوں ہاتھ اٹھا کر گواہی دیتا ہے جس سے اس کے عزم کا اظہار اور اس کے یقین کا اعلان ہوتا ہے۔

پھر وہ سورہ فاتحہ پڑھتا ہے۔ یہ دعا وہ دعا ہے جس سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے کوئی اور دعا نہیں۔ یہ دعا خود خداوند عالم کی سکھائی ہوئی ہے۔ اس میں بندہ جس طریقہ سے اپنے رب سے مانگتا ہے اس سے بہتر طریقہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور جو کچھ مانگتا ہے اس سے بہتر کوئی دوسری چیز مانگنے کی ہو ہی نہیں سکتی۔ خدا نے خود ہی بتا دیا ہے کہ اس سے مانگنے کا طریقہ کیا ہے اور اسی نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اصلی مانگنے کی چیز کیا ہے۔ جب سوال کی تمہید بھی ٹھیک ہو، جو چیز مانگی گئی ہے وہ بھی مانگنے کی ہو اور تنہا اسی سے مانگنے کی ہو جس سے مانگی جا رہی ہے اور دینے والا بھی تمام کریموں سے بڑھ کر کریم ہو تو پھر اس کی قبولیت میں کیا شک ہو سکتا ہے! چنانچہ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے خبر بھی دی ہے کہ بندہ جب یہ دعا پڑھتا ہے تو رب کریم اس کے ایک ایک لفظ کو کس طرح شرف قبولیت بخشتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

فانی سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: قال اللّٰہ تعالی: قسمت الصلاۃ بینی و بین عبدی نصفین و لعبدی ما سأل. فاذا قال العبد: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ قال اللّٰہ تعالی: حمدنی عبدی. و اذا قال: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قال اللّٰہ تعالی: اثنی علیّ عبدی. و اذا قال: مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ قال: مجّدنی عبدی. فاذا قال: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ قال: ھذا بینی و بین عبدی و لعبدی ما سأل. فاذا قال: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ قال: ھذا لعبدی و لعبدی ما سأل.

(صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ باب ۱۱)

میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے نماز کی دعا کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے۔ اور میرا بندہ جو کچھ مانگتا ہے وہ پاتا ہے۔ جب بندہ [شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب] کہتا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میرا شکر ادا کیا۔ جب بندہ [رحمان اور رحیم] کہتا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری تعریف کی۔ جب وہ [جزا و سزا کے دن کا مالک] کہتا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری بڑائی بیان کی۔ جب وہ [ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں] کہتا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندہ کو وہ دیا جو اس نے مانگا۔ پھر جب بندہ [ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش، ان لوگوں کے رستے کی جن پر تو نے اپنا فضل فرمایا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ] کہتا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ یہ خاص میرے بندہ کا حصہ ہے اور میں نے اس کو بخشا جو اس نے مانگا۔

آدمی نماز میں جب اس دعا کو پڑھتا ہے اور ساتھ ہی یہ خیال کرتا جاتا ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کو مالک الملک کس طرح قبول فرما رہا ہے جس سے یہ دعا کی جا رہی ہے تو اس کی روح وجد میں آ جاتی ہے۔ یہ خیال اس دعا کے ایک ایک لفظ کو لعل و گہر سے بھی زیادہ قیمتی بنا دیتا ہے اور ان کو اونگھتے ہوئے زبان سے نہیں ادا کرتا بلکہ وہ اس جوہری کی طرح ان کو آسمان و زمین کے بادشاہ کے سامنے پیش کرتا ہے جس کو اس کے ایک ایک گہر کے بدلے ان کے حقیقی قدردان کے ہاتھوں

دولت کے خزانے ملنے والے ہوں۔

سورہ فاتحہ کے بعد بندہ قرآن مجید کی کوئی سورت یا اس کا کوئی حصہ پڑھتا ہے۔ قرآن مجید کا کوئی حصہ بھی پڑھا جائے، یہ اس کتاب کا اعجاز ہے کہ اس کے ہر حصہ میں وہ اصل چیز موجود ہوتی ہے جس کی تعلیم و دعوت کے لیے قرآن اترا ہے۔ خدا کی صحیح تعریف، زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ، آخرت کا بیان اور جزا و سزا کا ذکر اس کے ہر حصہ میں ملے گا، اسلوب اور انداز بیان بدلے ہوئے ہوں گے۔ کہیں ایک بات قانون کی شکل میں ہوگی، کہیں موعظت کی شکل میں، کہیں قصہ کی شکل میں، کہیں تمثیل کے پیرایہ میں، کہیں دھمکی کا انداز ہوگا، کہیں پیار و محبت کا لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھا یا سنا جائے — تین آیتوں کے بقدر ہی سہی — اور آدمی کے سامنے نہایت مؤثر اور دل نشین انداز میں اس حقیقت کی یاددہانی نہ ہوجائے جو اس کی زندگی کے رخ کو صحیح رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

اس کے بعد رکوع و سجود کی تسبیحات ہیں۔ ان تسبیحات میں بندہ اپنے رب کا ہر عیب سے پاک ہونا اور اس کا سب سے بڑا ہونا اور اس پاکی اور بڑائی کا عملی اعتراف و اظہار اس طرح کرتا ہے کہ پہلے اس کے آگے زمین کے قریب تک جھک جاتا ہے اور پھر اپنی پیشانی اور اپنی ناک اس کے سامنے زمین پر رکھ دیتا ہے۔

خاتمۂ نماز پر بیٹھ کر بالعموم تین دعائیں پڑھی جاتی ہیں: التحیات، درود شریف اور استغفار۔ ان تینوں میں بندہ تین سب سے بڑے حقوق کو ادا کرتا ہے۔ بندہ پر سب سے بڑا حق اس کے رب کا ہے، اس لیے پہلے التحیات میں وہ اس کے حضور میں سلامی اور نیاز کا تحفہ پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی نبی ﷺ اور اس کے نیک بندوں پر بھی سلام و رحمت بھیجتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا حق نبی ﷺ کا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد نبی ﷺ اور آپؐ کے ازواج و ذریاتؓ پر درود و سلام بھیجتا ہے۔

اس کے بعد ماں باپ، قرابت مندوں اور دوسرے دینی بھائیوں بہنوں کے حقوق ہیں۔ چنانچہ آخر میں ان سب کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور اس کے بعد سلام پر اپنی نماز ختم کرتا ہے۔

یہ نماز کی وہ خصوصیات بیان ہوئی ہیں جن کا ملحوظ رہنا نماز کی صحت اور اس کی افادیت کے لیے ضروری ہے۔ یہ نماز اگر ایک شخص دن رات میں کم از کم پانچ مرتبہ پڑھتا ہے تو یہ ایک نہایت مؤثر واعظ اور زاجر ہے اس کو بے حیائی اور برائی سے روکنے کے لیے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت ۔ ۲۹: ۴۵) (نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے)۔ روکنے کا مطلب یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں کم از کم پانچ مرتبہ آدمی کی زندگی کے رخ کو صحیح کرنے کے لیے یاددہانی کرتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ یاددہانی نہایت مؤثر یاددہانی ہے بشرطیکہ آدمی نماز کو نماز کی طرح پڑھے اور نماز جو تذکیر کرتی ہے آدمی اس کو قبول کرے۔ اگر وہ نماز کو محض ایک رسم بنا کے رکھ دے، اس کے اندر اٹھنا بیٹھنا محض ضابطہ کی خانہ پری رہ جائے اور اس کی دعائیں بے سمجھے بوجھے منتر کی طرح پڑھی جانے لگیں تو پھر نماز ایک بالکل بے معنی اور بے مقصد چیز بن کے رہ جائے گی۔

نماز کی آفات

اوپر کی تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہے کہ تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے نماز کی کیا اہمیت ہے اور وہ کون سی نماز ہے جو آدمی کو درست رکھتی ہے لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی اگر ہم یہ نہ بتائیں کہ نماز کی وہ بیماریاں کیا ہیں جو اس کو بالکل بے مقصد اور بے معنی بنا کے رکھ دیتی ہیں اور ان بیماریوں کا علاج کیا ہے؟ اب ہم مناسب ترتیب کے ساتھ نماز کی چند معروف بیماریوں کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی، اپنے علم کی حد تک، ان کے علاج بھی بیان کریں گے۔

کسل

نماز کو برباد کرنے والی سب سے عام آفت کسل اور سستی ہے۔ یہ بیماری جب کسی شخص کو لاحق ہو جاتی ہے تو نہ وہ وقت کی پابندی برقرار رکھ سکتا ہے، نہ جماعت کا اہتمام قائم رکھ سکتا ہے اور نہ نماز میں حضور قلب کی کیفیت پیدا کرسکتا ہے۔ ایسا شخص اول تو آہستہ آہستہ سرے سے نماز غائب ہی کر

دیتا ہے لیکن پڑھتا ہے تو اس طرح کہ اس کی نماز ان تمام اوصاف سے خالی ہونے کے سبب سے، جو نماز میں اثر پیدا کرتے ہیں، بالکل بے جان اور بے روح ہوتی ہے۔ اس کسل کا سبب ظاہر میں کئی چیزیں ہوتی ہیں: کبھی نیند ہوتی ہے، کبھی مشغولیت ہوتی ہے اور کبھی بعض دنیوی دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ لیکن اگر معاملہ کی تہہ میں اتر کر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ اسباب محض ظاہری اسباب ہیں، اس کا حقیقی سبب درحقیقت ان ظواہر میں نہیں بلکہ دل کے اندر ہے۔

ایک کسل تو وہ ہے جو طبیعتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ نیند، تکان اور مشقت طلب مشغولیتیں مستعد سے مستعد آدمی کے اندر بھی کچھ نہ کچھ سستی پیدا کر دیتی ہیں۔ اس سستی پر ارادہ کی تھوڑی سی تربیت سے انسان آسانی سے قابو پا لیتا ہے۔ لیکن ایک سستی وہ ہوتی ہے جو نفاق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کا علاج مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے۔ قرآن نے سورہ نساء میں اس کا ذکر کیا ہے:

> اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (النساء ۴:۱۴۲)
>
> منافقین خدا سے چالبازی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ چال وہ ان سے چل رہا ہے۔ اور جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو الکسائے ہوئے اٹھتے ہیں محض لوگوں کے دکھانے کے لیے۔ اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

جہاں تک نفاق کا تعلق ہے اس کا ذکر تو آگے اپنی جگہ پر آئے گا لیکن نماز کے سلسلہ میں عام کسل کو دور کرنے کے لیے چند چیزیں مفید ہیں۔ ان کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ نماز کی دین میں جو اہمیت ہے آدمی اپنے دل میں اس کو اچھی طرح جمائے۔ نماز ایمان کا پہلا مظہر ہے۔ ایمان سے پہلی ہی چیز جو پیدا ہوتی ہے وہ نماز ہے اور پھر نماز ہی سے سارا دین پیدا ہوتا ہے۔ دین جن ستونوں پر قائم ہے، ان میں ایمان کے بعد سب سے پہلا ستون یہی ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص اس ستون کو ڈھا دے تو اس نے درحقیقت پورے دین کو ڈھا دیا۔ صحابہ کرامؓ کفر و ایمان کے درمیان نماز ہی کو حد فاصل سمجھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں اور عمال کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ تمہاری سب سے بڑی ذمہ داری نماز کا قیام و

اہتمام ہے۔ جو شخص نماز کو ضائع کر دے گا، وہ بقیہ دین کو بدرجہ اولیٰ ضائع کر دے گا۔ دین کا منبع اور سرچشمہ چونکہ نماز ہی ہے، اس وجہ سے دین کی حفاظت میں اس کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ اسی چیز کے اہتمام سے آدمی اپنے پورے دین کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر اس میں سست پڑ جائے یا اس کو ضائع کر دے تو پھر وہ دین کی ساری حدیں توڑ کے رہتا ہے اور اپنی باگ شہوات کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اہل کتاب کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے نماز ضائع کر دی اور شہوات میں پڑ گئے۔

اسی ذیل میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دین میں ہر چیز کا ایک مقام ہے اور یہ مقام خود اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ جو چیز ستون دین کی حیثیت رکھتی ہے وہ بہر حال ستون دین ہے۔ جب تک اس کو قائم نہ کیا جائے گا دین کو قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص نماز کو قائم نہ کرے اور بزعم خویش دن رات اسلام کی خدمت میں لگا رہے تو اقامت دین کے نقطۂ نظر سے اس کی ساری کوشش لاحاصل رہے گی کیونکہ وہ ایک عمارت بغیر بنیاد کے بنا رہا ہے۔ جس طرح ایک عمارت میں بنیاد کا بدل کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی اسی طرح دین میں نماز کا بدل کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی حقیقت کو حدیث میں یوں سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے نوافل کو اس وقت تک قبول نہیں فرماتا جب تک وہ فرائض نہ ادا کرے۔

دوسری چیز جو اس کسل کو توڑنے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو سعی الی ذکر اللہ کا عادی بنائے۔ **سعی الی ذکر اللہ** کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اذان کو خدا کی پکار سمجھے اور جونہی کانوں میں اذان کی پکار پڑے، سارے کام چھوڑ کر نماز کے اہتمام اور مسجد جانے کی تیاریوں میں لگ جائے۔ اس اہتمام اور تیاری کا انداز کسل مندانہ نہ ہو بلکہ ایک مستعد اور چاق و چوبند آدمی کا ہو۔ جس طرح ایک فرمانبردار غلام آقا کے حکم کے لیے گوش بر آواز رہتا ہے اور اس کی پکار سنتے ہی دوسرے سارے دھندے چھوڑ چھاڑ کر تعمیل حکم کے لیے حاضر ہو جاتا ہے، اسی طرح آدمی کو چاہیے کہ اذان کی آواز سنتے ہی نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ نماز کے وقت سب سے زیادہ ضروری، سب پر مقدم اور سب سے اہم فرض اللہ تعالیٰ کے نزدیک نماز ہی ہے۔ اضطرار اور مجبوری کے حالات کے سوا کوئی دوسرا کام، خواہ وہ دین ہی کا کام

ہے۔ یہ حادثہ اگر بار بار پیش آنے لگے تو چکی اس قدر خراب ہو جاتی ہے کہ اس میں اچھا آٹا تیار کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ عمدہ سے عمدہ گندم بھی اس میں ڈالیے تو بھی آٹا کرا ہی نکلے گا۔

جو آدمی اپنے ذہن میں اچھے خیالات کی پرورش کا عادی ہو جاتا ہے نماز میں اس کو وسوسے کم لاحق ہوتے ہیں کیونکہ وہ جس طرح کے خیالات سے مانوس ہوتا ہے اسی طرح کی روحانی غذا اس کو نماز میں بھی مل جاتی ہے اور اگر کچھ خیالات پیدا ہوتے ہیں تو وہ ایسے پست نہیں ہوتے کہ نماز کے بلند مقصد سے بالکل بے جوڑ ہو جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صاحب حضور و شہود کی نماز میں بھی کبھی کبھی خارجی حالات خلل انداز ہو ہی جاتے تھے۔ کبھی کبھی عین حالت نماز میں ان کا ذہن ایران و شام میں لڑنے والی فوجوں کی ترتیب میں مشغول ہو جاتا تھا۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی تو ایک قسم کا کھو جانا ہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بھی ایک قسم کا کھو جانا ہی ہے لیکن بڑا فرق ہے اس کھو جانے میں جو کسی غیری گلی میں ہو اور اس کھو جانے میں جو اسی کے کوچے میں ہو جس کے در کی تلاش ہے۔

اس وسوسہ ہی کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں کو نہ اپنی طہارت پر اعتماد ہوتا ہے، نہ وضو پر اور نہ نماز پر۔ وضو کے لیے بیٹھیں گے تو ہاتھ دھونے ہی پر لوٹے کے لوٹے پانی کے بہا دیں گے لیکن ان کا اطمینان نہیں ہو گا کہ ہاتھ دھو یا گیا۔ نماز کے لیے کھڑے ہوں گے تو بار بار نیت باندھیں گے اور توڑیں گے لیکن ان کی نیت ہے کہ کسی طرح بندھنے ہی میں نہیں آتی۔

یہ ایک سخت قسم کی ذہنی بیماری ہے۔ جس کا علاج یہ ہے کہ آدمی اس کو بیماری سمجھے اور اپنی طبیعت کی اصلاح کی فکر کرے۔ بعض لوگوں کو یہ بیماری شک کے راستہ سے لاحق ہوتی ہے، ان کو اپنا ہر کام مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اسلامی شریعت کا یہ اصول اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ دین کے معاملات میں گمان غالب کافی ہے۔ اگر ایک کام کے متعلق ہمارا گمان یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہو گیا تو ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس سے زیادہ اس کے در پے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعض لوگوں کو یہ بیماری احتیاط اور تقویٰ میں غلو کے سبب سے لاحق ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اسلامی شریعت کے مزاج سے واقف کرنا چاہیے کہ یہ شریعت سہل ہے اور اللہ اور رسول کو یہ بات

پسند ہے کہ بندہ تشدد پسندی سے بچے اور اپنے لیے معتدل راہ کا انتخاب کرے۔ جو شخص اپنی تشدد پسندی کی وجہ سے دین سے دھینگا مشتی شروع کر دیتا ہے، بالآخر وہ شکست کھا جاتا ہے۔

مدّعا سے بے خبری

تیسری آفت مدّعا سے بے خبری ہے۔ اس زمانہ میں عوام کا بہت بڑا طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے سرے سے جانتے ہی نہیں کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس میں کس بات کا اقرار اور کس بات کا انکار کرتے ہیں۔ وہ نماز کے الفاظ کو منتروں کی طرح پڑھتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ خواہ ہم ان کے معنی مطلب سمجھیں یا نہ سمجھیں یہ منتر کارگر ہو کے رہیں گے۔ ان کے نزدیک سارا جادو بس ان الفاظ میں ہے۔ اگر الفاظ الٹے سیدھے زبان سے ادا ہو گئے تو تیر نشانہ پر لگ گیا۔

دوسرے بہت سارے لوگ ہیں جو ان الفاظ کے معنی سے تو بے خبر نہیں ہیں لیکن یا تو غفلت کے سبب سے دھیان نہیں کرتے یا دھیان کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ یہ جس طرح قرآن کی تلاوت محض بطور تبرک کرتے ہیں اسی طرح نماز میں اس کی دعائیں بطور تبرک پڑھ لیتے ہیں۔

یہ صورت حال خواہ جہالت کے سبب سے ہو یا غفلت اور غلط فہمی کے سبب سے نماز کو بالکل بے اثر اور بے مقصد بنا کر رکھ دیتی ہے۔ کم از کم تزکیۂ نفس کے نصب العین کو تو اس نماز سے مشکل ہی سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں، وہ کم از کم ان سورتوں اور دعاؤں کے معنی مطلب تو ضرور سیکھ لیں جو عموماً نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ کام تھوڑی سی محنت اور بہت معمولی اہتمام سے ہر شخص کر سکتا ہے۔ جو لوگ اتنا بھی نہیں کر سکتے، نہ وہ نماز کی اہمیت سے واقف ہیں نہ دین کی اہمیت سے۔

رہے وہ لوگ جو عربی زبان سے واقف ہیں یا کم از کم نماز کی دعاؤں کے حد تک واقف ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز میں جو کچھ سنیں یا پڑھیں اس کے لفظ لفظ کے معنی پر دھیان کریں۔ آدمی کا ذہن اگر کسی چیز پر جمنے اور غور کرنے کا عادی نہ ہو تو شروع شروع میں وہ اس میں

مشقت اور اجنبیت محسوس کرتا ہے لیکن یہ محض عادت کی خرابی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذہن کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے بنایا ہے، ہرزہ گردی کے لیے نہیں بنایا ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ اس راہ پر لگایا جائے تو تھوڑی سی محنت سے لگ جاتا ہے اور جب لگ جاتا ہے تو پھر اس سے الگ ہو کر وہ زندگی میں کوئی لذت ہی محسوس نہیں کرتا۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ جب ایک ہی طرح کی دعائیں اور سورتیں ہر نماز میں پڑھی جاتی ہیں اور وہ معلوم ہیں تو پھر ان پر ہر روز اور ہر وقت غور کرنے کی کیا ضرورت ہے، ایک مرتبہ جب اس کو سمجھ لیا تو یہ کافی ہے؟ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں، وہ نماز کی اور نماز کی دعاؤں کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ نماز معلومات کے اضافہ کے لیے نہیں پڑھی جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد کی تجدید، اس سے رہنمائی اور استعانت کی طلب اور توبہ و استغفار کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ یہ مقصد آخر بے سمجھے بوجھے الفاظ دہرا دینے سے کس طرح حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آدمی کا ذہن اور دماغ حاضر نہ ہو؟ پھر یہ گمان بھی صحیح نہیں ہے کہ نماز میں ایک ہی طرح کی چیزوں کا بار بار اعادہ ہے۔ نماز میں نئے نئے انکشافات بھی ہیں اور ان انکشافات کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے لیکن یہ انکشافات تہجد کی نماز میں ہوتے ہیں بشرطیکہ آدمی تہجد، اس کے شرائط کے ساتھ ادا کرے اور اس کو قرآن مجید یاد ہو۔

چوری

نماز میں ایک حادثہ چوری کا بھی پیش آیا کرتا ہے۔ یہ چوری شیطان نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات نماز پڑھنے والا خود کرتا ہے اور کہیں باہر جا کر نہیں کرتا بلکہ خود اپنی نماز کے اندر کرتا ہے۔ آپ متعجب ہوں گے کہ وہ کس طرح؟ وہ اس طرح کہ بعض لوگ وضو اور نماز میں اتنی جلد بازی کرتے ہیں کہ وہ ان کے کسی رکن کا بھی حق ادا نہیں کر پاتے۔ ہاتھ دھوئیں گے تو کہنیاں چھوڑ جائیں گے۔ پاؤں دھوئیں گے تو ایڑیاں خشک رہ جائیں گی۔ نماز میں کھڑے ہوں گے تو اس طرح کہ ابھی برابر کھڑے بھی نہیں ہوئے کہ رکوع کے لیے جھک پڑے۔ رکوع میں گئے تو سر ابھی کمر کے برابر ہوا بھی نہیں کہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رکوع سے اٹھ کر ابھی کمر سیدھی بھی نہ ہونے پائی کہ دوسرے

سجدے کے لیے جھک گئے۔ قعدہ میں بیٹھیں گے تو معلوم ہوگا کہ جلتے توے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ غرض وہ اپنی نماز کے ہر حصہ میں سے کچھ نہ کچھ دبالیں گے۔

اس بیماری کے عموماً دو سبب ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ بعض لوگ فطری طور پر جلد باز ہوتے ہیں۔ وہ ہر کام کو جلدی جلدی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور تربیت سے محروم ہونے کے باعث یہی طریقہ وہ نماز میں بھی اختیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ بتانا چاہیے کہ نماز کے ہر کام میں وقار اور متانت شرط ہے۔ اس کے بغیر نماز بالکل بے برکت ہو جاتی ہے۔ عام طور پر بچپنے میں جو غلط عادت پڑ جایا کرتی ہے وہ آخر دم تک قائم رہتی ہے، اس وجہ سے بچوں کی ابتدائی تربیت ہی میں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ نہ تو وہ زندگی کے عام حالات میں جلد باز ہوں اور نہ نماز میں۔ خصوصاً نماز میں جلد بازی کی خرابیاں اچھی طرح ان کے ذہن نشین کی جائیں۔

اس کا دوسرا سبب دل کی خرابی ہے۔ بعض لوگ مارے بندھے مسجد میں آتے ہیں۔ ان کے لیے مسجد ایک قید خانہ ہوتی ہے۔ وہ آتے ہی یہ چاہتے ہیں کہ کب اس جیل سے چھوٹیں اور اپنے ذوق کی دلچسپیوں میں منہمک ہوں۔ اس بدذوقی کی وجہ سے نماز ان کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا علاج مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے۔ جب تک ان کے ذہن تبدیل نہ ہوں، جب تک یہ دین کی اہمیت اور دین کے اندر نماز کے مرتبہ اور مقام کے قائل نہ بنیں، اس وقت تک محض تعدیل ارکان کی تاکید سے ان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ نماز پیدا ہوتی ہے ایمان سے۔ اگر کوئی شخص ایمان کی لذت ہی سے آشنا نہ ہو تو وہ اس نماز کے لیے بھلا کیا اہتمام کرے گا جو اس نے محض اوپر سے چپکالی ہو یا اس کے اوپر چپکا دی گئی ہو؟

ریا

نماز کی سب سے زیادہ عام اور سب سے زیادہ خطرناک آفت ریا ہے۔ عام اس وجہ سے کہ اس کی اتنی مخفی قسمیں ہیں کہ محتاط سے محتاط آدمی بھی بعض اوقات اس کی بعض قسموں کے حملہ سے اپنی نماز کو بچا نہیں سکتا اور خطرناک اس وجہ سے کہ نماز کے لیے اخلاص شرط ہے اور ریا اخلاص کے منافی ہے۔ ان دو باتوں کے سبب سے جو شخص اپنی نماز کو ریا سے پاک رکھنا چاہے اس کو مسلسل ریاضت

کرنی پڑتی ہے۔

میرے نزدیک اس بیماری کے علاج کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں:

ایک یہ کہ آدمی ریا کی مختلف شکلوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی **احیاء العلوم** اور اسی طرح کی بعض دوسری کتابوں کا مطالعہ ریا کی اقسام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے نہایت مفید ہے۔ ایک چیز سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آدمی اس کو پکڑ سکے اور اگر چاہے تو اس کی اصلاح کر سکے۔ یہ واقفیت عام لوگوں کے لیے جس قدر ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری علمائے دین اور اہل تقویٰ کے لیے ہے کیونکہ ریا دنیاداری کے بھیس میں کم آتی ہے، یہ دینداری کے جامہ میں زیادہ آتی ہے۔ اور ایسی ایسی پرفریب شکلوں میں آتی ہے کہ بڑے بڑے عالمانِ دین اور بڑے بڑے مشائخ وقت اس کے چکمے میں آ جاتے ہیں اور اس کے پیچھے بسا اوقات اپنے زہد و ریاضت کی زندگی بھر کی پونجی گنوا بیٹھتے ہیں۔

دوسری چیز جو اس کے لیے مفید ہے وہ تہجد کی نماز ہے۔ یہ نماز شب کی تنہائی میں پڑھی جاتی ہے اور نفس کے لیے نہایت سخت ہے اور اس کو مخفی رکھنے کی بھی تاکید ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ محض دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں وہ اس کی ہمت نہیں کر سکتے۔ اس کی ہمت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یا تو بے ریا ہوں یا ریا کے فتنوں سے واقف ہوں اور اس سے اپنے آپ کو بچانے ہی کے لیے تہجد کے گوشۂ خلوت میں آ کے چھپے ہوں۔ یہ نماز ریا کا سب سے زیادہ مفید علاج ہے بشرطیکہ آدمی اس کی رازداری کو قائم رکھ سکے۔ بعض لوگ اس سلسلہ میں بھی ریا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ یا تو خود مختلف پردوں میں اپنی شب بیداری اور تہجد خوانی کا اشتہار دیتے ہیں یا ان کے شاگرد اور مرید حضرات یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ نماز اس مقصد کے لیے نہ صرف یہ کہ کچھ مفید نہیں رہ جاتی بلکہ کچھ مزید ریا پرور بن جاتی ہے۔

نماز کے فتنوں میں سے یہ چند بڑے بڑے فتنے بیان ہوئے ہیں۔ اگر آدمی ان سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے تو دوسرے فتنوں پر قابو پانے کی صلاحیت بھی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی نماز فی الواقع اس کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کی طمانیت اور روح کا سرور بن جاتی ہے۔

باب ۱۳

انفاق اور آفاتِ انفاق

دنیا اور اسبابِ دنیا سے محبت کے سبب سے اللہ تعالیٰ سے جو غفلت ہوتی ہے اس کا سب سے زیادہ مؤثر اور کارگر علاج انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ ہم نے **انفاق فی سبیل اللہ** کی اصطلاح استعمال کی ہے، زکوٰۃ کی اصطلاح نہیں استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیہ نفس اور احسان کے نقطۂ نظر سے دین میں جس چیز کی اہمیت ہے وہ انفاق کی ہے، صرف زکوٰۃ کی نہیں ہے۔ زکوٰۃ تو وہ کم سے کم مطالبہ ہے جو اسلام میں ایک صاحبِ مال سے کیا گیا ہے۔ اسلام کا اصلی مطالبہ تو انفاق کے لیے ہے جو سراً بھی ہو، اعلانیہ بھی ہو، تنگی میں بھی ہو، فراخی میں بھی ہو، دوست اور عزیز کے لیے بھی ہو اور مخالف اور دشمن کے لیے بھی۔

زکوٰۃ ادا کر دینے سے اسلامی حکومت کے مطالبہ سے تو آدمی ضرور بری ہو جاتا ہے، قانون اس پر کوئی گرفت نہیں کر سکتا۔ لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کے مطالبہ کا تعلق ہے وہ صرف زکوٰۃ ادا کر دینے سے پورا نہیں ہوتا بلکہ یہ اس وقت پورا ہوتا ہے جب آدمی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ناگزیر ضروریات کے سوا ہر مصرف سے اپنا مال بچا کر اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے جتن کرے۔ جو شخص اس اہتمام سے اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے، وہی درحقیقت انفاق کا اصلی حق ادا کرتا ہے اور وہی ہے جو اس زندگی میں روح کی بادشاہی کا جلوہ دیکھتا ہے اور آخرت

میں اپنے رب کی خوشنودی کی جنت دیکھے گا۔

ہم پہلے یہاں مختصراً انفاق کی برکات پر گفتگو کریں گے، اس کے بعد ان آفات کا ذکر کریں گے جو انفاق کو باطل کر دیتی ہیں اور ساتھ ہی ان آفتوں سے اپنے انفاق کو محفوظ رکھنے کے لیے قرآن وحدیث میں جو تدبیریں بتائی گئی ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

انفاق کی برکات

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حقیقی لگاؤ

انفاق کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ یہ آدمی کے دل کو خدا کے ساتھ اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ اس کے لیے خدا سے غافل رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ آدمی کو مال سے جو محبت ہے اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ وہ جس جگہ اپنا مال رکھتا ہے یا جس کام میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے اسی جگہ یا اسی کام کے ساتھ اس کا دل بھی اٹکا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنا مال کسی مخفی جگہ میں دفن کرتا ہے تو اس کا دل ہر وقت اسی گوشے اور اسی خرابے میں گردش کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ کسی بنک میں رکھتا ہے تو اس بنک کے ساتھ اس کا دل بندھ جاتا ہے۔ اگر کسی کاروبار یا کسی کمپنی میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے تو رات دن اس کاروبار یا کمپنی کی فکریں اس کے سر پر سوار رہتی ہیں۔ الغرض جہاں آدمی اپنا سرمایہ لگاتا ہے، تجربہ شہادت دیتا ہے کہ وہیں اس کا دل بھی رہتا ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں دیکھیے تو یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص اپنا مال خدا کے راستے میں خرچ کرے گا اس کا دل بھی خدا ہی کے ساتھ رہے گا کیونکہ اس کا مال خدا ہی کے پاس ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ:

> اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو... بلکہ اپنے لیے آسمان پر جمع کرو... کیونکہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔ (انجیل متی: باب ۶: ۱۹۔۲۱)

معاشرے کے ساتھ حقیقی ربط

اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ صاحب انفاق کا اپنے معاشرے کے ساتھ بھی صحیح ربط قائم ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ چیز بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ فلسفۂ شریعت کے اعتبار سے یہ دین کی دو بنیادوں میں سے دوسری ہے۔ ایک بندے کے صحیح بندہ بننے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں: ایک یہ کہ رب کے ساتھ اس کا تعلق ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے۔ دوسری یہ کہ خلق کے ساتھ وہ صحیح طور پر مربوط ہو جائے۔ پہلی چیز آدمی کو نماز سے حاصل ہوتی ہے، جس کا بیان ہو چکا ہے، یہ دوسری چیز اس کو انفاق سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی رمز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر قرآن مجید میں ساتھ ساتھ ہوا ہے اور سورہ بقرہ کے شروع ہی میں وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے ساتھ دوسری چیز جس کا ذکر ہوا ہے وہ انفاق — وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ — ہے۔

یہ دونوں چیزیں درحقیقت وہ دو بنیادیں ہیں جن پر خالق اور خلق کے ساتھ آدمی کے سارے تعلقات کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یوں سمجھنا چاہیے کہ انھی دو چیزوں پر درحقیقت پورے دین وشریعت کی عمارت قائم ہے۔ پچھلے مذاہب میں بھی تمام نیکیوں کی جڑ انھی دو چیزوں کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

> ایک عالم شرع نے آزمانے کے لیے اس سے پوچھا: اے استاد! توریت میں کونسا حکم بڑا ہے؟ ٥ اس نے اس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ ٥ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے ٥ اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ ٥ انھی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے ٥ (انجیل متی: باب ۲۲: ۳۵۔۴۰)

پڑوسی سے محبت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس کے لیے اپنا مال خرچ کرے، اس کے دکھ درد میں اس کا شریک بنے اور اس کی مشکلات میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اولین مظہر نماز ہے اسی طرح اس کی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر انفاق ہے۔

گو ظاہر میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے دوسری چیز درحقیقت پہلی چیز کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ جو آدمی خالق سے محبت کرے گا وہ اس کی مخلوق سے ضرور محبت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنی عیال سے تعبیر فرمایا ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اگر اس کو کسی سے محبت ہو جائے تو اس کے متعلقین سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ اپنی اس فطرت کے تقاضے سے جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرنے لگتا ہے اور یہ محبت قدرتی طور پر خلق کی ہمدردی اور ان کے لیے مالی ایثار کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں انسان کو اللہ تعالیٰ سے جو محبت ہوتی ہے وہ اس کے جذبۂ شکرگزاری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ جب اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالتا ہے تو ہر پہلو سے اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ ان نعمتوں کا احساس اس کو ایک طرف تو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اپنے رب کی بندگی اور پرستش کرے، چنانچہ اسی تحریک سے وہ نماز پڑھتا ہے، اور پھر یہی جذبہ دوسری طرف اس کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ جس طرح اس کے رب نے اس کے اوپر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کے دوسرے بندوں پر احسان فرمائے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ ان میں سے ایک چیز دوسری سے پیدا بھی ہوئی ہے اور پھر انہی دونوں پر تمام دین و شریعت کی بنیاد بھی ہے۔ ایک تمام حقوق اللہ کا سرچشمہ ہے اور دوسری تمام حقوق العباد کی اصل ہے۔ جو آدمی دوسروں کے لیے اپنا مال خرچ کر سکتا ہے وہ ان کے دوسرے حقوق ادا کرنے میں بھی تنگ دل نہیں ہوگا۔ انسان کا دل اگر مال کی محبت اور بخالت کی بیماری سے پاک ہو جائے تو اس کے لیے وہ تمام نیکیاں آسان ہو جاتی ہیں جن سے ایک آدمی اپنے معاشرے کا بہترین فرد بنتا ہے اور اگر اس کا دل مال کی محبت میں گرفتار رہے تو اس کے لیے نیکی کا ہر کام دشوار بن جاتا ہے۔

قرآن مجید نے یہ حقیقت اس طرح سمجھائی ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ○ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ○ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ○ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ○ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ○

(الّیل ۔۹۲: ۵۔۱۰)

سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا۔ اور جس نے بخالت کی اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دے دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔

انفاق سے حکمت حاصل ہوتی ہے

انفاق کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ دین کے دوسرے تمام عقائد و اعمال کے لیے بمنزلہ غذا اور پانی کے ہے۔ اس سے آدمی کی وہ نیکیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں جو کمزور و ناتواں ہوتی ہیں اور اس کے وہ عقائد مستحکم اور پائدار ہو جاتے ہیں جو ابھی اچھی طرح دل میں راسخ نہیں ہوئے ہوتے ہیں۔ دین کے عقائد اور اعمال کا یہی رسوخ و استحکام ہے جس کو قرآن مجید میں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکمت کے خزانہ کی کلید درحقیقت انفاق ہی ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے آخر میں انفاق کی برکتیں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ یَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○ یُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا ؕ (البقرۃ ۔۲: ۲۶۸۔۲۶۹)

شیطان تمہیں تنگ دستی سے ڈراتا اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔

یہ اس انفاق کی برکت بیان ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے دل کو دین کے احکام پر جمانے کے لیے کیا جائے۔ چنانچہ اس کی تمہید یوں شروع ہوتی ہے:

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
(البقرۃ۔۲:۲۶۵)

اور ان لوگوں کے عمل کی تمثیل جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

اپنے دل کو جمانے کے لیے یعنی دل کی خواہشات کے علی الرغم وہ اپنے مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ ان کے لیے خدا کے احکام کی تکمیل اور اس راہ میں ہر قربانی آسان ہو جائے۔ جو لوگ اس مقصد سے مال خرچ کرتے ہیں ان کا صلہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ان کو اپنی مغفرت اور اپنے فضل سے نوازتا ہے اور ساتھ ہی ان کو حکمت کا وہ خزانہ بھی عطا فرماتا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

مال میں برکت

انفاق کی چوتھی برکت یہ ہے کہ اس سے آدمی کے مال میں برکت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس برکت کی مثال اس طرح بیان ہوئی ہے:

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝
(البقرۃ۔۲:۲۶۱)

ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کے مانند ہے جس سے سات بالیں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ بڑی گنجائش والا اور علم والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ (البقرۃ۔۲:۲۷۶)

اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا۔

یہ برکت آخرت میں جو ظاہر ہوگی وہ تو ہوگی ہی، اس دنیا میں بھی اس شخص کے مال میں برکت ہوتی ہے جو خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے بے شمار بندے جو اس کے مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ یہ دعائیں کرنے والے بالعموم اہل حاجت ہوتے ہیں جو اپنی حاجت مندی کے سبب سے اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرمائے۔ بلکہ بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے لیے خدا کے فرشتے بھی برکت کی دعا کرتے ہیں۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بندوں پر کوئی صبح بھی نہیں آتی ہے مگر دو فرشتے اترتے ہیں، ایک یہ دعا کرتا ہے کہ اے خدا تو اپنی راہ میں مال خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور دوسرا یہ دعا کرتا ہے کہ تو بخیل کو بربادی اور نقصان عطا فرما۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ برکت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے کی تجوریاں بھر جاتی ہیں یا اس کے بنک بیلنس میں اضافہ ہو جاتا ہے یا اس کے املاک و جائداد کی مقدار اور تعداد کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔ بلکہ برکت کا مفہوم یہ ہے کہ مال کا جو حقیقی فائدہ اور نفع ہے جس مقدار میں وہ حاصل کرتا ہے، اس کے مقابل میں دوسرے حاصل نہیں کر پاتے۔ خلق خدا کی جو خدمت اس کے مال سے انجام پاتی ہے، دوسروں کے مال سے انجام نہیں پاتی۔ معاشرے اور تمدن کی اصلاح و ترقی میں جو حصہ اس کے مال کا ہوتا ہے، دوسروں کے مال کا نہیں ہوتا۔ خدا کی خوشنودی کا جو لازوال خزانہ وہ اپنے مال کے بدلے میں حاصل کر لیتا ہے، دوسرے اس سے محروم رہتے ہیں۔ خلق خدا کے دلوں میں عزت اور محبت کا جو مقام اسے ملتا ہے، روپے کو گن گن کر رکھنے والے اور کوٹھیوں اور کاروں کے مالک اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو فراغ خاطر، جو سکون قلب، جو اعتماد علی اللہ، جو قلبی مسرت اور دل اور روح کی جو بادشاہی اس کو حاصل ہوتی ہے، دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو کبھی خواب میں

بھی وہ چیز نظر نہیں آتی۔

اس برکت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انفاق کرنے والے کا مال چونکہ دوسروں کے دبائے ہوئے حقوق کی فاسد ملاوٹ سے پاک ہوتا ہے، اس وجہ سے صالح بیج کی طرح اس کی قوتِ نشوونما میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر و قیمت کو مضاعف کر دیتا ہے اور ان آفتوں سے وہ محفوظ ہو جاتا ہے جو آفتیں اندر ہی اندر ان مالوں کو چٹ کرتی رہتی ہیں جن کے اندر دوسروں کے حقوق کی آلائش ملی ہوئی ہوتی ہے۔

باب ۱۴

آفاتِ انفاق اور ان کا علاج

انفاق کی یہ برکتیں نہایت واضح الفاظ میں قرآن اور حدیث میں بیان ہوئی ہیں اور ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے بھی ان کی صحت وصداقت کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن نماز کی طرح اس کے لیے بھی چند آفتیں ہیں۔ اگر انفاق کرنے والا ان آفتوں سے ہوشیار نہ رہے اور اپنے انفاق کو پوری احتیاط کے ساتھ ان سے بچانے کی کوشش نہ کرے تو پھر اس کے انفاق کی ساری برکت برباد ہو کے رہ جاتی ہے اور وہ ان فوائد میں سے کوئی ایک فائدہ بھی حاصل نہیں کر پاتا جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ ہم ان آفتوں میں سے چند اہم آفتوں کا یہاں ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی قرآن حکیم اور حدیث کی روشنی میں ان کے تدارک کی تدبیریں بھی بتائیں گے۔

چھدّا اتارنے کی خواہش

بہت سے لوگ خدا کی راہ میں خرچ تو کرتے ہیں لیکن دل کی فیاضی اور ولولہ اور حوصلہ کے ساتھ نہیں خرچ کرتے بلکہ ان کے پیشِ نظر صرف ایک مطالبہ کو کسی نہ کسی طرح پورا کر دینا ہوتا ہے۔ جس طرح وہ حکومت کا عائد کردہ کوئی ٹیکس ادا کر دیتے ہیں، اسی بددلی اور افسردگی کے ساتھ کسی دینی و مذہبی کام کے لیے بھی کچھ مال وہ نکال دیتے ہیں۔ اس بددلی کے سبب سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے وقت ان کی خواہش اور کوشش ہر پہلو سے یہ ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں وہ چیز دیں جس کا

دینا ان کے دل پر گراں نہ گزرے، جو ان کی ضرورت سے بالکل فاضل ہو یا جس سے کم از کم ان کو کوئی بڑا فائدہ اٹھا سکنے کی توقع نہ ہو۔ اگر قربانی کریں گے تو ایسے جانور کی جو کم قیمت اور بے حیثیت ہو۔ اگر صدقہ کریں گے تو ایسے مال کا جو انہیں خود قبول کرنا پڑے تو اس کو دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھیں گے۔ اگر کسی قومی اور مذہبی مقصد کے لیے اپنی کوئی چیز الگ کریں گے تو وہ چیز جس کی فائدہ بخشی کی صلاحیت اب ختم ہو رہی ہے۔

اس طرح کا انفاق نہ صرف یہ کہ کوئی خیر و برکت نہیں پیدا کرتا بلکہ دوسرے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں شرف قبولیت ہی نہیں پاتا۔ انفاق کے موجب خیر و برکت ہونے کے لیے سب سے پہلی چیز آدمی کے دل کی آمادگی اور تیاری ہے۔ جو انفاق دل کی آمادگی کے ساتھ نہ کیا جائے وہ خدا کے ہاں قبول ہی نہیں ہوتا تو اس میں خیر و برکت کیا ہوگی!

یہ آمادگی اور تیاری اس تصور کو بیدار رکھنے سے پیدا ہوتی ہے کہ خدا یا اس کا کوئی کام ہمارا یا ہمارے مال کا محتاج نہیں ہے بلکہ ہم خود ہر لمحہ اس کی عنایت و مہربانی کے محتاج ہیں۔ یہ محض اس کی طرف سے ہمارا ایک امتحان ہے کہ وہ اپنے ایک ہاتھ سے ہمیں بخشتا ہے اور دوسرا ہمارے آگے مانگنے کے لیے بڑھاتا ہے تاکہ دیکھے کہ ہم اسی کا بخشا ہوا مال خود اسی کو دیتے ہوئے کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ فیاضی اور حوصلہ کے ساتھ دیتے ہیں یا تنگ دلی اور ترش روئی کے ساتھ۔ یہ لوگ اس آزمائش گاہ میں اس کو اپنی سعادت کا ایک مُغتَنَم موقع سمجھتے ہیں اور اس کی راہ میں اپنے مال و متاع کا وہ حصہ پیش کرتے ہیں جو انہیں خود محبوب ہوتا ہے اس لیے کہ کسی محبوب چیز کو پیش کرنا بجائے خود اس بات کی بہت بڑی شہادت ہے کہ وہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

بعض چیزوں کی محبوبیت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ بجائے خود قیمتی اور پسندیدہ ہوتی ہیں اور بعض چیزیں اگرچہ بجائے خود بہت قدر و منزلت والی نہیں ہوتی ہیں لیکن حالات ان کو قیمتی اور محبوب بنا دیتے ہیں۔ مثلاً قحط اور گرانی کے زمانہ میں معمولی غذائی سامان بھی ہر شخص کے لیے محبوب و مطلوب بن جاتا ہے یا ایک غریب آدمی کے لیے اس کی جیب کا دھیلا ہی بڑی قیمتی چیز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ساری چیزیں محبوب ہی شمار ہوتی ہیں اور خلوص نیت کے ساتھ ان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے وہی برکتیں حاصل کرتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

ایک مزدور اپنے پسینہ کی کمائی کے چند ٹکے خدا کی راہ میں خرچ کر کے وہی اجر و ثواب حاصل کر سکتا ہے جو ایک امیر کبیر اپنی اشرفیاں لٹا کر حاصل کرتا ہے کیونکہ ایک غریب کے لیے اس کے چند ٹکے اسی طرح محبوب ہیں جس طرح ایک دولت مند کو اس کی اشرفیاں محبوب ہو سکتی ہیں۔

محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو خرچ کرنے ہی سے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا ہوتا ہے۔ جو لوگ محض زبانی جمع خرچ سے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں ان کے بارے میں قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (آل عمران۔۳:۹۲)

تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو۔

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا ناپسندیدہ یا غلط راہوں سے آیا ہوا مال دے کر اس وقت ٹالنے کی خواہش رکھتے ہیں، ان کے بارے میں قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (البقرۃ۔۲:۲۶۷)

اے ایمان والو! اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں۔ اور اس میں سے وہ مال تو خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو جس کو خدا کی راہ میں تو خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو۔ اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں طیبات سے مراد ہیں وہ چیزیں جو بجائے خود بھی اچھی اور پسندیدہ ہوں اور جو حاصل بھی جائز اور پسندیدہ طریقے سے ہوئی ہوں۔

اس حقیقت کی عملی مثال کے طور پر ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی سے ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب ابو طلحہؓ سارے مدینہ میں کھجور کے باغوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ مالدار تھے۔ ان کا سب سے اچھا باغ جو ان کو سب سے زیادہ محبوب تھا بیرجاء تھا۔ یہ بالکل مسجد نبوی کے سامنے تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس میں تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس کے میٹھے چشمے کا پانی پیا کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران۔۳:۹۲) اتری تو جناب ابو طلحہؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! آپؐ پر یہ آیت اتری ہے اور مجھے اپنے مالوں میں سب سے زیادہ محبوب باغ بیرجاء ہے تو اب میں اس کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اللہ ہی کے ہاں اس کا اجر و صلہ چاہتا ہوں۔ یارسول اللہ! اب آپؐ اس کو جس مصرف میں چاہیں لے آئیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: یہ تو بڑی چیز ہے، بڑا نفع بخش باغ ہے! میں نے تمہاری بات سن لی۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے قرابت داروں میں تقسیم کر دو۔ جناب ابو طلحہؓ نے کہا: ایسا ہی کروں گا، یارسول اللہ! چنانچہ جناب ابو طلحہؓ نے اس کو اپنے عزیزوں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

احسان جتانا اور بدلہ چاہنا

انفاق کے لیے دوسرا بڑا اہم فتنہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ خرچ کرنے کو تو کرتے ہیں لیکن یہ خرچ کرنا اپنے ذاتی اغراض سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ جس کو دیتے ہیں یا تو اس کے کسی احسان کا بدلہ چکاتے ہیں یا اس کو اپنے زیرِ احسان لانا چاہتے ہیں یا کم سے کم ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس دینے سے وہ شکرگزار اور ممنون ہوگا اور اس شکرگزاری اور ممنونیت کا اثر اس کی طرف سے کسی نہ کسی فائدہ کی شکل میں ضرور ظاہر ہوگا۔ اس قسم کا انفاق درحقیقت ایک کاروبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خرچ کرنا خدا کی راہ میں خرچ کرنا نہیں ہے بلکہ ایک کاروبار میں نفع کی امید پر سرمایہ لگانا ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں ان کو کسی نفع کی توقع نہ ہو وہاں اول تو وہ اپنا مال لگانے سے بچتے ہیں لیکن اگر غلطی سے کہیں لگا بیٹھے ہیں تو اپنا پورا فائدہ وصول کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر وہ وصول نہیں ہو پاتا

تو انتقام لینے پر اتر آتے ہیں اور اس کے لیے ذلیل اور چھچھورے طریقے اختیار کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ مثلاً یہ کہ جس کو انھوں نے کبھی کچھ دیا ہے اس پر احسان جتائیں گے، اس کو ناشکرا اور احسان فراموش قرار دیں گے، دوسروں کی موجودگی میں اس کے اوپر اپنے احسانات جتائیں گے، وقت بے وقت مختلف قسم کے طعنوں اور کچوکوں سے صرف اسی کے نہیں بلکہ اس کے بیوی بچوں کے دل بھی زخمی کر دیں گے۔ ان کا مطالبہ یہ ہوگا کہ جب ایک مرتبہ انھوں نے اس کے اوپر کوئی چھوٹا یا بڑا احسان کر دیا ہے تو پھر مدت العمر کے لیے وہ اور اس کا پورا خاندان ان کا خانہ زاد غلام بن کے کیوں نہ رہا۔

جو لوگ اپنے انفاق کے پیچھے یہ بلا لگا لیتے ہیں وہ اپنے انفاق سے کوئی برکت حاصل کرنا تو الگ رہا اس سے الٹا نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ حرکتیں ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہمدردی اور خیرخواہی کا ایک کلمہ سیم و زر کے اس ڈھیر سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جس کو دے کر احسان جتایا گیا ہو۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (البقرۃ۔۲:۲۶۲۔۲۶۴)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے نہ دل آزاری کرتے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دلداری کا ایک کلمہ کہہ دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔ اے ایمان والو! احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے اپنی خیرات کو اکارت مت کرو۔ اس

شخص کے مانند جو اپنا مال دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ ایسے شخص کی تمثیل یوں ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کا مینہ پڑے اور وہ اس کو بالکل سپاٹ پتھر چھوڑ جائے۔ ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے پلے نہیں پڑے گا۔ اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا۔

احسان جتانے اور دل آزار باتیں کر دینے سے صدقات جس طرح باطل ہو جاتے ہیں، اس کی دوسری تمثیل قرآن حکیم نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ (البقرة۔۲:۲۶۶)

کیا تم میں سے کوئی بھی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، نیچے اس کے نہریں بہہ رہی ہوں، اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی ناتواں ہوں اور باغ پر سموم کا بگولا پھر جائے اور وہ جل کر خاک ہو جائے؟

اس آفت سے اپنے انفاق کو بچانے کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی انفاق کرتے وقت اپنے آپ کو ہر قسم کی کاروباری ذہنیت سے پاک کر کے انفاق کرے، یہ خیال بالکل دل سے نکال دے کہ وہ اگر کسی کو کچھ دے رہا ہے تو اس پر کوئی احسان کر رہا ہے۔

اس خیال کے بجائے وہ اس امر واقعی کو ذہن نشین کرے کہ یہ اللہ کا اس کے اوپر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اس کو نہ صرف یہ کہ دینے کے قابل بنایا بلکہ دینے کی توفیق بھی بخشی۔ دیتے وقت آدمی کا ذہن جو ہونا چاہیے اس کی بہترین تعبیر قرآن حکیم کے ان الفاظ سے ہو رہی ہے:

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۝

(الدھر۔۷۶:۸۔۹)

ہم تمہیں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے کسی بدلے کے طالب ہیں نہ شکریے کے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے انفاق کا وہ صلہ چاہتا ہے جو اس کو باغ باغ کر دے، اس کو قرآن مجید کی یہ آیات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئیں:

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ یَرْضٰى ۝ (اللیل۔۹۲:۱۸۔۲۱)

وہ جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کو دیتا ہے۔ اور جس کی کسی پر کوئی عنایت بدلے کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے خدائے برتر کی خوشنودی کے لیے ہے۔ اور وہ نہال بھی ہو جائے گا۔

سائلوں کے ساتھ بدسلوکی

انفاق کو برباد کرنے والی ایک بہت بڑی آفت وہ سلوک بھی ہے جو عام طور پر لوگ سائلوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ مانگنے والوں کو کچھ دے تو دیتے ہیں لیکن اتنی جھڑکیاں اور اتنی صلواتیں سنا کر دیتے ہیں کہ وہ جتنی نیکی کماتے ہیں اس سے کہیں زیادہ گناہ اپنے سر چڑھا لیتے ہیں۔ ان جھڑکیوں اور صلواتوں کے پس پردہ چھپی تو ہوتی ہے عموماً ان کی طبیعت کی خست اور بخالت لیکن بعض لوگ اپنی اس حرکت کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے معاشرے کو گداگری کی ذلت سے پاک کرنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اول تو گداگری کی لعنت سے معاشرے کو پاک کرنے کے لیے یہ طریقہ ہی بے معنی ہے اور اگر بالفرض یہ کسی درجہ میں مفید بھی ہے تو اس کے لیے جھڑکیاں اور صلواتیں ہرگز ضروری نہیں ہیں۔ یہ کام شائستہ انداز اور حکیمانہ طرز پر محبت اور شفقت کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔

اس آفت سے بچنے کے لیے آدمی کو قرآن مجید کی یہ ہدایت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ (الضحیٰ۔۹۳:۱۰)

اور جو سائل ہو اس کو نہ جھڑکیو۔

اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے سائل ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ان

سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ بہت سے ایسے بھی ملتے ہیں جن کے گداگری کا پیشہ اختیار کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بعض ایسے بھی ملتے ہیں جن کو دیکھ کر آدمی صاف سمجھ جاتا ہے کہ یہ بھکل بنائے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کو دیکھ کر آدمی کو قدرتی طور پر غصہ آتا ہے۔ تاہم ان پر غصہ کرنے اور ان کو جھڑکنے اور دھتکارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے ان کی اصلاح تو ہونے سے رہی، البتہ آدمی اپنے اخلاق کو بگاڑنے کا خواہ مخواہ ایک سبب پیدا کر لیتا ہے۔ اگر آدمی کچھ دے سکے تو دے دے اور اگر نہ دے سکے یا ان کو غیر مستحق سمجھے تو ہمدردی یا نصیحت کے چند کلمات کے ساتھ ان کو رخصت کرنے کی کوشش کرے۔

سائلوں کے بارے میں قرآن مجید میں بار بار ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے اور ان کو نرم جواب دینے کی جو ہدایت فرمائی ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ بعض حالات میں چونکہ ان کا رویہ غصہ دلانے والا ہو سکتا ہے اس وجہ سے بار بار تاکید کی گئی کہ ان کو نرمی سے جواب دو۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (آل عمران۔۳:۱۳۴)

جو کشادگی اور تنگی ہر حال میں خرچ کرتے ہیں، غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ۔۲:۲۶۳)

دلداری کا ایک کلمہ کہہ دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔

اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ (بنی اسرآءیل۔۱۷:۲۸)

اور اگر تمہیں اپنے رب کے فضل کے انتظار میں، جس کے تم متوقع ہو، ان سے اعراض کرنا پڑ

جائے تو تم ان سے نرمی کی بات کہہ دو۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اگر ہم اور آپ سائلوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کریں گے تو سارا معاشرہ گداگری کا پیشہ اختیار کر لے گا۔ لوگ گداگری کی ذلت اس وجہ سے نہیں اختیار کرتے کہ دینے والے بڑے خوش اخلاق اور فیاض ہیں۔ اس کے اسباب بڑے گہرے اور عمیق ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اگر دینے والوں کی شرافت اور فیاضی گداگری کو فروغ دینے والی چیز ہوتی تو آخر تاریخ کے بہترین دور میں مدینہ منورہ میں یہ صورت حال کس طرح پیدا ہو جاتی کہ لوگ اپنی زکوۃ کا مال گلیوں میں لیے پھرتے لیکن ان کو کوئی سائل نہ ملتا۔

گداگری کو روکنا افراد کا کام نہیں بلکہ حکومتوں کا کام ہے۔ یہ چیز بڑی اہم معاشرتی و مذہبی تبدیلیوں سے روکی جا سکتی ہے۔ افراد کا کام یہ ہے کہ جب تک یہ صحیح تبدیلی واقع نہیں ہو جاتی وہ سائلوں کے معاملہ میں وہی روش اختیار کریں جس کی قرآن مجید ہدایت کرتا ہے۔

انتقام وعناد کا جذبہ

بعض حالات میں انتقام وعناد کا جذبہ بھی آدمی کے انفاق کے لیے فتنہ بن جایا کرتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوا کرتی ہے جب آدمی کسی مقدم حقدار کے لیے انفاق کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہے کہ کسی سبب سے اس کو اس شخص سے نفرت یا عداوت ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے آپ کا کوئی عزیز یا آپ کا کوئی پڑوسی ہے جو مستحق مدد ہے۔ اسلام نے انفاق کے لیے جو ترتیب قائم کی ہے اس کی رو سے آپ کے انفاق کا اولین حقدار آپ کا وہی عزیز یا آپ کا وہی پڑوسی ہے لیکن آپ اس عزیز یا پڑوسی سے کوئی شکایت رکھتے ہیں اس وجہ سے اس کو چھوڑ کر دوسروں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ عزیزوں اور پڑوسیوں کے معاملہ میں ایسا بہت ہوتا ہے۔ میں نے بہت سے خوش حال اور دولت مند لوگوں کے بھائیوں اور عزیزوں کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت غربت اور پریشانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ان کے خوش حال عزیز انفاق کے اہل اور عادی ہونے کے باوجود ان کی مدد نہیں کرتے، ان کو نظر انداز کر کے دوسروں کی مدد کرتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنے ان عزیزوں سے کچھ واقعی یا غیر واقعی شکایات ہوتی ہیں۔

یہ طرزِ عمل اس ترتیب کو بالکل بدل دیتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے انفاق کے لیے بتائی ہے۔ یہ حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ یہ ترتیب کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے اندر معاشرے و معیشت کی نہایت گہری حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں جو اس کو بدل دینے کی شکل میں فوت ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر ہم اپنے انفاق کا مستحق انہی کو سمجھتے ہیں جن سے ہم راضی اور خوش ہیں اور جن کو اپنے منشاء کے مطابق پا رہے ہیں تو یہ انفاق بے غرض انفاق تو نہ ہوا۔ یہ تو وہی غرض مندانہ اور کاروباری انفاق ہوا جس کو اللہ اور رسول نے باطل اور بے برکت قرار دیا ہے۔

جو شخص انفاق کی برکتوں سے محروم نہیں ہونا چاہتا اس کو چاہیے کہ وہ اس ترتیب کو نہ ٹوٹنے دے جو اللہ اور اس کے رسول نے انفاق کے حق داروں کی بتا دی ہے۔ اگر اس ترتیب کی رو سے سرفہرست کوئی ایسا شخص آتا ہے جس سے اس کو کسی سبب سے نفرت ہے تو بھی اس کو ضرور دے اور اس کی غلطیوں سے درگزر کرے۔ اوپر آل عمران والی آیت میں انفاق کرنے والوں کی یہ صفت جو بیان کی گئی ہے کہ وہ 'غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں' بڑی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ درحقیقت یہ ہے کہ جو لوگ غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں کی غلطیوں سے درگزر و عفو کی طبیعت رکھنے والے ہیں وہی ہیں جو انفاق کا صحیح حق ادا کر سکتے ہیں۔

ایک حدیث میں بھی اس انفاق کا بڑا درجہ بیان کیا گیا ہے جو کسی ایسے عزیز کے لیے کیا جائے جس کے متعلق انفاق کرنے والے کو یہ گمان ہو کہ وہ اپنے دل میں اس کی عداوت چھپائے ہوئے ہے۔

اس انفاق کا درجہ بڑا ہونے کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح انفاق کرنے والا شخص اپنے خواہشات و جذبات سے بالاتر ہو کر محض اللہ کی رضا کے لیے ایک ایسے شخص کو اپنا مال دیتا ہے جس کو وہ اپنے مقصد اور اپنی اغراض کے خلاف پاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس انفاق میں انفاق کرنے والے کو دو گونہ مشقت برداشت کرنی پڑتی

ہے: ایک انفاق کی، دوسری ایک ایسے شخص کے لیے انفاق کی جس سے اس کو نفرت ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں انفاق کرنے والا صلہ رحم کا ایک ایسا حق ادا کرتا ہے جس سے مردہ محبت و اخوت کے ازسرِ نو زندہ ہونے کی توقع ہے اور جس کا زندہ ہونا اللہ اور اس کے رسول کو بہت پسند ہے۔

ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی آدمی اچھی طرح سمجھ جائے تو وہ اپنے ان قرابت داروں کے اوپر خرچ کرنے میں سب سے زیادہ ٹھنڈک اور راحت محسوس کرے گا جن کو وہ اپنا دشمن سمجھتا ہے اور تجربہ اس کو بتا دے گا کہ اس انفاق سے زیادہ بابرکت انفاق اور کوئی نہیں ہے۔

احساسِ برتری

انفاق کے سلسلہ کی ایک بڑی عام آفت احساسِ برتری بھی ہے۔ جو شخص اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم یا اپنے مذہب کے لیے کچھ خرچ کر سکے، جب وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کے ہاتھ اس کے آگے پھیل رہے ہیں اور بہت سے ضرورت مند لوگ اس کی طرف رجوع کر رہے ہیں تو اس کے دماغ میں بڑائی اور برتری کی ہوا سما جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دینے والے کی پوزیشن میں پا کر لینے والوں کے مقابل میں بہت ارفع اور بہت اونچا خیال کرنے لگتا ہے۔ بعض تنگ ظرف اپنے اس احساس کو دبا نہیں سکتے چنانچہ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ان کی زبانوں سے بھی ہونے لگتا ہے اور ان کے انداز و اطوار بھی اس کی شہادت دینے لگتے ہیں۔

یہ احساس اس جذبہ شکر کی جڑ کاٹ دیتا ہے جس کو انفاق فی سبیل اللہ کا اصلی محرک ہونا چاہیے۔ اس سے آدمی مغرور، متکبر اور خود پسند بن جاتا ہے۔ تواضع جو عبدیت کی روح اور انکسار جو بندگی کی جان ہے اس کے اندر غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کی احتیاج اور تنگ دستی سے اپنے لیے کوئی مفید سبق حاصل کرنے کے بجائے اس کو بہتوں پر اپنی آقائی اور خدائی جمانے کا ذریعہ بنا لیتا ہے اور رفتہ رفتہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ اس کے پاس بھی جو کچھ ہے کسی اور کا بخشا ہوا ہے اور اس کی یہ بخشش کسی استحقاق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ محض اس کا فضل و کرم ہے۔

آدمی اگر اس فتنہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہے تو اس کے لیے سب سے پہلی چیز تو یہ ہے

کہ وہ جس سائل اور محتاج کو بھی دیکھے، اس سے یہ سبق سیکھنے کی کوشش کرے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کو بھی اسی سائل کی حیثیت میں پیدا کر سکتا تھا اور اگر چاہے تو اب بھی اسی کی صف میں اس کو کھڑا کر سکتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جب کسی کو کوئی چیز دے تو اس کی ہیئت اس بات کی گواہی دے رہی ہو کہ اس کا دل خدا کے آگے جھکا ہوا ہے اور اس کو اس بات پر کوئی فخر نہیں ہے کہ وہ دے رہا ہے بلکہ اس بات پر اپنے رب کا شکر گزار ہے کہ اس نے اس کو دینے کے لائق بنایا اور پھر دینے کی توفیق بخشی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے:

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ○ (المائدۃ۔۵۵:۵)
جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں فروتنی کے ساتھ۔

اس آیت کو تلاوت کرتے وقت مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ یہاں وَهُمْ رٰكِعُوْنَ درحقیقت ادائے زکوٰۃ کی ہیئت و حالت کو ظاہر کر رہا ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ زکوٰۃ دینے والے متکبر دولت مندوں کی طرح اپنی زکوٰۃ کو اپنی شان دولت مندی کی نمائش کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ عبدیت اور بندگی کی جو شان ان کے اندر نماز پیدا کرتی ہے وہی شان ان کی زکوٰۃ میں بھی ہوتی ہے۔ وہ کسی کو اپنی زکوٰۃ دیتے ہیں تو مغروروں کی طرح تن کر نہیں دیتے بلکہ خدا کے شکر گزار اور خاکسار بندوں کی طرح سر جھکا دیتے ہیں۔

ریا اور نمائش

ریا اور نمائش بھی ایک بہت عام فتنہ ہے جس میں انفاق کرنے والے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ یوں تو ریا نیکی کے ہر کام کو برباد کرنے کے لیے اس میں آگھستی ہے لیکن بعض کاموں میں اس کے گھس آنے کے بہت سے مواقع ہیں۔ ان میں سے یہ انفاق کا کام بھی اپنے اندر ریا اور نمائش کے در آنے کے لیے بڑی گنجائش رکھتا ہے۔ اول تو آدمی کو اپنی دولت مندی کے اشتہار کی یوں ہی بڑی خواہش ہوتی ہے، پھر اگر یہ اشتہار اس کو دین کے واسطے سے حاصل ہو تو کیا کہنا ہے! چنانچہ بہت سے شہرت کے مریض اس میدان میں آکودتے ہیں اور وہ مختلف قومی اور مذہبی کاموں میں محض اس خیال سے پیسے دیتے ہیں کہ ایک ہی ساتھ ان کی مالداری اور ان کی دینداری دونوں کی

دھوم مچ جائے۔ بعض اوقات اس میں بعض دوسرے اغراض و مقاصد بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حکامِ وقت کی خوشنودی اور پھر ان سے استفادہ یا کسی انجمن کی صدارت یا ریاست یا کسی طبقہ کو خوش کر کے اس کا ووٹ حاصل کرنا۔ اس طرح سے یہ ایک کاروبار بھی بن جاتا ہے۔ بعض لوگ اس نمود و نمائش کے اتنے رسیا ہوتے ہیں کہ وہ اس کام میں بھی ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کے روادار نہیں ہوتے جہاں سرفہرست اخبار میں ان کو اپنے نام کے آنے کی توقع نہ ہو اگرچہ وہ کام فی الواقع کتنا ہی مفید ہو۔ بعض دینے سے پہلے اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے دینے کی شہرت ہو جائے۔ بعض ان سے بھی چار قدم آگے ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دیں دلائیں تو کوڑی نہیں لیکن ان کے دینے کی چار دانگ عالم میں دھوم مچ جائے۔

اس زمانہ میں اس اخباری انفاق کے لیے ایک وجہ جواز بھی تلاش کر لی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اس سے دوسروں کو انفاق کی ترغیب ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے یہ فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ اس سے دوسروں کو بھی اس مقصد کے لیے خرچ کرنے کی تحریک ہوتی ہے لیکن اس زمانہ میں اس انفاق بالجہر کا طریقہ ہی بس ایک رہ گیا ہے جس پر لوگوں کو اعتماد رہ گیا ہے، سراً خرچ کرنے والی بات اب ہر جگہ سے غائب ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ دینی حلقوں میں بھی اب اس کا کچھ اہتمام نہیں رہ گیا ہے حالانکہ تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ خصوصاً جو شخص اپنے انفاق کو ریا کی آلائش سے پاک دیکھنا چاہتا ہے اس کے لیے تو اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ جتنا علانیہ خرچ کرے اس سے زیادہ پوشیدہ طور پر خرچ کرے جس کی اس کے رب اور اس شخص کے سوا کسی کو بھی خبر نہ ہو جس کے لیے اس نے خرچ کیا ہے۔

باب ۱۵

روزہ اور برکاتِ روزہ

شہوات اور خواہشاتِ نفس کے غلبہ سے انسان کے اندر خدا سے جو غفلت اور اس کے حدود سے جو بے پروائی پیدا ہوتی ہے، اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے کی عبادت مقرر کی ہے۔ اس عبادت کا نشان تمام قدیم مذاہب میں بھی ملتا ہے، بالخصوص تزکیۂ نفس کے جتنے طریقے بھی صحیح یا غلط دنیا میں اب تک اختیار کیے گیے ہیں، ان سب میں اس عبادت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پچھلے ادیان میں اس عبادت کے آداب و شرائط، اسلام کی نسبت سے زیادہ سخت تھے۔ اسلام دین فطرت ہے، اس وجہ سے اس نے اس کی ان پابندیوں کو نسبتاً نرم کر دیا ہے جو انسان کی عام طاقت کے تحمل سے زیادہ تھیں، جن کو صرف خاص خاص لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے۔

یہ عبادت نفس پر شاق ہونے کے اعتبار سے تمام عبادات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نفسِ انسانی کی تربیت و اصلاح میں اس کا عمل بڑا مشکل ہے۔ یہ انسان کے نہایت سرکش اور منہ زور رجحانات پر کمند ڈالتی اور ان کو رام کرتی ہے، اس وجہ سے یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان کے مزاج میں سختی اور درشتی ہو۔

نفس انسانی کے جو پہلو سب سے زیادہ زوردار ہیں، ان میں شہوات، خواہشات اور جذبات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کی فطرت میں اشتعال، ہیجان اور جوش ہے اس وجہ سے ارادہ کو

ان پر قابو پانے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ یہ ریاضت اتنی سخت اور ہمت شکن ہے کہ قدیم مذہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس کے بہت سے طالبین سرے سے اس چیز ہی سے مایوس ہو گئے کہ ان کو قابو میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو قابو میں لانے اور ان کی تربیت کرنے کے بجائے ان کے یک قلم ختم کر دینے کی تدبیریں سوچیں اور اختیار کیں۔ لیکن اسلام ایک دین فطرت ہے اور یہ چیزیں بھی انسانی فطرت کے لازمی اجزاء میں سے ہیں، جن کے بغیر انسان کے شخصی اور نوعی تقاضوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے اس نے ان کو ختم کر دینے کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ ان کو قابو میں کر کے ان کو صحیح راہ پر لگانے کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کو قابو میں کرنا ان کو ختم کر دینے کے مقابل میں کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک منہ زور گھوڑے کو ختم کر دینا ہو تو اس کے لیے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ بندوق کی ایک گولی اس کو ٹھنڈا کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔ لیکن اگر اس کو رام کر کے سواری کے کام میں لانا ہے تو یہ مقصد ایک ماہر شہ سوار بڑی ریاضتوں، بڑی مشقتوں اور بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی حاصل کر سکتا ہے۔

روزے کی عبادت اسلام نے اس لیے مقرر فرمائی ہے کہ ایک طرف نفس انسانی کے یہ سرکش رجحانات ضعیف ہو کر اعتدال پر آئیں اور دوسری طرف انسان کی قوت ارادی ان کو دبانے اور ان کو حدود الٰہی کا پابند بنانے کے لیے طاقتور ہو جائے۔ اپنے اس دوطرفہ عمل کے سبب سے تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس عبادت کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی برکات کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ پہلے اس کی چند برکات کا ذکر کریں گے، اس کے بعد اس کی آفات بیان کریں گے۔

روزے کی برکات

روحِ ملکوتی کی آزادی

روزے کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس سے انسان کی روحِ ملکوتی کو نفسانی خواہشات کے دباؤ سے بہت بڑی حد تک آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہماری روحِ ملکوتی کا حقیقی میلان ملاءِ اعلیٰ کی طرف ہے۔ وہ فطری طور پر خدا کے تقرب، ملائکہ سے تشبہ اور سفلیات سے تجرد کی طالب ہے اور مادی زندگی کے تقاضوں میں گرفتار رہنے کے بجائے اعلیٰ عقلی و اخلاقی مقاصد کے لیے پرواز کرنا چاہتی ہے۔ روح کے ان تقاضوں اور نفس کے ان مطالبات میں، جو خواہشات و شہوات سے پیدا ہوتے ہیں، ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ ان دونوں میں اکثر تصادم رہتا ہے اور اس تصادم میں اکثر جیت خواہشات و شہوات ہی کو ہوتی ہے۔

یہ صورتِ حال ظاہر ہے کہ روح کے فطری میلانات کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہی حالت عرصہ تک باقی رہ جائے اور روح کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کا کوئی موقع نہ ملے تو پھر نہ صرف یہ کہ اس کی قوتِ پرواز ختم ہو جاتی ہے بلکہ آہستہ آہستہ وہ خود بھی ختم ہو جاتی ہے۔

روزہ اس صورتِ حال میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ یہ ان چیزوں پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیتا ہے جو شہوات و خواہشات کو تقویت پہنچانے والی ہیں۔ اس سے آدمی کا کھانا پینا اور سونا سب کم ہو جاتا ہے۔ دوسری لذتوں اور دلچسپیوں پر بھی بعض پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نفس کے شہوانی میلانات کی جولانیاں بہت کم ہو جاتی ہیں اور روحِ ملکوتی کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کے لیے موقع مل جاتا ہے۔

روزے کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ساتھ ایک خاص نسبت دی ہے اور روزہ دار کو خاص اپنے ہاتھ سے اس کے روزے کی جزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ یوں تو اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں لیکن روزے میں دنیا اور لذاتِ دنیا کو ترک کر کے بندہ خدا سے قرب اور اس کے ملائکہ سے مناسبت اور تشبہ حاصل

کرنے کی جو کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں مشقت اٹھاتا ہے وہ روزے کے سوا کسی دوسری عبادت میں اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ فقر، درویشی، زہد، تجرد، ترکِ دنیا اور تبتل الی اللہ کی جو شان اس عبادت میں ہے وہ اس کا خاص حصہ ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ رہبانیت جس حد تک اسلام میں جائز رکھی گئی ہے اور جس درجہ تک اللہ تعالیٰ نے تربیتِ نفس کے لیے اس کو پسند فرمایا ہے، اسلام میں یہی عبادت اس کا مظہر ہے۔ اگر ایک بندہ روزے کی ساری مشقتیں اور پابندیاں فی الحقیقت اسی لیے جھیلتا ہے کہ اس کی روح اس عالمِ ناسوت کی دلدل سے آزاد ہو کر عالمِ لاہوت کی طرف پرواز کر سکے اور اسے خدا کا قرب حاصل ہو سکے تو بلاشبہ اس کی یہ کوشش اسی چیز کی مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ساتھ خاص نسبت دے اور اس کی جزا خاص اپنے ہاتھوں سے دے۔

ایک حدیث ملاحظہ ہو جس میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قال رسول اللہ ﷺ: قال اللّٰہ: کل عمل ابن آدم لہ الا الصیام. فانہ لی و انا اجزی بہ. والصیام جُنۃ. و اذا کان یوم صوم احد کم فلا یرفث و لایصخب فان سابّہ احدا و قاتلہ فلیقل: انی امرؤ صائم. والذی نفس محمد بیدہٖ! لخلوف فم الصائم اطیب عند اللّٰہ من ریح المسک. للصائم فرحتان یفرحھما: اذا افطر فرح و اذا لقی ربّہ فرح بصومہ.

(صحیح البخاری: کتاب الصوم باب ۹)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابنِ آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے مگر روزہ۔ یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ ایک سپر ہے۔ جب کسی کا روزہ ہو تو اسے چاہیے کہ نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ شور و شغب کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑے جھگڑے تو وہ اس سے کہے کہ بھائی! میں روزے سے ہوں۔ اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے! روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک اس کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ روزہ کھولتا ہے اور دوسری اس کو اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔

مزید روایات میں اسی سلسلہ کی کچھ اور باتیں ہیں جن سے حدیث کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے ہم ان کو بھی یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

یترک طعامہ و شرابہ و شہوتہ من اجلی. الصیام لی. وانا أجزی بہ. والحسنۃ بعشر امثالھا. (صحیح البخاری: کتاب الصوم باب ۲)

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) بندہ اپنا کھانا اور پینا اور اپنی شہوت میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ نیکیوں کا بدلہ دس گنا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

قال رسول اللہ ﷺ: کلّ عمل ابن آدم یُضاعف. الحسنۃ عشر امثالھا الیٰ سبعماۃ ضعف. قال اللہ عزّوجلّ: الا الصومَ فانہ لی وانا أجزی بہ. یدع شہوتہ و طعامہ من اجلی. للصائم فرحتان: فرحۃ عند فطرہ و فرحۃ عند لقاء ربّہ. ولخلوف فیہ اطیب عنداللہ من ریح المسک.

(صحیح البخاری: کتاب الصوم باب ۲)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل بڑھایا جائے گا۔ یعنی نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بڑھائی جائیں گی مگر روزے کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنی خواہش اور اپنا کھانا پینا میرے لیے قربان کرتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی اس کو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، دوسری خوشی اس کو اپنے رب کی ملاقات کے وقت حاصل ہوگی۔ اور اس کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

ان دونوں روایتوں کو ملا کر غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو اپنی طرف خاص نسبت کیوں دی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خاص اپنے ہاتھ سے اس کا بدلہ دینے کا مطلب کیا ہے۔

اس کو اپنے لیے خاص قرار دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ بندہ محض اس کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنی ان خواہشوں اور اپنے نفس کے ان مطالبات کو ترک کرتا ہے جن کا اس

کے نفس پر سب سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے اور جن کے اندر اس کی تمام مادی خوشیاں اور تمام مادی لذتیں کمٹی ہوئی ہیں۔ ان لذتوں سے محض اللہ کی رضا کے لیے منہ موڑ لینا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ اس نے اسے محبوبیت کا ایک خاص درجہ دیا اور فرمایا کہ بندہ روزہ خاص میرے لیے رکھتا ہے اور میری خوشی کے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی لذتوں کو چھوڑتا ہے۔

خاص اپنے ہاتھ سے بدلہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے بدلہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بندھے ہوئے قاعدے ہیں۔ حالات و خصوصیات کے لحاظ سے ہر نیکی کا دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بدلہ ملے گا۔ مثلاً فرض کیجیے ایک نیکی سازگار حالات کے اندر کی گئی ہے اور دوسری نیکی مشکل حالات کے اندر کی گئی ہے یا ایک نیکی پوری احتیاط اور پوری نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری نسبتاً کم اہتمام اور کم نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس طرح کے فرق و اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص کی نیکی کا جو اجر ہونا چاہیے، وہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق خدا کے رجسٹر میں درج ہوگا اور ہر حق دار اس اجر کو حاصل کرلے گا۔ لیکن روزے کی جو عبادت ہے اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اس فارمولے کے تحت نہیں رکھا ہے بلکہ اس کا فیصلہ کسی اور فارمولے کے مطابق ہوگا جس کا علم صرف اسی کو ہے۔ جب جزا دینے کا وقت آئے گا، تب وہی اس کو کھولے گا اور خاص اپنے ہاتھ سے ہر روزہ رکھنے والے کو صلہ دے گا۔ جس عبادت کی جزا کے لیے یہ کچھ اہتمام ہوگا کون اندازہ کر سکتا ہے کہ آسمان و زمین سب کا مالک اس کی کیا جزا دے گا۔

سدِّ ابوابِ فتنہ

اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ آدمی کے اندر فتنہ کے جو بڑے بڑے دروازے ہیں، روزہ ان کو بہت بڑی حد تک بند کر دیتا ہے۔ آدمی کے اندر فتنے کے بڑے دروازے، جیسا کہ ایک سے زیادہ حدیثوں میں تصریح ہے، بطن اور فرج ہیں۔ انہی کے سبب سے آدمی نہ جانے خود کتنی ہلاکتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی نہیں معلوم کتنی ہلاکتوں میں مبتلا کرتا ہے۔ یہی راستے ہیں جن سے شیطان انسان پر سب سے زیادہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان ان کی حفاظت کر سکے تو سمجھیے کہ اس نے اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے

لیے جنت کی ضمانت دی ہے جو شخص ان دونوں چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دے سکے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو:

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ان چیزوں کے بارے میں مجھے ضمانت دے سکے جو اس کے دونوں کلّوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان ہیں، میں اس کے لیے جنت کا ضامن بنتا ہوں۔

روزہ ان کی حفاظت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتا ہے۔ انسان کے لیے روزے میں صرف کھانا پینا ہی حرام نہیں ہو جاتا بلکہ لڑنا جھگڑنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا اور غیر ضروری باتوں میں حصہ لینا بھی روزے کے مقصد کے بالکل خلاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روزے میں صرف شہوانی تقاضوں کا پورا کرنا ہی حرام نہیں ہو جاتا بلکہ وہ تمام چیزیں بھی روزے کے منشاء کے خلاف ہیں جو اس کے شہوانی میلانات کو شہ دینے والی ہوں۔ روزہ خود بھی ان میلانات کو ضعیف کرتا ہے اور روزہ دار کو بھی ہدایت ہے کہ وہ حتی الامکان اپنے آپ کو ان تمام مواقع سے دور رکھے جہاں سے اس کے ان رجحانات کو غذا بہم پہنچ جانے کا امکان ہو۔

فتنہ کے دروازوں کے بند ہو جانے سے اس کے لیے ان کاموں کا کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے جو خدا کی رضا کے کام ہیں اور جن سے جنت حاصل ہوتی ہے اور ان کاموں کی راہیں بند ہو جاتی ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف کام ہیں اور جن کے سبب سے آدمی دوزخ میں پڑے گا۔ شیطان اس کے آگے بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی ساری چوکڑی بھول جاتی ہے۔ وہ ڈھونڈتا ہے لیکن اس کو روزہ دار پر حملہ کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں ملتی۔ یہی حقیقت ہے جو ایک حدیث شریف میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قال رسول اللّٰہ ﷺ : اذا دخل شھر رمضان فُتِحَتْ ابواب السماء و غُلِّقت ابواب جھنم و سُلسلت الشیاطین. (صحیح البخاری: کتاب الصوم باب ۵)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو

بیڑیاں پہنادی جاتی ہیں۔

قوتِ ارادی کی تربیت

روزے کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ آدمی کی قوت ارادی کی بہترین طریقہ پر تربیت کرتا ہے۔ شریعت کے حدود کی پابندی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کی قوت ارادی نہایت مضبوط ہو۔ بغیر مضبوط قوت ارادی کے یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص شہوات وجذبات اور خواہشات کے غیر معتدل ہیجانات کو دبا سکے اور جو شخص ان کے مفرط ہیجان کو دبا نہیں سکتا اس کے لیے یہ محال ہے کہ وہ شریعت کے حدود کو قائم رکھ سکے۔ ایک ضعیف اور لجلجے ارادہ کا آدمی ہر قدم پر ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ جب بھی کوئی چیز اس کے غصہ کو اشتعال دلانے والی سامنے آجائے گی وہ بڑی آسانی سے اس سے مغلوب ہو جائے گا، جب بھی کوئی طمع پیدا کرنے والی چیز اس کو اشارہ کرے گی وہ اس کے پیچھے لگ جائے گا اور جہاں بھی کوئی چیز اس کو اکسانے والی نظر آجائے گی وہیں وہ پھسل کے گر پڑے گا۔ اس طرح کی ضعیف قوت ارادی کا انسان دنیا میں عزم و ہمت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ وہ شریعت کے حدود وقیود کی پابندی کر سکے۔ بالخصوص شریعت کا وہ حصہ جو انسان کو برائیوں سے روکتا ہے مضبوط صبر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس صبر کی مشق روزے سے حاصل ہوتی ہے اور پھر اسی صبر سے وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو روزے کا اصل مقصود ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ○ (البقرۃ۔۲:۱۸۳)

اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

تاکہ تم تقوی حاصل کرو یعنی تاکہ صبر اور برداشت کی تربیت سے تمہاری قوت ارادی مضبوط ہو اور تمام ترغیبات و تحریکات اور تمام مشکلات وموانع کا مقابلہ کر کے تم شریعت کے

حدود پر قائم رہ سکو۔

یہی قوت مومن کے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جس سے وہ شیطان کے ہر وار کو روک سکتا ہے جو وہ خواہشات و جذبات اور شہوات کی راہ سے اس پر کرتا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اس حدیث میں، جو اوپر گزر چکی ہے، روزے کو ایک ڈھال کہا گیا ہے اور روزہ دار کو یہ ڈھال استعمال کرنے کی تعلیم یوں دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ یا لڑائی جھگڑا شروع کردے تو اس سے کہے کہ میں روزے سے ہوں۔

جذبۂ ایثار کی پرورش

روزے سے انسان کے اندر جذبۂ ایثار کی بھی پرورش ہوتی ہے اور یہ جذبہ انسان کے ان اعلیٰ جذبات میں سے ایک ہے جن سے ہزاروں نیکیوں کے لیے اس کے اندر حرکت پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب روزے میں بھوکا پیاسا رہتا ہے اور اپنی دوسری خواہشوں کو بھی دبانے پر مجبور ہوتا ہے تو اس طرح اسے غریبوں، فاقہ کشوں، محتاجوں اور مظلوموں کے دکھ درد اور ان کے شب و روز کا اندازہ کرنے کا بذاتِ خود موقع ملتا ہے۔ وہ بھوک اور پیاس کا مزا چکھ کر بھوکوں اور پیاسوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ ان کی ضرورتوں اور تکلیفوں کو سمجھنے لگتا ہے اور پھر قدرتی طور پر اس کے اندر یہ جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے لیے کچھ کرسکتا ہے تو کرے۔ روزے کا یہ اثر ہر شخص پر اس کی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے پڑتا ہے، کسی پر کم پڑتا ہے، کسی پر زیادہ۔ لیکن جس شخص کے روزے میں روزے کی خصوصیات موجود ہیں ان پر روزے کا یہ اثر پڑتا ضرور ہے۔ جن کا جذبۂ ایثار کمزور ہوتا ہے روزہ کچھ نہ کچھ ان کو بھی متحرک کردیتا ہے اور جن کے اندر یہ جذبہ قوی ہوتا ہے ان کے لیے تو روزوں کا مہینہ اس جذبہ کے ابھرنے کے لیے گویا موسم بہار ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کی تردستیاں اور فیض بخشیاں یوں تو ہمیشہ ہی جاری رہتی تھیں، لیکن رمضان کا مہینہ تو گویا آپؐ کے جود و کرم کا موسم بہار ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

کان النبی ﷺ اجود الناس بالخیر و کان اجود ما یکون فی رمضان.

(صحیح البخاری: کتاب الصوم باب ۷)

نبی کریم ﷺ یوں تو عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے لیکن رمضان میں تو گویا آپؐ سراپا جود و کرم ہی بن جاتے۔

قرآن مجید سے مناسبت

قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن مجید کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ روزے کی حالت میں بہت سے دنیاوی مشاغل کا بوجھ روزہ دار کے اوپر سے اترا ہوا ہوتا ہے اور نفس کے میلانات و رجحانات میں، جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں، روزے کے سبب سے بڑی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خاموشی، خلوت، غیر ضروری مصروفیتوں سے علیحدگی اور ترک و انقطاع کی ایک مخصوص زندگی، جو روزہ دار کو حاصل ہوتی ہے، قرآن کی تلاوت اور اس کے تدبّر کے لیے کچھ خاص موزونیت رکھتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی وحی آنحضرت ﷺ پر اس وقت اتاری جب آپؐ غارِ حرا میں معتکف تھے۔ نیز قرآن مجید کے نزول کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مبارک مہینے کو منتخب فرمایا اور اس نعمت کی شکر گزاری کے لیے اس پورے مہینے میں روزے رکھنا امت پر فرض قرار دیا۔ بعض احادیث میں وارد ہے کہ رمضان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر شب میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ قراءت قرآن مجید کا مذاکرہ کرنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے اور جتنا قرآن مجید نازل ہو چکا ہوا ہوتا تھا اس کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ رمضان کی راتوں میں تراویح میں قرآن کے سننے اور سنانے کی جو اہمیت ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ یہ ساری باتیں شہادت دیتی ہیں کہ قرآن مجید کو روزوں سے اور روزوں کو قرآن مجید سے گہری مناسبت ہے۔

تبتّل الی اللہ

روزے کی اصل غایت دل، دماغ، جسم اور روح سب کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا ہے۔ اسی

چیز کو قرآن مجید میں تبتل الی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مقام آدمی کو روزے سے حاصل ہوتا ہے اور اسی کو حاصل کرنے کے لیے روزے کے ساتھ اعتکاف کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اعتکاف، اگرچہ ہر شخص کے لیے رمضان کے روزوں کی طرح ضروری چیز نہیں ہے — بلکہ یہ اختیاری عبادت ہے — لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر رمضان کے آخری عشرہ میں جبکہ روح میں تجرد و انقطاع اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی ایک خاص کیفیت و حالت پیدا ہو جاتی ہے آدمی اعتکاف میں بیٹھ جائے تو اس سے روزے کا جو اصل مقصود ہے وہ کمال درجہ حاصل ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں جو اہتمام فرماتے تھے، اس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح فرماتی ہیں:

> کان رسول اللہ ﷺ اذا دخل العشر احیا اللیل و ایقظ اھلہ و جدّ و شدّ المئزر. (صحیح مسلم: کتاب الاعتکاف باب ۳)
>
> جب رمضان کا آخری عشرہ آتا، آنحضرت ﷺ شب بیداری فرماتے، اپنے اہل و عیال کو بھی شب بیداری کے لیے اٹھاتے اور کمر کس کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کھڑے ہوتے۔

باب ۱۶

آفاتِ روزہ اور ان کا علاج

روزے کی برکات میں سے یہ چند برکات ہم نے بیان کی ہیں۔ لیکن یہ برکتیں اس صورت میں ظاہر ہوتی ہیں جب آدمی اپنے روزے کو ان تمام آفتوں سے محفوظ رکھ سکے جو روزے کو خراب کر دینے والی ہیں۔ یہ آفتیں چھوٹی اور بڑی بہت سی ہیں۔ ہم تزکیۂ نفس کے طالبوں کی واقفیت کے لیے یہاں چند بڑی آفتوں کا ذکر کریں گے اور ساتھ ہی ان کے وہ علاج بھی بتائیں گے جو قرآن حکیم اور حدیث میں بیان ہوئے ہیں تاکہ جو لوگ اپنے روزوں کی حفاظت کرنا چاہیں، ان سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

لذتوں اور چٹخاروں کا شوق

روزے کی عبادت، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ آدمی اپنی خواہشوں پر قابو پا سکے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب آدمی اس مقصد کو روزوں میں ملحوظ رکھے اور ان رغبتوں کو حتی الامکان دبائے جن کے آگے اپنی روزمرہ زندگی میں وہ اکثر بے بس ہو جایا کرتا ہے اور یہ بے بسی اس کو بہت سی اخلاقی اور شرعی کمزوریوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اس مقصد کو بالکل ملحوظ نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک روزے کا مہینہ خاص کھانے پینے کا مہینہ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کھانے پینے پر جتنا بھی خرچ کیا

جائے، خدا کے ہاں اس کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔ اس خیال کے لوگ اگر — خوش قسمتی سے — کچھ خوش حال بھی ہوتے ہیں تو پھر تو فی الواقع ان کے لیے روزوں کا مہینہ کام و دہن کی لذتوں سے متمتع ہونے کا موسم بہار ہی بن کے آتا ہے۔ وہ روزے کی پیدا کی ہوئی بھوک اور پیاس کو نفس کشی کے بجائے نفس پروری کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ وہ صبح سے لے کر شام تک طرح طرح کے پکوانوں کے پروگرام بنانے اور ان کے تیار کرانے میں اپنے وقت صرف کرتے ہیں اور افطار سے لے کر سحر تک اپنی زبان اور اپنے پیٹ کی تواضع میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ میں ایک ایسے بزرگ سے واقف ہوں جو ایک دیندار آدمی تھے لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ رمضان کا مہینہ کھانے پینے کا خاص مہینہ ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے تحت وہ رمضان کے مہینے کے لیے کھانے پینے کی مختلف چیزوں کا اہتمام بہت پہلے سے شروع کر دیتے تاکہ رمضان میں ان کے تنوعات سے متمتع ہوسکیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ روزہ کھانے پینے کے شوق کو اکسا دیتا ہے۔ لیکن روزے کا مقصود اسی اکساہٹ کو دبانا ہے نہ کہ اس کی پرورش کرنا، اس وجہ سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی قوت کار کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیے تو ضرور، لیکن ہرگز ہرگز کھانے پینے کو اپنی زندگی کا موضوع نہ بنا لے۔ جو کچھ بغیر کسی خاص سرگرمی اور بغیر کسی خاص اہتمام کے میسر آجائے اس کو صبر و شکر کے ساتھ کھالے۔ اگر کوئی چیز پسند کے خلاف سامنے آئے تو اس پر بھی گھر والوں پر غصہ کا اظہار نہ کرے۔ اگر کسی کو خدا نے فراغت و خوشحالی دی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ خود اپنے کھانے پینے پر اسراف کرنے کے بجائے غریب اور مسکین روزہ داروں کی مدد اور ان کو کھلانے پلانے پر خرچ کرے۔ اس چیز سے اس کے روزے کی روحانیت اور برکت میں بڑا اضافہ ہوگا۔ رمضان میں نبی کریم ﷺ کی فیاضی کا جو حال ہوتا تھا، اس کے متعلق ایک حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ روزہ افطار کرانے کے ثواب سے متعلق ایک حدیث ملاحظہ ہو:

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

من فطر صائما كان له مثل اجره. غير انه لا ينقص من اجر الصائم شيئاً.

(سنن الترمذی: کتاب الصوم باب ۸۲)

جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا اس کے لیے روزہ دار کے برابر اجر ہے۔ اور اس سے روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

اشتعالِ طبیعت

آدمی جب بھوکا پیاسا ہو تو قاعدہ ہے کہ اس کا غصہ بڑھ جایا کرتا ہے۔ جہاں کوئی بات ذرا بھی اس کے مزاج کے خلاف ہوئی فوراً اس کو غصہ آجاتا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے یہ چیز بھی ہے کہ جن کی طبیعتوں میں غصہ زیادہ ہو وہ روزے کے ذریعہ سے اپنی طبیعتوں کی اصلاح کریں۔ لیکن یہ اصلاح اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب آدمی روزے کو اپنی طبیعت کی اس خرابی کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ اگر وہ اس کو اپنی طبیعت کی اصلاح کا ذریعہ نہ بنائے تو اس بات کا بڑا اندیشہ ہے کہ روزہ اس پہلو سے اس کے لیے مفید ہونے کے بجائے الٹا مضر ہو جائے۔ یعنی اس کی طبیعت کا اشتعال کچھ اور زیادہ ترقی کر جائے۔ جو شخص اس کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ جب اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو یا کوئی دوسرا اس کے اندر اس اشتعال کو پیدا کرنے کی کوشش کرے تو وہ فوراً اس بات کو یاد کرے کہ انا صائم میں روزے سے ہوں اور یہ چیز روزے کے مقصد کے بالکل منافی ہے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کو غصہ پر قابو پانے کی تربیت ملتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ تربیت اس کے مزاج کو بالکل بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اپنے غصہ پر اس حد تک قابو حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کو وہ وہیں استعمال کرتا ہے جہاں وہ اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔

لیکن بہت سے لوگ اسلام کے بتائے ہوئے اس اصول کے بالکل خلاف روزے کو سپر کے بجائے تلوار کے طور پر استعمال کرنے کے عادی بن جاتے ہیں۔ یعنی روزہ ان کے لیے ضبط نفس کے بجائے اشتعال نفس کا بہانہ بن جایا کرتا ہے۔ وہ بیوی پر، بچوں پر، نوکروں پر اور ماتحتوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے ہیں، صلواتیں سناتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں اور بعض حالات میں مارپیٹ سے بھی دریغ نہیں کرتے اور پھر اپنے آپ کو اس خیال سے تسلی دے لیتے ہیں کہ کیا کریں، روزے میں ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے!

جو لوگ اپنے نفس کو اس راہ پر ڈال دیتے ہیں ان کے لیے روزہ اصلاح نفس کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کے بگڑے ہوئے نفس کو بگاڑنے کا مزید سبب بن جایا کرتا ہے۔ جو روزہ بھی وہ رکھتے ہیں وہ ان کے نفس مشتعل کے لیے چابک کا کام دیتا ہے، جس سے ان کا نفس تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ جو شخص روزے کی برکتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ روزے کو اپنے نفس کے لیے ایک لگام کے طور پر استعمال کرے اور ہر اشتعال دلانے والی بات کو اسی سپر پر روکے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزے کے احترام کا یہ احساس طبیعت پر غالب رہے تو آدمی بڑی سے بڑی ناگوار بات بھی برداشت کر جاتا ہے اور اس پر کوئی احساس کمتری طاری نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح کی آزمائش کے جتنے مواقع اس کے سامنے آتے ہیں وہ ہر موقع پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے شیطان پر ایک فتح حاصل کی ہے اور اس فتح کا احساس اس کے غصہ کو ایک راحت و اطمینان کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

دل بہلانے والی چیزوں کی رغبت

روزے کی ایک عام آفت یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ، جن کے ذہن کی تربیت نہیں ہوئی ہوتی ہے، کھانے پینے اور زندگی کی بعض دوسری دلچسپیوں سے علیحدگی کو ایک محرومی سمجھتے ہیں اور اس محرومی کے سبب سے ان کے لیے دن کاٹنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ اس مشکل کا حل وہ یہ پیدا کرتے ہیں کہ بعض ایسی دلچسپیاں تلاش کر لیتے ہیں جو ان کے خیال میں روزے کے مقصد کے منافی نہیں ہوتیں۔ مثلاً یہ کہ تاش کھیلتے ہیں، ناول، ڈرامے اور افسانے پڑھتے ہیں، ریڈیو پر گانے سنتے ہیں، دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں اور بعض من چلے سینما کے ایک آدھ شو دیکھ آنے میں بھی کوئی قباحت نہیں خیال کرتے۔

ان سے زیادہ سہل الحصول دلچسپی بعض لوگ یہ پیدا کر لیتے ہیں کہ اگر ایک دو ساتھی میسر آ جائیں تو کسی کی غیبت میں لپٹ جاتے ہیں۔ روزے کی بھوک میں آدمی کا گوشت بڑا لذیذ معلوم ہوتا ہے اور تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزہ رکھ کے آدمی کو یہ لذیذ مشغلہ مل جائے تو آدمی جھوٹ، غیبت، ہجو اور اس کی دوسری آفتوں کا جن کو حدیث میں حصائد اللسان سے تعبیر کیا گیا

ہے، ایک انبار لگا دیتا ہے اور اسی مشغلہ میں صبح سے شام کر دیتا ہے۔ یہ چیزیں آدمی کے روزے کو بالکل برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔

اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کے ضروری آداب میں سے سمجھے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ پچھلے مذاہب میں چپ رہنا بھی روزے کے شرائط میں داخل تھا۔ چنانچہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام روزہ کی حالت میں صرف اشارہ سے بات کرتی ہیں۔ اسلام نے روزہ داروں پر یہ پابندی تو عائد نہیں کی ہے لیکن اس پابندی کے نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی روزے میں اپنی زبان کو چھوٹ دے دے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی ضروری اور مفید بات کرنے کا موقع پیش آ جائے تو کر لے ورنہ خاموش رہے۔ جو شخص ہر قسم کی اناپ شناپ اور جھوٹی سچی باتیں زبان سے نکالتا رہتا ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ پھر، اس کا محض کھانا پینا چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک بالکل بے نتیجہ کام ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

> من لم يدع قول الزور و العمل به فليس لله حاجة في ان يدع طعامه وشرابه. (صحیح البخاری: کتاب الصوم باب ۸)
>
> جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی کا جو وقت گھر کے کام کاج اور معاش کی مصروفیتوں سے فاضل بچے اس کو مفید چیزوں کے مطالعہ میں صرف کرے۔ روزے کے دنوں کے لیے قرآن شریف، حدیث شریف، سیرت نبوی، سیرت صحابہ اور تزکیہ نفس کی کتابوں کے مطالعہ کا ایک باقاعدہ پروگرام بنا لے۔ خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید کے تدبر پر پابندی کے ساتھ کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف کرے۔ قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن مجید کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر روزہ دار کو ان برکتوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قرآن مجید اور ماثور دعاؤں کے یاد کرنے کے لیے بھی آدمی کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالے۔ اس طرح قرآن مجید اور مسنون دعاؤں کا آدمی کے پاس آہستہ آہستہ ایک ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے، جو آدمی کے جمع کیے ہوئے مال و اسباب کے ذخیروں سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

ریا

ریا کا فتنہ جس طرح تمام عبادتوں کے ساتھ لگا ہوا ہے، اسی طرح روزے کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ روزے تو رکھتے ہیں، بالخصوص رمضان کے روزے، لیکن ہو سکتا ہے کہ ان میں بہت کچھ دخل اس احساس کو بھی ہو کہ روزے نہ رکھے تو پاس پڑوس کے روزہ داروں میں نکو بننا پڑے گا یا لوگوں میں جو دینداری کا بھرم ہے وہ جاتا رہے گا یا اپنے گھر اور خاندان والے ہی برا مانیں گے۔ اس طرح کے مختلف احساسات ہیں جو رمضان کے روزوں میں شریک بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ خلوص نیت آلودہ اور مشتبہ ہو جایا کرتا ہے جو روزے کی حقیقی برکتوں کے ظہور کے لیے ضروری ہے، اس لیے کہ جس بندے میں خدا کی خوشنودی کے سوا کوئی اور محرک شریک ہو جائے، یہ روزہ وہ روزہ نہیں ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ:

> یترک طعامه و شرابه و شهوته من اجلی. الصیام لی و انا أجزی به.
> (صحیح البخاری: کتاب الصوم باب ۲)
>
> بندہ میرے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی شہوت چھوڑتا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کا بدلہ دوں گا۔

بلکہ یہ روزہ اسی غرض کے لیے ہو جائے گا جس غرض کے لیے رکھا گیا ہے۔

اس آفت کا اول علاج تو یہ ہے کہ آدمی اپنی نیت کو ہر دوسرے شائبہ سے حتی الامکان پاک کرنے کی کوشش کرے۔ اسے ہر روز سوچنا چاہیے کہ اپنے روزے کو تمام برکتوں سے محروم کر کے فاقہ کے درجہ میں ڈال دینا انتہائی نادانی ہے، آخر یہ مشقت اٹھانے کا حاصل کیا ہوا جبکہ یہ دنیا میں بھی موجب کلفت اور آخرت میں بھی موجب وبال بنے؟ اس طرح نفس کے سامنے بار بار روزہ کی قدر و قیمت واضح کرنی چاہیے تاکہ اس کی نگاہ دوسروں کی طرف سے

ہٹ کر خدا کی طرف متوجہ ہو۔

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی رکھے اور اس میں دو باتوں کا اہتمام کرے: ایک حتی الامکان اخفاء کا، یعنی ان کا اشتہار دینے کی کوشش نہ کرے۔ دوسری اعتدال یا میانہ روی کا۔ یعنی نفلی روزے اسی حد تک رکھے جس حد تک خواہشات و شہوات کو حالت اعتدال پر لانے کے لیے ان کی ضرورت ہو۔ اگر اس حد سے آدمی بڑھ جائے گا تو وہ چیز خود بھی ایک فتنہ ہے اور اسلام نے اس سے بھی بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے۔ روزے کی حیثیت ایک دوا کی ہے۔ دوا اگر ضرورت سے زیادہ استعمال کر لی جائے تو بسا اوقات یہ خود بھی ایک بیماری بن جاتی ہے۔

باب ۱۷

حج اور برکاتِ حج

ہم نے تمہید والے باب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نفس انسانی کی جملہ خرابیوں کی اصلاح کے لیے حج کی حیثیت ایک اکسیر جامع کی ہے۔ اس ایک ہی نسخہ کے اندر ان تمام نسخوں کے اصلی اجزاء جمع کر دیے گئے ہیں جو اسلام نے الگ الگ امراض کے لیے الگ الگ تجویز کیے ہیں۔ یہ نسخہ ایک جامع نسخہ بھی ہے اور اگر اس کو صحیح طریقہ پر استعمال کیا جائے تو اس کا مفید ہونا بھی ایک حتمی اور قطعی شے ہے۔ پہلے ہم اس کی جامعیت پر روشنی ڈالیں گے۔

حج جامع عبادت ہے

اس عبادت کی جامعیت کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں سب کی روح اس کے اندر، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، موجود ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

نماز دین کی تمام عبادتوں میں اساس اور ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب آئیے دیکھیے کہ یہ عبادت حج میں کس طرح شامل ہے۔

سب سے زیادہ واضح پہلو تو یہ ہے کہ حج کا سفر آدمی کرتا ہی ہے اس گھر کے لیے جو ہماری تمام نمازوں اور ہماری تمام مسجدوں کا مرکز ہے۔ نماز کے لیے پہلا گھر جو اس زمین پر تعمیر ہوا ہے، وہ بیت اللہ ہے اور ہماری تمام مسجدوں کو مسجد ہونے کا جو شرف حاصل ہوا ہے وہ اسی گھر کی بدولت

حاصل ہوا ہے۔ اس وجہ سے جب کوئی شخص حج کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے اس سفر کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جس مرکز نماز کی طرف رخ کر کے وہ زندگی بھر نماز پڑھتا رہا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اب عین اس مرکز میں پہنچ کر نماز پڑھے اور جس مسجد نے دنیا کی تمام مسجدوں کو مسجدیت کا اعزاز بخشا ہے عین اس مسجد میں جا کر سجدہ ریز ہو۔

علاوہ ازیں حج میں نماز کی وہ قسم بھی شامل ہے جس کے ادا کرنے کی سعادت آدمی کو حج کے سوا اور کسی دوسرے موقع پر حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ میری مراد طواف سے ہے۔ قرآن مجید کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے ثابت ہے کہ طواف بھی درحقیقت نماز ہے۔ یہ نماز صرف خانہ کعبہ کے اردگرد ہی ادا کی جا سکتی ہے، اس کے سوا دنیا میں اور کہیں بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔ اس نماز میں بندہ جب حجر اسود کو، جس کو اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کہا گیا ہے، بوسہ دے کر یا اس کو ہاتھ لگا کر بار بار اپنے رب کے ساتھ اپنے عہدِ اطاعت کی تجدید کرتا ہے اور پھر خانہ کعبہ کے اردگرد دعائیں پڑھتا ہوا اس طرح چکر کرتا ہے، جس طرح شمع کے اردگرد پروانہ چکر کرتا ہے تو غافل سے غافل انسان کی روح بھی وجد میں آ جاتی ہے۔ پھر جب آدمی خیال کرتا ہے کہ اس کی یہ نماز مشابہ ہے اس نماز سے جو فرشتے عرش الٰہی کے اردگرد پڑھ رہے ہیں تو ایک صاحب دل کے دل کی جو حالت ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے وہ حالت کسی طرح بھی لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

نماز کے بعد اسلامی عبادات میں دوسرا درجہ زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں انفاق کا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حج کے اندر انفاق کا بھی ایک نمایاں حصہ ہے۔ حج کے لیے زادِ راہ کا انتظام، عام لوگوں کے لیے، جن کی آمدنی کے ذرائع بالکل محدود ہیں، ایک بڑا مشکل مسئلہ ہوتا ہے، بالخصوص اس زمانہ میں تو یہ مسئلہ مشکل سے مشکل تر ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف وسائل سفر اور ضروریات سفر میں سے ہر چیز گراں سے گراں تر ہو گئی ہے، ثانیاً حجاز کی حکومت اور وہاں کے عام باشندے بھی حجاج کو اللہ کے مہمان سمجھنے کے بجائے ان کو اپنے لیے آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور تمام ممکن راستے ان کو زیر بار کرنے کے اختیار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جو شخص حج کے لیے نکلتا ہے، بالعموم اپنی آمدنی کے موجودہ ذرائع سے کم از کم زمانہ سفر تک کے لیے اگر یک قلم نہیں تو بہت بڑی حد تک دست کش ہو کر نکلتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی اگلی اور پچھلی کمائی کا بڑا حصہ اپنی

اصلاح نفس کے اس جہاد پر صرف کر دیتا ہے۔

اسی طرح حج میں روزے کی روح بھی موجود ہے۔ روزے کی اصلی روح، ہم بیان کر چکے ہیں کہ ترک وانقطاع اور تبتل الی اللہ ہے۔ یہ چیز حج کے اندر بدرجہ کمال موجود ہے۔ احرام میں جو پابندیاں ہیں وہ اگرچہ مدت کے اعتبار سے روزے کی پابندیوں کے مقابل ہلکی ہیں لیکن اپنے مزاج اور اپنی کیفیت کے لحاظ سے ان سے زیادہ سخت ہیں۔ روزے میں زہد اور درویشی کی جو جھلک ہے وہ حج میں، بالخصوص حالت احرام میں، اپنے اس آخری درجہ تک پہنچ جاتی ہے جس درجہ تک اسلام نے اس کو پسند کیا ہے۔ اس سے آگے رہبانیت کے حدود شروع ہو جاتے ہیں جو اسلام میں ناجائز ہے۔

نماز، انفاق اور روزہ، یہ اسلام میں مستقل عبادات کی حیثیت رکھتے ہیں اور آپ نے دیکھ لیا کہ حج میں ان سب کی روح شامل ہے لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادتیں بھی ہیں جن کا مطالبہ اسلام نے صرف خاص خاص حالات ہی کے اندر کیا ہے، مثلاً ہجرت اور جہاد۔ یہ عبادتیں اگرچہ ہنگامی ہیں لیکن جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو دین میں ان کی اہمیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ دوسری تمام عبادتوں پر ان کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حج کے اندر ان ہنگامی عبادات کی بعض شانیں بھی موجود ہیں۔

ہجرت کی اصل حقیقت فرار الی اللہ ہے۔ یعنی بدی سے نیکی کی طرف، شر سے خیر کی طرف اور شیطان سے رحمان کی طرف بھاگنا۔ حج میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہجرت کی یہ حقیقت بھی موجود ہے۔ جو شخص حج کے لیے نکلتا ہے اپنے گھر کو، اپنے وطن کو، اپنے اعزہ واقرباء کو اور اپنے بہت سے دنیوی مفادات وتعلقات کو چھوڑ کر نکلتا ہے۔ اپنے پروردگار کی خوشنودی اور اپنے خالق و مالک کی رضا کے سوا کوئی اور غرض وغایت اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ اگرچہ گھر اور وطن سے یہ نکلنا عام حالات میں عارضی مدت ہی کے لیے ہوتا ہے لیکن جہاں تک گناہ اور معصیت کی زندگی کا تعلق ہے اس کو ہمیشہ کے لیے بدل دینے کا عزم صمیم تو حج کی اصل حقیقت اور بعینہٖ یہی حقیقت ہجرت کی بھی ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

المهاجر من هجر ما نهى الله عنه. (صحیح البخاری: کتاب الایمان باب ۳)

حقیقی مہاجر اللہ کے نزدیک وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے روکا ہے۔

اسی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جہاد کی بھی بہت سی خصوصیات حج کے اندر موجود ہیں۔ یوں تو حج کے پورے زمانے میں آدمی کی زندگی خدا کے سپاہی کی زندگی بن جاتی ہے، جو اپنا پانی کا مشکیزہ اور تھوڑا سا زادِ راہ اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک محاذ سے دوسرے محاذ تک پہنچنے کے لیے ہر وقت چاق و چوبند رہتا ہے، لیکن خاص کر حج کے چند دنوں کے اندر تو اس کی زندگی کو اگر تشبیہ دی جا سکتی ہے تو فی الواقع ایک مجاہد کی زندگی ہی سے دی جا سکتی ہے۔ مکہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے پھر منیٰ، دھوپ ہو، بارش ہو، ژالہ باری ہو، ہر حالت میں، بہر صورت، وقت معینہ پر پہنچتا ہے۔ نہ بھوک کی پروا ہے نہ پیاس کی، نہ لو کا احساس ہے نہ سردی کا، نہ تکیہ کی تلاش ہے نہ بستر کی، خدا کی پسندیدہ وردی جسم پر ہے اور لبیک الّٰلھم لبیک! کی صدا زبان پر، نہ زندگی کی پروا ہے اور نہ موت کا اندیشہ۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہ بات بھی کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ عرفات اور مزدلفہ کے میدانوں میں مرنے کی جتنی آرزو دل میں ہوتی ہے اتنی جینے کی آرزو نہیں ہوتی۔ اس ترقی کے زمانہ میں بھی قدم قدم پر آدمی جان کے خطرے سے دوچار ہوتا ہے اور ہر سن و سال کے لوگوں کو مرتے دیکھتا ہے جو ان مقامات پر مرتے ہیں اور اپنے احرام کی دو چادروں کے ساتھ انہی پتھریلی زمینوں میں دفن کیے جاتے ہیں۔

منیٰ میں جمرات پر جو کنکریاں ماری جاتی ہیں ان کو کوئی شخص چاہے شیطان پر کنکریاں مارنا سمجھے یا ابرہہ کی فوجوں پر جو آسمانی سنگ باری ہوئی تھی اس کی یادگار سمجھے، بہرحال یہ کنکریاں مارنا اللہ کے دشمنوں پر لعنت اور سنگ باری کی ایک عظیم یادگار ہے اور اللہ و رسول نے اس یادگار کو حج کے مناسک میں اسی لیے محفوظ کر دیا ہے تاکہ حج مسلمانوں کی روح جہاد کو بھی زندہ اور تابندہ رکھے۔

حج کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے یہ عورتوں کے لیے حقیقی جہاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ:

جهاد كن الحج۔ (صحیح البخاری: کتاب الجہاد باب ۶۱)
حج ہی تمہارا جہاد ہے۔

حج انسان پر ہر راہ سے اثر انداز ہوتا ہے

حج کی جامعیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان پر اثر انداز ہونے کے جتنے راستے بھی ہیں یہ ان تمام راستوں سے اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ آدمی کو سمع، بصر اور فؤاد کی جو صلاحیتیں اور قابلیتیں بھی قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہیں ان سب کو بیدار کر دینے کے لیے اس کے اندر بہتر سے بہتر اسباب و محرکات جمع کر دیے گئے ہیں۔ جو معنوی اور روحانی حقیقتیں آسانی کے ساتھ انسان کی عقل کی گرفت میں نہیں آتی ہیں، ان کو حج میں شعائر کی صورت میں محسوس و مشہود کر دیا گیا ہے تاکہ وہ انسان کے حواس کی گرفت میں آسکیں۔ حج کے مناسک سے یکے بعد دیگرے گزرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک کی پوری تاریخ اپنے تمام آثار و نشانات کے ساتھ آدمی کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یہ گھر ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے بنایا۔ یہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمازیں پڑھیں۔ یہ پہاڑی ہے جس کے دامن میں باپ نے اپنے محبوب بیٹے کی قربانی کی۔ یہ میدان ہیں جہاں انہوں نے دعوت الی اللہ کے خطبے دیے اور جس کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اور جس کی تپتی ہوئی ریتوں پر انہوں نے دعائیں اور مناجاتیں کیں۔ یہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے صرف حافظہ ہی میں نہیں تازہ ہو جاتی ہیں بلکہ نگاہوں کے سامنے بھی آجاتی ہیں۔ جن چیزوں کے ذکر اب تک صرف بزرگوں کی زبانی ہی سنے تھے یا صرف کتابوں کے صفحات ہی میں پڑھے تھے، ان کو آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس وقت فی الواقع آدمی کو اندازہ ہوتا ہے کہ جس نے کہا ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ سنی ہوئی بات کی وقعت دیکھی ہوئی بات کے مقابلہ میں نہیں ہو سکتی اس نے کتنی سچی بات کہی ہے۔

بسا اوقات ان مقامات و مناسک سے گزرتے ہوئے جب آدمی کو یہ خیال آجاتا ہے کہ کیا عجب کہ جہاں وہ اس وقت کھڑا ہے عین اسی جگہ کبھی حضرات ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام بھی

کھڑے ہوئے ہوں یا جس جگہ وہ سجدہ کر رہا ہے اس جگہ کو ان کے سجدوں کی تقدیس بھی حاصل ہوئی ہو تو اس وقت کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ قیام کیا چیز ہے اور سجدہ کس چیز کو کہتے ہیں!

پھر اس سے زیادہ موثر ہمارے لیے نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار و مقامات ہوتے ہیں۔ آدمی چپہ چپہ پر ان کے نشانات اور ان کے کارناموں کو ثبت دیکھتا ہے۔ جس شہر میں حضور ﷺ پیدا ہوئے، جس کی گلیوں اور جس کے کوچوں میں آپؐ دعوتِ حق لے کر پھرے، جس کے حرم میں آپؐ نے نمازیں پڑھیں، جس کی پہاڑیوں میں آپؐ کے مؤذن کی اذانیں گونجیں، جہاں آپؐ نے اللہ کے دین کی خاطر طرح طرح کی تکلیفیں جھیلیں، جس محبوب شہر کو اللہ کے لیے آپؐ نے چھوڑا اور پھر جس شہر کو آپؐ نے اپنی دعوت کا مرکز بنایا، جن میدانوں اور پہاڑوں میں آپؐ نے اپنی دعوت کا مرکز بنایا، جن میدانوں اور پہاڑوں میں آپؐ کے صحابہؓ نے اعلائے حق کے لیے جنگیں کیں، یہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے جب انسان کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں تو اسلام کی پوری تاریخ اس طرح اس کے سامنے مشہود ہو جاتی ہے گویا اس کے اور اسلام کے دورِ اول کے درمیان زمان و مکان کا کوئی پردہ اب سرے سے حائل ہی نہیں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عبادت کا انسان پر جو اثر پڑتا ہے وہ کسی بھی دوسری عبادت کا نہیں پڑتا اور پھر بالکل اسی کے برابر کی دوسری حقیقت یہ ہے کہ جو شخص حج سے محروم لوٹتا ہے پھر اس کی اصلاح کسی بھی دوسری چیز سے نہیں ہوتی۔ اسلام میں اس کی حیثیت روحانی امراض کے آخری علاج کی ہے۔ جس کو اس سے فائدہ نہیں ہوا اس کے لیے کوئی دوا بھی نافع نہیں ہوگی۔

یہاں پہلے ہم حج کی برکتیں بیان کریں گے اور اس کے بعد اس کی آفات اور ان کے علاج سے بحث کریں گے۔

حج کی برکات

روحانی کایا کلپ

جس طرح جسمانی امراض کے علاج کی قسموں میں علاج کی ایک قسم وہ ہے جس کو کایا کلپ کہتے ہیں، اسی طرح روحانی امراض کے علاج کے لیے حج ہے۔ یہ علاج کا ایک ایسا کورس ہے جس کو اگر اس کے تمام شرائط کے ساتھ کوئی شخص آخر تک نباہ لے جائے تو وہ تمام روحانی بیماریوں سے صحت یاب ہو کر ٹھیک اس فطرت اللہ پر پہنچ جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے اور جس پر وہ چاہتا ہے کہ یہ مرے۔ یہ حقیقت متعدد حدیثوں سے واضح ہوتی ہے لیکن ہم اختصار کے خیال سے صرف ایک حدیث یہاں نقل کرتے ہیں:

> عن ابی هريرة رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: من حجّ هذا البيت فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم ولدته امه.
>
> (صحیح البخاری: کتاب الاحصار و جزاء الصید باب ۱۰)
>
> حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا کہ جس نے حج کیا اور اس دوران میں نہ اس نے کوئی شہوت کی بات کی اور نہ خدا کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کیا، وہ تمام گناہوں سے اس طرح پاک و صاف ہو گیا جس طرح وہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔

جنت کی ضمانت

حج چونکہ اسلام اور ہجرت کی طرح آدمی کے گناہوں کو فنا کر دیتا ہے اس وجہ سے اس شخص کے لیے جس کو حج مبرور کی سعادت حاصل ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کی ضمانت ہے:

> عن ابی هريرة رضی اللّٰه عنه انّ رسول اللّٰه ﷺ قال: العمرة الى العمرة

> كفّارة لما بينهما. والحج المبرور ليس له جزاءٌ الّا الجنّة.
>
> (صحیح البخاری: ابواب العمرۃ باب ۱)
>
> حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک عمرہ کے بعد آدمی اگر دوسرا عمرہ کرے تو یہ عمرہ درمیان کے تمام گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتا ہے۔ اور حج مبرور کا صلہ تو جنت سے کچھ کم ہے ہی نہیں۔

حج مبرور سے مراد وہ حج ہے جو اللہ تعالیٰ کی کسی نافرمانی کی آلودگی سے پاک ہو۔ اس حج کے متعلق حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کی جزا جنت سے کم کچھ ہے ہی نہیں!

تجدیدِ عہد

حج کے ذریعے بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے اس عہد کو از سر نو استوار کر لیتا ہے جو ایک مسلم کی حیثیت سے اس نے اپنے رب سے کیا ہے۔ یہ تجدید عہد اگرچہ ہر توبہ و استغفار سے ہوتی ہے لیکن اس تجدید عہد کا جو عزم و ارادہ حج میں ظاہر ہوتا ہے وہ عام توبہ و استغفار میں نہ ظاہر ہوتا ہے اور نہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ آدمی اس تجدید عہد ہی کے لیے رخت سفر باندھتا ہے اور ایک طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اپنے رب کے دروازے پر حاضری دیتا ہے۔ یہ گھر سے نکلنا اور اس مقصد کے لیے سفر کرنا ہی بجائے خود ایک بہت بڑی چیز ہے۔ یہ بندے کے اخلاص اور اس کی صدق طلبی کا ایک نہایت واضح نشان ہے اور اس سے خدا کی رحمت اس کے لیے جوش میں آتی ہے۔

پھر جب وہ حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے یا اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو گویا خدا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہد بندگی و اطاعت کی تجدید کرتا ہے۔

اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کی جگہ پر پہنچ کر ان کی قربانی کی سنت کو تازہ کرنا درحقیقت اپنی زندگی کو از سر نو خدا کی نذر کرنا ہے کیونکہ قربانی کی اصلی حقیقت اپنے آپ کو خدا کی حوالگی اور سپردگی میں دے دینا ہے اور یہی حقیقت اسلام کی بھی ہے۔ اسلام کے معنی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینے کے ہیں۔ یعنی خدا کی مرضی اور اس کی پسند کے آگے آدمی کی اپنی کوئی

مرضی اور اپنی کوئی پسند باقی نہ رہ جائے۔ آدمی اپنی محبوب سے محبوب اور عزیز سے عزیز چیز بھی خدا کے لیے ہر وقت قربان کر دینے کے لیے تیار رہے۔ اس حقیقت کو واقعہ کی شکل میں اور اس فلسفہ کو عمل کے جامہ میں پوری تاریخ انسانی میں جس نے پیش کیا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے اپنے محبوب بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خدا کے لیے قربان کر دینے کا عزم بالجزم ظاہر کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فی الواقع انہوں نے اپنا سب کچھ بغیر کسی استثناء اور تحفظ کے خدا کے حوالے کر دیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اقدام اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند آیا کہ اس نے ان کو مسلم کے لقب سے نوازا اور جس بیٹے کو انہوں نے قربان کیا اس کی نسل سے ایک امت مسلمہ برپا کی اور اس کی خاص خصوصیت یہ ٹھہرائی کہ وہ دین اسلام کی حامل بنے اور اس اسلام کی اصل حقیقت کو اپنے اندر برابر زندہ اور تابندہ رکھنے کے لیے اس ابراہیمی قربانی کی یادگار مناتے ہیں اور ان کی طرف سے ان کے اس عمل سے اس بات کا اظہار بھی شامل کیا گیا ہے۔ جو اللہ کے بندے اس مقدس قربان گاہ تک پہنچ پاتے ہیں وہ وہاں پہنچ کر اس قربانی کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ جو مشکلات اور موانع کے سبب سے وہاں نہیں پہنچ پاتے وہ اپنی اپنی بستیوں ہی میں اس قربانی کی یادگار مناتے ہیں تاکہ ان کے اندر اسلام کی اصل حقیقت کا شعور بھی زندہ رہے اور ان کی طرف سے ان کے اس عمل سے اس بات کا اظہار بھی ہوتا رہے کہ وہ اصل قربان گاہ پر پہنچ کر اس قربانی کی سعادت حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

اس قربانی کی اصلی حقیقت خدا کی راہ میں جان کی قربانی ہے لیکن اللہ تعالےٰ نے محض اپنے فضل اور اپنی مہربانی سے ہمیں اس کا موقع دیا ہے کہ ہم اپنی طرف سے کسی جانور کی قربانی کر کے اپنی جان کا فدیہ ادا کر دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے ایک بہت بڑی رعایت ہے اور اس نے جو جانور ہماری خدمت کے لیے پیدا کیے ہیں، جب وہ خدا کی راہ میں ہمارے بدل کی حیثیت سے قربان ہوتے ہیں تو یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو ہماری وہ انجام دیتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ اشرف مقصد ہے جس میں ہم ان کو استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ ہر چیز کو صرف معاشی پیمانوں سے ناپتے ہیں وہ ان چیزوں کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے، اس وجہ سے ان پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھیڑوں بکریوں کی قدر و قیمت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے زیادہ ہے۔

غرض حج کے موقع پر ان میں سے ایک ایک چیز سے بندہ اپنے آپ کو اس حیثیت میں پیش کرتا ہے کہ گویا وہ ایک مفرور غلام تھا اور اب پھر وہ اپنے مالک و آقا کے دروازے پر از خود حاضر ہوا ہے تاکہ اس کے ساتھ اپنے عہد غلامی کو از سر نو استوار کرے اور ہمیشہ اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کرتے رہنے کا اقرار کرے۔

امت کی وحدت کا مظاہرہ

اوپر ہم نے حج کی جو برکتیں بیان کی ہیں' یہ افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں حاصل ہوتی ہیں، لیکن حج کے اندر بعض نہایت اہم اجتماعی برکتیں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ صرف حج ہی کا ایک موقع ایسا موقع ہے جس میں یہ حقیقت سورج سے بھی زیادہ روشن ہو کر ہر شخص کے سامنے آ جاتی ہے کہ اس امت کے مختلف اجزاء کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے والی اور ان کو ان کی بنیان مرصوص بنانے والی چیز دراصل کیا ہے۔ زبانیں مختلف، قومیتیں اور جنسیتیں مختلف، امصار و بلاد مختلف، ذوق اور طبائع مختلف، لباس مختلف، حد یہ ہے کہ نمازیں ادا کرنے کے طریقے بھی بعض ظواہر میں ایک دوسرے سے مختلف۔ لیکن لبیک! لبیک! کی صدا سب کی زبانوں پر، احرام کی چادریں سب کے جسموں پر، بیت اللہ پر نثار سب پروانہ وار، ایک ہی امام کی اقتداء میں، بیت اللہ کے اردگرد سب مصروف رکوع و سجود! اختلاف کے اندر وحدت کا اور گوناگونی و بوقلمونی کے ساتھ ہم آہنگی و ہم رنگی کا جو مظاہرہ حج میں ہوتا ہے' وہ صرف حج کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس کو حج کی سعادت حاصل نہ ہوئی ہو وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا!

باب ۱۸

آفاتِ حج اور ان کا علاج

حج کی برکات جس طرح نہایت عظیم الشان ہیں اسی طرح اس کے لیے آفات بھی نہایت خطرناک ہیں۔ جو شخص اس کی برکتوں سے بہرہ ور ہونا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ان آفتوں سے اچھی طرح واقف ہو اور ان سے اپنے حج کو محفوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ جو شخص اپنے حج کو ان آفتوں سے محفوظ نہ رکھ سکے اس کا حج کی برکتوں سے بہرہ مند ہونا تو درکنار، اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ وہ روحانی واخلاقی اعتبار سے پہلے سے بھی زیادہ مریض ہو جاتا ہے اور چونکہ حج کی حیثیت، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، آخری علاج کی ہے، اس وجہ سے اس علاج کے ناکام ہو جانے کے بعد ایسے شخص کو دوسرا علاج مفید بھی مشکل ہی سے ہوتا ہے۔

ہم یہاں اختصار کے ساتھ حج کی آفتوں اور ان کے علاج پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

شہوانی باتیں

قرآن مجید میں جہاں حج کی آفات کا ذکر ہوا ہے وہاں سب سے پہلے شہوانی باتوں سے متنبہ کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ

فِي الْحَجِّ ط (البقرۃ ۲-۱۹۷)

حج کے متعین مہینے ہیں تو جو کوئی ان میں حج کا عزم کر لے تو پھر اس کے لیے حج تک نہ شہوت کی کوئی بات کرنی ہے نہ فسق وفجور کی نہ لڑائی جھگڑے کی۔

قرآن نے یہاں حج کی تین آفتوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں رفث یعنی شہوانی باتوں کو مقدم رکھا ہے اس وجہ سے ہم بھی سب سے پہلے اسی پر گفتگو کریں گے۔

قرآن مجید نے اس خطرہ سے سب سے پہلے غالباً اس وجہ سے آگاہ کیا ہے کہ سفر حج و حج میں شہوانی فتنوں میں پڑ جانے کے آدمی کے لیے بہت سے محرکات جمع ہو جاتے ہیں۔ اول تو سفر میں ہونے کی وجہ سے آدمی کی طبیعت کا وہ اعتدال باقی نہیں رہتا جو اسے حضر کی زندگی میں حاصل ہوتا ہے۔ ثانیاً جس چیز سے آدمی کو روک دیا جائے آدمی کی طبیعت کے اندر اس چیز کے لیے اکساہٹ بڑھ جاتی ہے اور شیطان آدمی کی طبیعت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ ثالثاً سفر کی وجہ سے اور اس سے زیادہ احرام کی وجہ سے عورتوں کے پردے کا وہ رکھ رکھاؤ قائم نہیں رہتا جو عام حالات میں قائم رکھا جاتا ہے۔ رابعاً بسوں میں، راستوں میں، نکلنے اور داخل ہونے کے دروازوں میں، مطاف میں، مسعٰی میں، حرم میں، زمزم پر، غرض کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی ہے جہاں سخت اژدحام اور کشمکش کی حالت میں غیر محرم عورتوں سے تصادم نہ ہوتا ہو۔ خامساً اس زمانہ میں تقریباً اکثر ممالک میں مسلمان عورتیں پردے کی قیود سے آزاد ہو گئی ہیں، اس وجہ سے صرف احرام ہی کی حالت میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی ہر سن وسال کی عورتیں ہر جگہ چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور بعض حالات میں صرف پردے ہی کے حدود نہیں بلکہ شرم وحیا کے حدود بھی توڑ تاڑ کے رکھ دیتی ہیں۔

ان حالات کے اندر اگر کوئی شخص پوری طرح متنبہ اور ہوشیار نہ رہے تو بڑی آسانی کے ساتھ اور کچھ نہیں تو قدم قدم پر اپنی نگاہ کو ضرور آلودہ کر سکتا ہے اور جب نگاہ آلودہ ہو گئی تو وہ اپنے دل کو آلودہ ہونے سے کس طرح بچا سکتا ہے؟

اس آفت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جب سفر حج پر نکلے تو جس مقدار میں مادی زاد راہ کا انتظام کرے اس سے زیادہ مقدار میں روحانی زاد راہ — یعنی تقویٰ — کا

اہتمام کرے۔ آدمی گھر سے یہ عزم بالجزم کر کے اٹھے کہ اس پورے سفر میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ہر چھوٹی بڑی حد کی پابندی کرنی ہے۔ اس عزم کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذکر کو لازم کر لے اور کسی وقت بھی اس سے غافل نہ ہو تا کہ شیطان کو اس کے اندر اپنی وسوسہ اندازیوں کے لیے گھسنے کا کوئی وقت نہ ملے۔ اپنی نگاہ حتی الامکان نیچی رکھنے کی کوشش کرے، اس لیے کہ نگاہ ہی دل میں اترنے کا راستہ ہے۔ اگر آدمی اس دروازے کو چوپٹ کھلا نہ چھوڑے رکھے تو بہت سی آفتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ حدود حرم میں داخل ہونے کے بعد آدمی کو بار بار اس بات کا دھیان کرنا چاہیے کہ یہ اللہ کا شہر ہے، یہ اللہ کا حرم ہے اور یہ محترم مہینہ ہے، ان میں ہر چیز کی حرمت کا تقاضا ہے کہ نہ دل بھٹکے، نہ نگاہ اور اگر محسوس کرے کہ طبیعت پر قابو نہیں پا رہا ہے تو اس پر روزے کا بھی اضافہ کرے تا کہ فاسد رجحانات کا زور ٹوٹے اور طبیعت پر تجمل اور میلان الی اللہ غالب آ جائے۔ عرفات میں میدان حشر کا تصور غالب رہنا چاہیے۔ جس طرح میدان حشر کے متعلق احادیث میں وارد ہے کہ لوگ ننگے اٹھیں گے لیکن حالت ایسی ہوگی کہ کسی کو کسی کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں ہوگی اسی طرح عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں اس طرح اپنے آپ کو دعا اور مناجات میں مشغول رکھنا چاہیے کہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کرنے کی آدمی کو فرصت ہی نہ ملے۔

اس بات کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ حالت احرام میں عورتوں کو چہرے کھلے رکھنے کا جو حکم ہے وہ حج اور ایام حج کے اس مزاج کے لحاظ سے ہے جو اس کا فی الواقع ہونا چاہیے۔ حج کا حقیقی مزاج درویشی اور زہد کا ہے، اس وجہ سے جو شخص حج کے لیے نکلے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنے مزاج کو بھی حج کے مزاج کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ بناؤ سنگار، نمود و نمائش اور دوسروں پر اثر انداز ہونے کی ہر خواہش اور ہر کوشش سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ عورتوں کو بالخصوص اس چیز کا خاص طور پر اہتمام کرنا چاہیے۔ ان کا کوئی غلط انداز صرف انہی کے حج کو نہیں بلکہ دوسروں کے حج کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔

جو مواقع تصادم اور کشمکش کے ہیں، مثلاً حجر اسود پر یا مطاف میں یا قبر نبوی پر یا رمی' جمرہ کے وقت، وہاں ہر مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو عورتوں کے ساتھ تصادم سے بچائے اور اس تصادم سے بچنے کے لیے اگر اولیٰ کو چھوڑ کر وہ شریعت کے ادنیٰ پر عمل کرے تو ان شاء اللہ اس کو

فتنہ اور تصادم سے بچنے کی کوشش کی وجہ سے اولیٰ کا ہی ثواب ملے گا۔ مردوں کے مقابل میں اس بات کا خیال و اہتمام عورتوں کے لیے زیادہ ضروری ہے۔ عورتوں کے لیے بہتر یہ ہے کہ ان تمام مواقع پر حاضری کے لیے وہ اوقات منتخب کریں جن میں وہ مردوں کے ساتھ تصادم سے اپنے آپ کو بچا سکیں اور اگر کسی مجبوری کے سبب سے اس تصادم سے سابقہ پیش آ ہی جائے تو انہیں ان رخصتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو عورتوں کے لیے شریعت میں ہیں۔ بہت سے لوگ، جن میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہیں، شریعت کے اولیٰ و افضل پر عمل کرنے کے جوش میں دھکم پیل کو بھی ایک نیکی کا کام سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس نیکی کے کمانے کے شوق میں بہت سی دوسری نیکیوں کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

حدود اللہ اور شعائرِ الٰہی کی بے حرمتی

حج کے سلسلہ کی دوسری آفت حدود اللہ اور شعائر الٰہی کی بے حرمتی ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی میں شریعت کی جو پابندیاں ہیں حج ان پر مزید بہت سے اضافے کر دیتا ہے۔ حج کا مہینہ محترم، حج کے مقامات محترم، حالت احرام کی پابندیاں محترم' حد یہ ہے کہ حالت احرام میں آپ اپنے بال اور ناخن بھی اگر ترشوا دیں تو اس سے بھی حج کی حرمت کو بٹہ لگتا ہے۔ جس عبادت کی نزاکتوں کا یہ حال ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں دین کے دوسرے احکام و آداب کا اہتمام کس درجہ مطلوب ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں شریعت کے احکام و آداب کی پابندی کے عادی نہیں ہوتے، وہ حج کے موقع پر کچھ اور زیادہ ڈھیلے ڈھالے ہو جاتے ہیں اور قدم قدم پر ان سے ایسی باتیں صادر ہوتی ہیں جو اس فسوق کے تحت آتی ہیں جسے قرآن نے حج کے سلسلہ کی دوسری آفت قرار دیا ہے۔

بہت سے لوگ بات بات پر لڑتے جھگڑتے ہیں' آزادی کے ساتھ گالم گلوچ کرتے ہیں' لین دین میں بد معاملگیوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

بہت سے لوگ شرم و حیا کے تمام حدود بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ عین حرم کے پاس ہزاروں گزرنے والوں کے سامنے ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں۔ نہ انہیں حرم کی پروا ہوتی

ہے، نہ آنے جانے والوں کی۔ بعض لوگ، جن میں خواتین بھی شامل ہیں، احترام بیت اللہ اور حیا کے احساس سے اس قدر عاری ہوتے ہیں کہ زمزم کی ٹونٹیوں کے نیچے ننگے ہو کر نہاتے ہیں۔ بہت سے لوگ حرم کے ہر حصے میں اس بے تکلفی کے ساتھ تھوکتے ہیں اور ناک صاف کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حرم اور غیر حرم میں سرے سے کوئی امتیاز ہی نہیں ہے، بالخصوص جن خواتین کے ساتھ بچے ہوتے ہیں، وہ تو حرم کے احترام کے معاملہ میں بالکل ہی بے پروا ہوتی ہیں۔

اس طرح کی باتیں زیادہ تر دو چیزوں کا نتیجہ ہیں: ایک ناواقفیت کا، دوسری تہذیب و تربیت سے محرومی کا۔

ان دونوں چیزوں میں سے جہاں تک علم و واقفیت کی کمی کا تعلق ہے، یہ مسئلہ کچھ بہت زیادہ مشکل نہیں ہے۔ تقریباً تمام مسلمان ممالک میں حج کے سرکاری ادارے موجود ہیں۔ اگر یہ ادارے اپنے سامنے حجاج کو آداب حج اور آداب حرمین شریفین سے واقف کرنا بھی رکھ لیں اور سعودی حکومت بھی اپنے تمام متعلق شعبوں کے ساتھ دوران حج میں اس کے لیے مستعد ہو جائے تو بڑی آسانی کے ساتھ ہر طبقے اور ہر درجے کے حجاج کو ساری ضروری باتوں سے واقف کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کی حکومت اگر اس امر کا اہتمام کرے کہ جس وقت سے کوئی پاکستانی حج کے لیے درخواست دیتا ہے اس وقت سے لے کر اس وقت تک جب تک وہ پاکستان کے ساحل کو چھوڑتا ہے، برابر کسی نہ کسی نوعیت سے ان باتوں سے واقف ہوتا رہے جو باتیں اس کے پیش نظر مقصد کے لیے ضروری ہیں تو یہ اہتمام ایک اسلامی حکومت کے پہلو سے اپنے حجاج کے لیے اس پر ضروری بھی ہے اور اس کا اہتمام بغیر کسی خاص زحمت اور بغیر کسی خاص بڑے خرچ کے وہ کر بھی سکتی ہے۔ مختلف شکلیں ایسی اختیار کی جا سکتی ہیں جن سے عازمین حج کے کانوں اور ان کی نگاہوں سے وہ ساری چیزیں گزر جائیں جن کا اہتمام عازمین حج کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے پمفلٹ بھی چھاپے جا سکتے ہیں۔ ٹکٹ کے دفتروں سے لے کر حاجی کیمپ اور کسٹم تک ہر جگہ دیواروں اور تختیوں پر ضروری ہدایات بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ حاجی کیمپ میں مذہبی انجمنوں کے تعاون سے

آداب حج سے متعلق تقریروں کا بھی اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ حج کے زمانے میں ریڈیو سے حج اور شعائر حج کے مقاصد اور ان کے آداب و احکام پر علماء سے تقریریں بھی نشر کرائی جا سکتی ہیں اور بڑی آسانی سے کم از کم حاجی کیمپ میں ٹھہرنے والے حجاج کے لیے ایک ریڈیو لگا کر ان تقریروں کے سننے کی آسانی بھی بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ جہازوں پر ایک امیر حج مقرر کرنے کا دستور موجود ہی ہے۔ یہ دستور بھی نہایت اچھا ہے البتہ اس امر کے اہتمام کی ضرورت ہے کہ ہر جہاز کے لیے امیر حج ایسا منتخب کیا جائے جو ذی علم ہو اور اس کے لیے وہ ضروری سہولتیں حکومت اور جہازی کمپنیوں کی طرف سے بہم پہنچائی جائیں جو جہاز کے دوران سفر میں عازمین حج کی تعلیم و تربیت کے لیے ضروری ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہت معمولی سہولتیں بہم پہنچا دینے سے اس مقصد کے لیے موزوں اشخاص میسر آ سکتے ہیں۔

یہ کام جس طرح حکومت کے کرنے کے ہیں' اسی طرح دینی و مذہبی انجمنوں کے بھی کرنے کے ہیں۔ ان انجمنوں کو کم از کم حج کے مہینوں میں اس بات کے لیے فکر مند ہونا چاہیے کہ ہمارے جو بھائی سفر حج کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور اس کے لیے کثیر مصارف کا بوجھ اٹھاتے ہیں' ان کا یہ سفر ہر پہلو سے نتیجہ خیز اور بابرکت ہو۔ وہ اپنی بے علمی اور عدم تربیت کے سبب سے اپنی اس عظیم محنت کو ضائع نہ کر بیٹھیں۔ اگر ہمارے ملک کی انجمنیں اس کی حقیقی اہمیت محسوس کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح وہ اپنے ملک کے عوام کے تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں بڑی مفید خدمت انجام دے سکتی ہیں اور اس کا ان کو آخرت میں بڑا اجر ملے گا۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑی ذمہ داری سعودی حکومت کی ہے لیکن میں نے ذاتی تجربہ سے محسوس کیا ہے کہ سعودی حکومت کی ساری سرگرمیاں حجاج کے حمل و نقل تک محدود ہیں، ان کی تعلیم و تربیت کے معاملے سے یا تو وہ کوئی خاص دلچسپی رکھتی ہی نہیں یا ایام حج میں اس کے اوپر انتظامی معاملات کا اتنا بوجھ آ پڑتا ہے کہ وہ اس پہلو کی طرف کوئی توجہ دے ہی نہیں سکتی۔ حالانکہ اگر وہ اس پہلو کی طرف توجہ دے تو اس سلسلہ میں بہت کچھ کر سکتی ہے۔ اس کے پاس معلمین کا وسیع نظام ہے۔ یہ معلمین جس طرح مناسک حج کی ادائیگی میں حجاج کی رہنمائی کرتے ہیں، دوسری ضروری باتوں کی تعلیم کے لیے بھی ذریعہ بن سکتے ہیں۔ سعودی حکومت کا شعبہ امر بالمعروف و

نهی عن المنکر بھی اگر مستعد ہو کر کام کرے تو بڑی مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ روزانہ حرم میں لاؤڈ سپیکر سے ضروری ہدایات نشر بھی کی جاسکتی ہیں، مختلف زبانوں میں پمفلٹ چھاپ کر بھی تقسیم کیے جاسکتے ہیں اور حرم کے تمام دروازوں پر بڑے بڑے سیاہ بورڈوں پر ضروری باتیں مختلف زبانوں میں لکھی جاسکتی ہیں۔

اگر اپنے اپنے ملکوں سے لے کر حج کے تمام مقامات و مناسک تک حجاج کے سامنے سے ضروری ہدایات گزرتی رہیں تو یہ بے اثر نہیں رہ سکتیں۔ ان سے صرف وقتی ہی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ کم و بیش تین مہینوں کے اندر اندر (جو ایک حاجی اس سفر میں گزارتا ہے) اس کورس سے گزر کر ایک حاجی وہ ساری باتیں سیکھ لے سکتا ہے، جن کا سیکھنا ضروری ہے۔

رہا عملی تربیت کا معاملہ تو یہ معاملہ بہت مشکل ہے۔ حج کے موقع پر فی الواقع صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہمارے مسلم معاشرہ کا تہذیب و تمدن، تربیت اور اخلاق و آداب کے لحاظ سے کیا حال ہے۔ اس پہلو سے تقریباً تمام مسلم ممالک کا حال یکساں ہی معلوم ہوتا ہے۔ اگر فرق ہوگا تو بس کچھ درجے اور ڈگری کا فرق ہوگا۔ صاف نظر آتا ہے کہ مسلم معاشرے کے ذمہ داروں نے خواہ وہ حکمرانوں کے قبضہ سے تعلق رکھتے ہوں یا عام علماء و مصلحین کے طبقہ سے، اپنے اپنے ملکوں کے عوام کو اسلامی مفہوم میں مہذب بنانے میں بہت کم حصہ لیا ہے۔ حالانکہ یہ ذمہ داری انہی کی ہے۔ عوام تربیت خود تو کرنے سے رہے۔ یہ کام بہر حال حکومتوں اور قائدوں ہی کے کرنے کا ہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے بڑی بڑی باتوں سے لے کر آداب طہارت و استنجا تک کی چھوٹی چھوٹی باتیں لوگوں کو بتائیں اور عربوں جیسے اکھڑ لوگوں کو تہذیب و شائستگی کا نمونہ بنا دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا لوگوں کو شائستہ اور مہذب بنانے میں جو حصہ رہا ہے اس کی داد ایرانی سپہ سالار رستم نے ان لفظوں میں دی تھی کہ:

اکل عمر کبدی، یعلم الکلاب الآداب!
عمر میرا کلیجہ کھا گیا کہ اس نے وحشیوں کو تہذیب و آداب کا نمونہ بنا دیا!

انہی حضرت عمرؓ کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص کو زمزم پر کشاکش کرتے دیکھ لیا تو وہیں اس کو تنبیہ فرمائی۔ کاش! ہمارے حکمران، ہمارے قائدین اور ہمارے علماء اپنی اس ذمہ داری

کا احساس کریں، عام اس سے کہ وہ حجاز، شام، مصر، عراق، ترکی، ایران اور افغانستان کے ہوں یا پاکستان کے۔

جنگ و جدال

حج کے سلسلہ کی ایک بہت بڑی آفت جنگ و جدال بھی ہے۔ کچھ تو یہ سفر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں ہجوم اور اژدحام کے سبب سے ایک کا مفاد دوسرے کے مفاد سے قدم قدم پر ٹکراتا ہے، کچھ ملک کی گرم آب و ہوا کا لوگوں کے مزاجوں، خاص طور پر باہر سے آنے والوں کے مزاجوں پر، اثر پڑتا ہے اور سب سے زیادہ دخل اس میں شیطان کی وسوسہ اندازیوں اور فتنہ انگیزیوں کا ہوتا ہے' کیونکہ عرفات کا دن شیطان کی سب سے زیادہ ذلت و رسوائی کا دن ہے۔ اس وجہ سے اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ آدمی کے اس سفر کے دوران میں اس کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھلائے اور اپنی کامیابی اور سرخروئی کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرے۔ چنانچہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس سفر میں لوگ جدال کے فتنے میں بہت مبتلا ہوتے ہیں۔ صرف گاڑیوں اور بسوں میں سوار ہوتے وقت ہی نہیں بلکہ حرم میں، طواف میں، حجر اسود پر، زمزم پر، ہر جگہ اس فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ مجھے نہایت افسوس اور صدمے کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ میں نے عین بیت اللہ کے دروازے کے اندر اور روضۂ نبوی کی جالیوں کے سامنے لوگوں کو لڑتے جھگڑتے اور چیختے چلاتے دیکھا ہے۔

اس آفت کا عام علاج تو اوپر بیان ہو چکا ہے لیکن ایک خاص چیز جو ہر عازم حج کو ہر قدم پر پیش نظر رکھنی چاہیے اور جو اس فتنے سے محفوظ رکھنے میں بہت زیادہ مددگار ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی جس وقت اس سفر کے لیے گھر سے قدم نکالے، اسی وقت سے دل میں یہ ٹھان لے کہ اس سفر کا اصلی مزاج ترک دنیا اور درویشی ہے' اپنی شان اور اپنے وقار و احترام کا خیال بالکل دل سے نکال دے۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلے کہ اس راہ میں اس کو جو ذلت اور تکلیف بھی پیش آئے گی، وہ اس کے گناہوں کے لیے کفارہ بنے گی۔ اپنے لیے آرام حاصل کرنے کی کوشش کے بجائے حتی الامکان دوسروں کو آرام پہنچانے کی فکر کرے۔ ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہے

اور شیطان کے فتنوں سے خدا کی پناہ مانگتا رہے۔ جن مواقع پر اس کو تصادم اور جنگ وجدال کا اندیشہ ہو ان سے حتی الامکان دور رہے۔ یہاں تک کہ اگر اس جنگ وجدال سے بچنے کے لیے اس کو شریعت کے افضل سے محروم ہو کر ادنیٰ پر قناعت کرنی پڑے تو اس ادنیٰ پر قناعت کر لے لیکن شیطان کو اپنے اوپر قابو پانے کی راہ نہ دے۔

فسادِنیت

فسادنیت کا فتنہ جس طرح ہر کام کے ساتھ لگا ہوا ہے اسی طرح بلکہ دوسرے کاموں کی نسبت سے کہیں زیادہ وہ اس عبادت کے ساتھ لگا ہوا ہے اور یہ چیز ایسی ہے کہ اس کی چھوت جہاں بھی پائی گئی یہ آدمی کی ساری عبادت کو چوپٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔

عام طور پر فسادنیت سے متعلق لوگوں کے سامنے صرف یہ چیز ہے کہ آدمی حج کے لیے اس ارادے سے نکلے کہ لوگ اس کو حاجی کہیں یا یہ کہ لوگ اس پر اس پہلو سے نکتہ چینی نہ کریں کہ اس نے مالدار ہو کر یا ایک لیڈر اور مذہبی پیشوا ہوتے ہوئے حج کا فریضہ ادا نہیں کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر کوئی شخص محض اس طرح کے محرکات کے تحت حج کے لیے نکلے تو اس کا یہ نکلنا حج کے لیے نہیں ہوگا بلکہ جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لکل امرئ مانوی اس کا حج اسی مقصد کے لیے ہوگا جس مقصد کے لیے وہ گھر سے نکلا ہے۔ لیکن اس زمانے میں چونکہ کسی شخص کا حاجی ہونا لوگوں کی نگاہوں میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا' اس وجہ سے اس محرک کی بھی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہی۔ اس زمانہ میں بعض دوسری چیزیں اس سے زیادہ قابل لحاظ ہیں، مثلاً یہ کہ:

بہت سے لوگ جس طرح درگاہوں اور مزاروں پر مختلف قسم کی منتیں اور مرادیں مانگنے کے لیے جاتے ہیں' اسی طرح کے اغراض کے ساتھ حج کے لیے بھی جاتے ہیں — کسی کو اولاد کی تمنا ہے، کسی کو جائداد کی تمنا ہے، کسی کو کسی پر فتح پانے کی آرزو ہے، کسی کو کسی خاص رشتے کی تمنا ہے، بالخصوص عورتوں کے طبقہ میں تو ایک بڑی تعداد ایسی ہی خواتین کی ہوتی ہے جن کے لیے بیت اللہ اور مسجد نبوی کی اگر کوئی اہمیت ہے تو اسی پہلو سے ہے کہ وہاں وہ اپنی مخصوص قسم کی مرادیں پوری ہونے کی توقع رکھتی ہیں۔

اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ یہ مقدس مقامات ہر قسم کی جائز دعا کے لیے نہایت بابرکت مقامات ہیں۔ لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ کوئی شخص اسی طرح کی مرادیں دل میں لے کر حج کے لیے جائے اور اس بات میں کہ ایک شخص نکلے تو حج کے مقصد سے لیکن وہاں وہ اخروی بھلائیوں کے ساتھ ساتھ اپنے جائز دنیوی اغراض کے لیے بھی دعائیں کرے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ جو لوگ حج کے لیے محض اپنے مخصوص قسم کے دنیوی مقاصد ہی کے لیے نکلتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے حج کی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ اس زمانے میں حج محض کاروباری مقصد کے لیے کرتے ہیں۔ حجاز میں چونکہ باہر سے آنے والی چیزوں پر ڈیوٹی نہیں ہے اس وجہ سے بہت سی چیزیں، بالخصوص تمدنی چیزیں، ہمارے بازاروں کی نسبت سے وہاں کے بازاروں میں بہت سستی ملتی ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو حجاز کا سفر تو فی الحقیقت وہاں کی اس ارزانی سے نفع کمانے کے لیے کرتے ہیں لیکن اس کے لیے حج کو ایک بہانہ بناتے ہیں۔ جن لوگوں کے پیش نظر اس طرح کا مقصد ہو وہ اس زمانے میں جبکہ زرمبادلہ، کسٹم اور سمگلنگ کی روک تھام کے قوانین کی گوناگوں پابندیاں ہیں' اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ خدا کے بہت سے قوانین کی بھی نافرمانیاں کریں اور اپنی حکومت اور حجاز کی حکومت کے بہت سے قوانین کو بھی توڑیں۔ علاوہ ازیں اس طرح کے لوگ اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کے لیے بہت سے دوسرے حاجیوں کو بھی استعمال کرتے ہیں اور اس طرح ان کے فتنہ کا دائرہ صرف انہی تک یا ان کے ایجنٹوں تک ہی محدود نہیں رہ جاتا بلکہ وہ اپنی ہوشیاری سے بہت سے دوسرے بے گناہ لوگوں کو بھی اپنے دام میں پھنسا لیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے اغراض کے تحت حج کے لیے نکلتے ہیں ان کا حج، حج نہیں بلکہ محض ایک تجارت بن کے رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ سفر حج کے دوران میں آدمی کوئی تجارت کر سکتا ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید نے اس بات کی اجازت دی ہے لیکن آسمان و زمین کا فرق ہے اس تجارت میں جس کی قرآن نے اجازت دی ہے اور اس سمگلنگ میں جس کے لیے بہت سے لوگوں نے حج کو ایک بہانہ بنا لیا ہے۔

اسی سے ملتا جلتا فتنہ حج بدل کا فتنہ بھی ہے۔ بہت سے لوگوں نے حج بدل کو بھی ایک کاروبار بنا رکھا ہے۔ جو اہل ثروت خود سفر حج کی مشقت نہیں اٹھانا چاہتے اور دینداری کے تقاضے کے تحت حج کے ثواب کے بھی متمنی ہیں وہ کسی دوسرے شخص کو حج کے مصارف دے کر اپنے قائم مقام کی حیثیت سے بھیج دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ بھی کرتے ہیں کہ اپنے عزیزوں کی طرف سے روپے لے جاتے ہیں اور مکہ معظمہ میں وہ کسی معلم کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ وہ یا تو خود ان کے قائم مقام کی حیثیت سے حج کر دے یا اپنے کسی آدمی سے کرا دے اور عرفات کے دن وہ ان میں سے ہر ایک کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ احرام جو انہوں نے باندھ رکھا ہے انہی کے عزیز کی طرف سے ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ شریعت میں بعض حالات میں حج بدل کی اجازت ہے لیکن وہ حج بدل بالکل مختلف چیز ہے اس کاروبار سے جو آج کل حج بدل کے نام سے ہو رہا ہے۔

شعائر کی حقیقت سے بے خبری

حج کے سلسلے کی ایک بہت بڑی آفت یہ بھی ہے کہ عام طور پر لوگوں کو حج کے شعائر اور مناسک کی روح اور حقیقت سے بالکل بے خبری ہے۔ بس لوگ عقیدت کے جذبے کے ساتھ جاتے ہیں اور معلم حضرات ان سے جو رسوم ادا کرا دیتے ہیں، آنکھ بند کر کے ان کو ادا کر کے چلے آتے ہیں۔ نہ حج اور عمرہ کا فرق معلوم، نہ طواف کی حقیقت کا پتا، نہ حجر اسود کو بوسہ دینے کا مدعا کسی پر واضح، نہ یہ معلوم کہ سعی کیوں کی جاتی ہے، قربانی کی اصلی روح کیا ہے، رمی جمرات سے ہمارے اندر کس روح کو زندہ اور بیدار رکھنا مقصود ہے، اجتماع عرفات کی کیا حقیقت ہے! الغرض جتنے بھی شعائر ہیں، عام طور پر لوگ ان کو محض رسوم کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ نہ ان کی معنویت کا کسی کو کچھ پتا ہوتا ہے، نہ اس چیز سے لوگوں کو آگاہ کرنے کا کوئی معقول انتظام و اہتمام ہے اور نہ بظاہر اس چیز کے لیے لوگوں کے اندر کوئی طلب ہی پائی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جو عبادت محض رسم کی خانہ پری بن کر رہ جائے گی، وہ روحوں اور دلوں پر کیا اثر انداز ہو سکتی ہے؟ اسی وجہ سے حج کا حقیقی فائدہ بہت کم لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارے اہل علم کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن مجید اور احادیث میں حج کے شعائر کے لیے شعائر کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے تو یہ لفظ ہی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ ان شعائر سے مقصود اصلی وہ معانی اور حقائق ہیں جو ان شعائر کے ذریعے سے ہمیں سمجھائے گئے ہیں۔ شعیرہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی معنوی اور روحانی حقیقت کو محسوس کرانے اور یاد دلانے کے لیے مقرر کی گئی ہو۔ حج کے سلسلہ کی ہر چیز کسی نہ کسی معنوی حقیقت کی ایک محسوس تعبیر ہے، اس وجہ سے اس کی حقیقی برکت اسی صورت میں آدمی کو حاصل ہو سکتی ہے جب کسی شعیرہ کی ادائیگی کے وقت آدمی اس معنویت کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے جو اس کے اندر مضمر ہے۔

افسوس ہے کہ اب تک حجاج کو حج کی حقیقت سمجھانے کے سلسلہ میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ عام طور پر حج پر جو رسائل لکھے گئے ہیں، ان میں بھی مناسک حج کے طریقے اور ان کے احکام بیان کر دیے گئے ہیں کہ طواف کس طرح کرنا چاہیے اور سعی کا کیا طریقہ ہے، ان مناسک کی حکمت اور ان کے فلسفہ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ حرم میں حج سے متعلق جو تقریریں ہوتی ہیں وہ بھی زیادہ تر حج کے ظاہری احکام و آداب ہی سے متعلق ہوتی ہیں، ان احکام کی روح اور ان کی غایت سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ ضرورت ہے کہ اہل علم اس شدید کمی کا احساس کریں اور حج کے اسرار و فلسفہ پر ایسی کتابیں لکھیں جو لوگوں کو حج کے باطن کی طرف متوجہ کر سکیں۔ اس چیز کی ضرورت یوں تو ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن اس زمانے میں اس چیز کی اہمیت خاص طور پر اس وجہ سے بہت بڑھ گئی ہے کہ یہ دور غفلت کا دور ہے۔ موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ لوگ اول تو دین کی طرف مائل ہی بہت کم ہوتے ہیں اور اگر مائل ہوتے ہیں تو قدرتی طور پر ان کے اندر یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دین کے ہر حکم کی علت اور فلسفہ کو سمجھیں۔ دین کے خادموں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں کی اس تشنگی کو دور کرنے کا سامان کریں۔

تزکیهٔ تعلقات

باب ۱۹

ایمان اور اسلام

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی جامع تعبیر ایمان اور اسلام کے دولفظوں سے کی گئی ہے۔ یہ دونوں لفظ اگرچہ عام استعمال میں ایک دوسرے کے قائم مقام کے طور پر بھی آتے ہیں اس لیے کہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں لازم وملزوم ہیں، حقیقی ایمان کے لیے لازم ہے کہ اس کے ساتھ اسلام بھی پایا جائے۔ اسی طرح حقیقی اسلام کے لیے شرط ہے کہ اس کے ساتھ ایمان بھی ہو۔ اگر ایمان موجود نہ ہو اور اسلام کا دعوٰی کیا جائے تو وہ منافقانہ اسلام ہے۔ جس کا حقیقت کی میزان میں کوئی وزن نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر کوئی ایمان کا مدعی ہے، لیکن اسلام سے عاری ہے تو اس کا دعوائے ایمان محض ادّعاء ہے، جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں۔

ایمان اور اسلام لازم وملزوم ہیں

اس اشتراک اور لزوم کے باوجود دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ ایمان کا تعلق اصلاً ان بنیادی عقائد اور اساسی کلیات کے اعتقاد واقرار سے ہے جن سے دین کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں اور اسلام کا اطلاق اصلاً ان عبادات، احکام اور قوانین کی اطاعت اور فرماں برداری پر ہوتا ہے جو ایمان کے مقتضیات کے طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے دیے گئے ہیں۔ اس پہلو سے کہہ سکتے ہیں کہ ایمان کا تعلق عقائد سے اور اسلام کا تعلق اعمال سے ہے۔ لیکن ان کے درمیان

کے درمیان یہ فرق محض علمی دائرہ میں ہے۔ ایک مومن کی زندگی میں یہ دونوں ہی یکساں طور پر موجود ہوتے ہیں۔

ایک عام غلط فہمی کا ازالہ

اس زمانے میں لوگوں کے اندر یہ گمراہی بہت عام ہے کہ وہ نجات کے لیے صرف چند باتوں کو مان لینا کافی سمجھتے ہیں، اعمال واخلاق کو کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ اس پر نجات کو منحصر سمجھیں۔ یہ گمراہی پہلے صرف بعض فرقوں میں محدود تھی لیکن اس زمانہ میں یہ ہماری اکثریت بن گئی ہے، یہاں تک کہ اب اس کے خلاف کچھ کہنا بھی آسان نہیں رہا۔ افسوس ہے کہ یہ بات جتنی ہی عام اور مقبول ہے اتنی ہی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے خلاف ہے۔ قرآن میں اٰمَنُوْا کے ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اس اہتمام والتزام کے ساتھ آتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں اور ہر مومن کے ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس سے اعمال صالحہ وجود پذیر ہوں۔ مثلاً فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ (الانفال۔۸:۲۔۴)

مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھیں۔ جو نماز کا اہتمام کریں اور اس مال میں سے، جو ہم نے ان کو بخشا ہے، خرچ کریں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

قرآن مجید نے ایمان کو ایک ایسے مثمر درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں اور وہ برابر ہر موسم میں ثمرباری کر رہا ہو:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ○ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم۔۱۴:۲۴۔۲۵)

کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرۂ طیبہ کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے۔

آیات میں کَلِمَۃً طَیِّبَۃً سے مراد ظاہر ہے کہ کلمۂ ایمان ہے۔ اس کی تمثیل اللہ تعالیٰ نے ایسے ثمربار درخت سے دی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضا میں خوب پھیلی ہوئی ہوں اور وہ برابر ہر موسم میں، اپنے رب کے فضل سے، ثمرباری کر رہا ہو۔ زمین میں جڑوں کے گہرے اترنے سے مقصود فطرت انسانی کے اندر اس کا رسوخ واستحکام ہے کہ وہ گھورے پر اگے ہوئے پودے کی مانند نہیں ہے جس کی کوئی جڑ نہ ہو، حوادث کا کوئی معمولی سا جھونکا بھی اس کو اکھاڑ پھینکے جیسا کہ کلمۂ کفر کی بابت فرمایا ہے کہ اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (ابراہیم۔۱۴:۲۶) (جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے، اسے ذرا بھی ثبات حاصل نہ ہو)۔ بلکہ وہ ایک تناور درخت کے مانند اتنی پائدار اور گہری جڑیں رکھتا ہے کہ اگر اس پر سے طوفان بھی گزر جائیں جب بھی وہ ذرا متاثر نہ ہو۔ پھر اس کی فیض بخشی اور ثمرباری کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ ٹھونٹھ درخت کے مانند نہیں ہے جس سے نہ کسی کو سایہ حاصل ہو نہ پھل، بلکہ اس کی فضا میں پھیلی ہوئی سایہ دار شاخوں کے سایے میں قافلے آرام کرتے اور ہر موسم میں اس کے پھلوں سے غذا اور آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ ان فیوض وبرکات کی طرف ہے جو ایک صاحب ایمان کے ایمان سے خود اس کی زندگی اور اس کے توسط سے ان لوگوں کی زندگیوں پر مترتب ہوتے ہیں جو اس سے کسی نوعیت سے قرب کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ یہ فیوض وبرکات لازماً علمی اور عملی، دونوں ہی قسم کے ہوتے ہیں جو اس کے ایمان کی شہادت دیتے ہیں اور ان سے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رفعت وسرفرازی حاصل ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (فاطر۔۳۵:۱۰)

اسی کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عمل صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے۔

اس آیت پر تدبر کیجیے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ کلمۂ ایمان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف صعود کی فطری صلاحیت مضمر ہے، لیکن وہ اس کے لیے سہارے کا محتاج ہے جو اس کو

عمل صالح سے حاصل ہوتا ہے۔ گویا اس کی مثال انگور کی بیل ہے، جس کے اندر فضا میں بلند ہونے، پھیلنے اور پھل دینے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن اس کی یہ صلاحیت بروئے کار اس وقت آتی ہے جب اس کو کسی ٹٹی اور چھپر کا سہارا حاصل ہو جائے۔ اگر یہ سہارا نہ حاصل ہو تو وہ اپنی جگہ ہی پر سکڑ کر رہ جاتی اور اس کی تمام صلاحیتیں مرجھا جاتی ہیں۔

اسی وجہ سے حقیقی ایمان کے ثبوت کے لیے ضروری ہوا کہ رسول کی کامل اطاعت یا بالفاظ دیگر کامل اسلام کی عملاً شہادت دی جائے۔ اگر کوئی شخص ایمان کا مدعی ہو اور وہ اپنے عمل سے یہ شہادت نہ فراہم کر سکے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی ذات کی قسم کھا کر اس کے ایمان کی نفی کی ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ جو اپنے اسلام کی شہادت نہ پیش کر سکے اس کے ایمان کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (النساء۔۴:۶۵)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔

اس آیت میں خطاب ان منافقین سے ہے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے تھے لیکن ان کے روابط مدینہ کے آس پاس کے ان یہودی قبائل سے بھی تھے جن کو ابھی مدینہ کی حکومت پوری طرح مستحکم نہ ہونے کے سبب سے اپنے اپنے حدود میں کچھ سیاسی قوت حاصل تھی۔ چنانچہ یہ منافقین اپنے مقدمات آنحضرت ﷺ کی عدالت میں لانے کے بجائے ان کی عدالتوں میں اس توقع سے لے جاتے کہ رشوت اور سفارش کے ذریعہ ان سے اپنے منشاء کے مطابق فیصلہ حاصل کر سکیں۔ ان کی نسبت قسم کھا کر فرمایا کہ ان کا دعوائے ایمان محض لاف زنی ہے اگر ان کا عمل ان کے ایمان کے خلاف ہے۔ ان کے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ یہ رسول کو اپنی زندگی کے معاملات میں حکم مانیں اور بے چون و چرا اس کے فیصلوں کی اطاعت کریں۔ اس اسلام کے بغیر ان کا ایمان معتبر نہیں۔

یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں یوں واضح فرمائی گئی ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝ (الحجرات۔۴۹:۱۵)

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

ایمان اور اسلام جامد نہیں ہیں

ایمان اور اسلام کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ جامد اور غیر نامی نہیں، بلکہ ان میں دم بدم اضافہ ہوتا رہتا ہے اگر ان کی پرورش و پرداخت کی جائے۔ اور یہ مضمحل، بلکہ مردہ اور بے جان ہو جاتے ہیں اگر ان کی دیکھ بھال نہ کی جائے۔ دنیا کی دوسری نامی اور ذی حس چیزوں میں قدرت کا جو قانون جاری ہے وہی قانون ان میں بھی کارفرما ہے۔ ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں برابر افزونی اور برکت ہوتی رہتی ہے جو اس کائنات میں تفکر کرتے اور اس کے اندر اس کے خالق کی شانوں، اس کی قدرتوں، اس کی حکمتوں اور اس کی رحمت و ربوبیت کے عجائب کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو ان قوانین و سنن پر نگاہ رکھتے ہیں جو اس دنیا میں جاری ہیں اور جو ایسے بے لاگ اور اٹل ہیں کہ نہ کبھی ان کے ظہور میں تخلف ہوتا اور نہ وہ کبھی جانبداری برتتے۔ جو اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے رب کے تمام چھوٹے بڑے احکام پر عمل کرتے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا تجربہ کرتے ہیں۔ جو اس کے صبر و شکر کے امتحانوں سے گزر کر ہر امتحان کے بعد ایک نئی زندگی اور نیا عزم و حوصلہ حاصل کرتے ہیں اور خاص طور پر ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں یہ افزونی سب سے زیادہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں برابر تدبر کرتے ہیں اور ان کی زبانوں پر دل کی گہرائیوں سے یہ دعا جاری رہتی ہے کہ:

اللَّهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ، ابْنُ عَبْدِكَ، ابْنُ أَمَتِكَ. نَاصِيَتِي بِيَدِكَ. مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ. عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ. أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ

نَفْسَکَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجَلَاءَ حُزْنِیْ وَذَهَابَ هَمِّیْ! (مسند احمد: ج۱ ص۳۹۱)

اے اللہ! میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا، تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے۔ مجھ پر تیرا حکم جاری ہے۔ میرے بارہ میں تیرا فیصلہ حق ہے۔ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطے سے، جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنے آپ کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا اپنے علم غیب میں جس کو تو نے اپنے لیے مخصوص فرمایا ہے یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینہ کا نور، میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج بنا دے!

ان کے بعد ان لوگوں کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہی جو ان اوصاف سے محروم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنے ایمان و اسلام کو تازہ و شاداب رکھنے کے لیے اس قسم کا کوئی اہتمام نہیں کریں گے، جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا، ان کا ایمان و اسلام دیکھ بھال سے محروم ہونے کے سبب سے جلد فنا ہو جائے گا۔ اس کی مثال اس پودے کی ہے جو اتفاق سے ان کے صحن میں اگ تو پڑا، لیکن نہ تو اس کو کبھی پانی اور کھاد کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی، نہ کبھی اس کی گڑائی ہوئی اور نہ کبھی اس کو ناموافق ہواؤں اور اس کو تباہ کرنے والی بیماریوں سے بچانے کی کوشش کی گئی۔

اس باب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت، جو اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے، وہ یہی ہے کہ وہ ایمان بخشنے کو تو بہتوں کو بخش دیتا ہے، لیکن یہ پروان انھی کے اندر چڑھتا ہے جو اس کی قدر کرتے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ یہ قاعدہ کلیہ ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ. (ابراہیم ۱۴: ۷)

اور (یاد کرو) جب تمہارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم میری نعمت کے شکر گزار رہے تو میں اس میں بڑھوتری بخشوں گا۔

کسی نعمت کی صحیح شکر گزاری یہ ہے کہ اس کی دل سے قدر کی جائے اور اس کا حق صحیح صحیح ادا کیا

جائے۔ اگر اس کا حق ادا نہ کیا جائے تو آدمی نہ صرف اس کے نفع سے محروم ہو جاتا ہے، بلکہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے ارشاد کے بموجب وہ اس کی اصل سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں اللہ تعالیٰ خاص طور پر افزونی بخشتا ہے جو ان شدائد و مصائب کے مقابل میں اپنے ایمان و اسلام پر ثابت قدم رہتے ہیں جو، اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق، اس کے ایمان، اسلام کی آزمائش ہی کے لیے ظہور میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں وہ یوں ہی چھوڑ نہیں دیے جاتے، بلکہ وہ مختلف قسم کے چھوٹے بڑے امتحانوں میں ڈال کر پرکھے جاتے ہیں کہ ان کے دعوے میں کچھ صداقت ہے یا وہ محض زبان کے غازی ہیں۔ اس امتحان میں اگر وہ فیل ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے دفتر سے ان کا نام مومنوں کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنے کا حوصلہ کرتے ہیں تو اس کی طرف سے اس جدوجہد کے لیے بھی قوت ایمانی کا بدرقہ عنایت ہوتا ہے اور امتحان میں کامیابی کے بعد امتحان کے درجہ اور کامیابی کی نوعیت کے اعتبار سے ان کے ایمان میں بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس سنت الٰہی کی طرف ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ (العنکبوت ۲۹: ۲)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟

اس امتحان میں ثابت قدمی دکھانے والوں کی اللہ تعالیٰ جس طرح مدد کرتا ہے اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًی ۝ (الکہف ۱۸: ۱۳)

یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید افزونی عطا فرمائی۔

یہ آیت اصحاب کہف کے ذکر کے سلسلہ میں اس مقام پر آئی ہے جب ان کی قوم نے ان کو یہ دھمکی دی ہے کہ اگر وہ اپنی دعوت توحید سے باز نہ آئے تو لازماً سنگسار کر دیے جائیں گے۔ قوم کے

اس فیصلہ سے مرعوب ہو کر اپنا دین چھوڑنے کے بجائے انہوں نے اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کا عزم بالجزم کیا اور اپنے رب سے دعا کی کہ اے رب! اب آگے کے مراحل میں راہ کھولنے والا تو ہے۔ ان کی اس عزیمت اور اس دعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قوت ایمانی میں اتنا اضافہ کر دیا کہ وہ تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے پوری طرح اہل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی وہ شانیں ان کے لیے ظاہر ہوئیں جن کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یہی جوش ایمان سچے مسلمانوں کے اندر اس وقت ابلتا جب منافقین ان کو یہ ڈراوے سناتے کہ دشمنوں کی تمام قوتیں تمہیں فنا کر دینے کے لیے مجتمع ہو رہی ہیں تو یہ چیز ان کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کے بجائے ان کے ایمان کو اور زیادہ بڑھانے والی بنتی۔ فرمایا ہے:

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا. (آل عمران۔۳:۱۷۳)

(منافقین اہل ایمان کو ڈراتے ہیں کہ) دشمن نے تمہارے لیے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے تو اس سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا۔

اہل ایمان کی یہ خصوصیت قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جب اعداء ان کے ایمان کی راہ میں اڑنگے ڈالتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے قوت خود ان کے ایمان ہی کے سرچشمہ سے ابلتی ہے۔ رکاوٹوں کے مقابل میں اہل ایمان کا عام حال یہ بیان ہوا ہے:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ (التوبۃ۔۹:۱۲۴)

سو جو سچ مچ ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں۔

یعنی منافقین جن باتوں سے ڈرتے اور دوسروں کو ڈراتے ہیں وہی باتیں اہل ایمان کے ایمان اور ان کے عزم و حوصلہ کو بڑھاتی ہیں:

تفاوت است میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

اہل ایمان کے اس کردار کی طرف یہ آیت بھی اشارہ کر رہی ہے:

وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ○ (الاحزاب۔۳۳:۲۲)

(اہل ایمان کہتے ہیں) اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا (وہی باتیں پیش آ رہی ہیں جو پہلے بتا دی گئی تھیں) اور اس چیز نے ان کے ایمان و اطاعت ہی میں اضافہ کیا۔

ایک ضروری تنبیہ

یہاں ایک تنبیہ بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ ایمان کے گھٹنے یا بڑھنے کے قائل نہیں تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ ہمارے اس دعوے کے خلاف پڑتی ہے جو ہم نے اوپر کی سطروں میں پیش کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات کا کوئی خاص محل ہوگا جس کی طرف لوگوں کی نظر نہیں گئی ہے ورنہ ایک جلیل القدر امام ایک ایسی بات کس طرح فرما سکتے ہیں جو بظاہر قرآن و حدیث، دونوں کے خلاف نظر آتی ہے؟

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات کا صحیح محل یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو قانونی اور فقہی ایمان سے متعلق مانیے۔ قانون صرف ظاہر سے بحث کرتا ہے، کسی شے کی حقیقت اور اس کے کیف و کم سے بحث کرنا اس کے مقصد سے خارج بھی ہے اور اس کے دائرۂ امکان سے باہر بھی۔ اس کے نزدیک ہر وہ شخص جو چند معلوم باتوں کا اقرار اور چند معروف رسوم کو ادا کرتا ہے، مومن اور مسلم ہے۔ اس امر سے اس کو کچھ بحث نہیں کہ وہ جن باتوں کا اقرار کرتا ہے ان کو دل سے مانتا اور ان کا یقین بھی رکھتا ہے یا محض زبان سے ان کا اقرار کرتا ہے۔ اسی طرح وہ جن رسوم پر عمل کرتا ہے محض ظاہر دارانہ کرتا ہے یا اس کے اندر کچھ صدق و اخلاص بھی ہوتا ہے۔ یہ سوالات اس کے مقصد سے غیر متعلق بھی ہیں اور ان کی تحقیق کا اس کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ اس کا اصل کام اسلامی سٹیٹ کے شہریوں کے لیے ایک معیار معین کرنا ہے، جس کو سامنے رکھ کر وہ ان کی نزاعات اور ان کے حقوق کا فیصلہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ معیار سب کے لیے یکساں ہوگا اور اس کے تعین میں صرف وہی چیزیں کام دے سکتی ہیں جو بالکل ظاہر ہوں۔ وہ چیزیں اس میں کام دینے والی نہیں بن سکتیں

جن کا تعلق باطنی کیفیات اور حقائق سے ہے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی رائے کا ایک عمدہ محمل مل جائے گا۔ ان کی بات نہ قرآن وحدیث کے خلاف محسوس ہوگی نہ ہمارا مسلک ان کے مسلک سے متصادم ہوگا۔ اس طرح کی بعض اور باتیں بھی امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی ہیں جو بظاہر قرآن وحدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہیں حالانکہ وہ اپنے اصل مقام میں بالکل صحیح ہیں، لیکن لوگوں نے ان کے موقع کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اسلام کے کامل نمونہ

اسلام کے کامل نمونہ کی حیثیت سے قرآن نے سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام کا ذکر کیا ہے، جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ لازماً وہ ایمان کے بھی نمونہ کامل ہیں۔ ہم باب کی تمہید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ایمان اور اسلام، دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ان میں افتراق صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب یہ صرف ظاہراً پائے جاتے ہیں۔ حقیقتاً پائے جانے کی صورت میں ان میں افتراق ممکن نہیں ہے۔

حضرات ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام کے کامل نمونہ، اسلام کی حیثیت سے پیش کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ خاص اسلام کے امتحان میں انہوں نے جو شاندار کامیابی حاصل کی وہ تنہا ان کا حصہ ہے۔ اس آسمان کے نیچے کسی کو اللہ تعالیٰ نے اس امتحان میں نہیں ڈالا، اور خود اللہ تعالیٰ نے تصدیق فرمائی ہے کہ آپ نے سوفی صد کامیابی حاصل کی۔

اسلام کی تعبیر عام طور پر گردن نہادن بطاعت سے کی جاتی ہے۔ یہ تعبیر بالکل مطابق حقیقت ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ اپنے رب کے حکم پر قربان کر دینے کے لیے اپنے کو تیار کر لیا وہ مسلم ہے۔ ایک مسلم کا شعاری کلمہ ہے:

> اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (الانعام۔۶:۱۶۲)
>
> میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام نے اپنی عملی زندگی سے اس کی شہادت دی، اس وجہ سے وہ اسلام کے کامل مظہر قرار پائے۔ وہی ہیں جنہوں نے اپنے لیے مسلم بنائے جانے کے ساتھ ساتھ اپنی ذریت میں بھی ایک امت مسلمہ برپا کرنے کی دعا دی:

> رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ص (البقرۃ۔۲:۱۲۸)
>
> اے ہمارے رب! ہم دونوں کو تو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اس کی قبولیت کے نتیجہ میں سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں خاتم الانبیا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی جو ایک عظیم امت مسلمہ کے داعی اور مؤسس ہوئے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جس امت کا نام امت مسلمہ اپنی دعا میں تجویز کیا تھا جب اس کی بعثت ہوئی تو اس کا نام امت مسلمہ رکھا گیا۔ اس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا:

> هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا. (الحج۔۲۲:۷۸)
>
> اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے، اور اس قرآن میں تمہارا نام مسلم ہے۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل دین، اسلام ہی ہے:

> اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ. (آل عمران۔۳:۱۹)
>
> اللہ کا اصل دین اسلام ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اسی دین پر تھے۔ دوسرے نام، اسلام کے سوا، جو اختراع کیے گئے وہ بدعت کی راہ سے اختراع کیے گئے۔ یہ امت — امت مسلمہ — دنیا میں اس لیے برپا کی گئی کہ اسلام کے نام اور اس کی روح، دونوں کی حامل بنے — اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ!

باب ۲۰

تعلق باللہ اور اس کی اساسات

تعلقات میں سب سے پہلے جو تعلق زیر بحث آتا ہے وہ آدمی کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہے۔ اسی تعلق کے صحیح شعور اور اس کی صحیح معرفت سے آدمی کو دوسرے تعلقات کے صحیح حقوق و فرائض کی شناخت ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارا تعلق ہماری ذات کے ساتھ کن بنیادوں پر قائم ہے۔ خاندان، قبیلہ، قوم، حکومت اور ریاست کے ساتھ ہمارے تعلق کی اساسات کیا ہیں اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہم کن روابط کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ان تمام تعلقات کی بنیادیں اگر واضح ہو کر سامنے آجائیں اور آدمی ہر غلط بندھن کو توڑ دے اور ہر صحیح رشتہ کو استوار کر لے تو وہ اپنے رب کا فرمانبردار بندہ، اپنے خاندان اور کنبے کا ایک لائق فرد، اپنی ریاست کا ایک خیر خواہ و وفادار شہری اور دنیا میں ایک سچا محب انسانیت بن جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو حاصل کر کے در حقیقت ایک انسان ایک صحیح تربیت یافتہ اور ایک پاکیزہ انسان بنتا ہے اور اسی طرح کا تربیت یافتہ اور پاکیزہ انسان بنانا اس تزکیہ کا اصل مقصود ہے جس کی تعلیم حضرات انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ اگر انسان کے ان تعلقات کا کوئی گوشہ بھی ناہموار رہ جائے تو صرف یہی نہیں کہ اس گوشہ میں تزکیہ کی برکت سے محروم رہتا ہے، بلکہ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس کے دوسرے گوشوں میں بھی ناہمواریاں اور خرابیاں موجود ہیں۔

ہماری زندگی کے یہ تمام پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ ان میں

سے ہر ایک کا بناؤ یا بگاڑ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

قرآن مجید کے تدبر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق صحیح طور پر اس صورت میں قائم ہوتا ہے، جب ہم اپنے آپ کو خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت ہمارے دل، ہماری روح اور ہمارے ارادے سے ایک خاص مطالبہ کرتی ہے۔ اگر ہم یہ تمام مطالبے ٹھیک ٹھیک پورے کر دیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اپنے رب کے ساتھ اپنے تعلق کو بالکل صحیح بنیاد پر قائم کر لیا۔ در حقیقت یہی تقاضے ہیں جن کی تفصیلات شریعت میں بیان ہوئی ہیں اور قرآن مجید میں اکثر احکام و ہدایات کے بیان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا جو حوالہ آتا ہے وہ در حقیقت اسی بات کو واضح کرنے کے لیے آتا ہے کہ یہ مطالبہ یا یہ ہدایت خدا کی فلاں صفت کا تقاضا ہے۔ جو شخص شریعت کے احکام و ہدایات پر اس شعور کے ساتھ عمل کرتا ہے کہ فلاں حکم یا فلاں ہدایت کے اندر خدا کی فلاں صفت کا جلوہ ہے وہ شخص در حقیقت شریعت کی اصلی روح کو پہچانتا ہے۔ شریعت کے احکام پر جب وہ عمل کرتا ہے تو اس طرح عمل کرتا ہے کہ گویا وہ اس عمل کے اندر خدا کے جلوہ کو دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو نبی ﷺ نے احسان سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ خدا کی بندگی اور اطاعت اس طرح کرتا ہے کہ گویا بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ بندہ کا خدا کو دیکھنا یہی ہے کہ شریعت کے ہر حکم کے اندر خدا کی صفات کا جو عکس ہے وہ اس کو نظر آتا ہے اور جب وہ عکس اس کو نظر آتا ہے تو وہ صاف یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر خدا کی نگران آنکھیں چھپی ہوئی ہیں جو اسے دیکھ رہی ہیں۔

قرآن مجید کی تلاوت کیجیے تو آپ کو ہر حکم اور ہدایت کے ساتھ خدا کی کسی نہ کسی صفت کا حوالہ ضرور ملے گا۔ کہیں ایک بات فرمائی جائے گی اور اس کے ساتھ یہ آئے گا کہ خدا علیم و خبیر ھے۔ کہیں ایک بات کا حکم دیا جائے گا اور ارشاد ہوگا کہ خدا علیم و حکیم ھے۔ کہیں کسی چیز سے روکا جائے گا اور اس کے ساتھ یہ تنبیہ ہوگی کہ خدا قوی و عزیز ھے۔ اس سے ایک طرف تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام دین و شریعت در حقیقت خدا کی صفات کا مظاہرہ ہے۔ آدمی اگر اپنے آپ کو پوری طرح شریعت کے رنگ میں رنگ لے تو اس نے اپنے آپ کو صبغۃ اللہ میں رنگ لیا۔ اور دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ شریعت کے احکام کی پابندی کا اصلی مزا صرف اس شخص کو

حاصل ہوسکتا ہے جو شریعت کے احکام کے اندر خدا کی صفات جمال وجلال کو دیکھ رہا ہو۔ جو لوگ اس جمال وجلال کے مشاہدے سے محروم رہتے ہیں ان کی دینداری بالکل رسمی اور رواجی دینداری ہوتی ہے۔ اس کے اندر اول تو پائداری نہیں ہوتی اور پائداری ہوتی بھی ہے تو اس کے اندر روح اور زندگی نہیں ہوتی۔

ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ

یہاں ایک غلط فہمی سے آگاہ کر دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بننا اور چیز ہے اور خدا کی صفات کا مظہر بننے کی کوشش کرنا ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ شریعت انسان کا تعلق خدا کے ساتھ جوڑتی ہے۔ اس میں اصلی نصب العین اور مطمح نظر یہ ہے کہ بندہ اپنے ظاہر و باطن، دونوں میں خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بن جائے۔ شریعت میں بندے کے لیے کمال کا سب سے بڑا درجہ یہی ہے جو اکتساب اور جدوجہد سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اگر کمال کا کوئی درجہ ہے تو وہ نبوت کا درجہ ہے۔ لیکن وہ اکتسابی چیز نہیں، بلکہ اللہ ہی نے جس کو چاہا ہے یہ مرتبہ دیا ہے۔

لیکن جوگیوں اور راہبوں کے تصوف میں، بالخصوص اس تصوف میں جس کی بنیاد وحدت الوجود کے نظریہ پر ہے، مطمح نظر خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا نہیں ہے، بلکہ ..ا کی صفات کے مظہر بننے کا ہے۔ اس میں مجاہدہ اور ریاضت کا اصلی مقصود یہ نہیں ہوتا کہ آدمی عبدیت کا کمال درجہ حاصل کرلے، بلکہ سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ آدمی خدا کی صفات کا اس طرح مظہر بن جائے کہ قطرہ دریا میں ضم ہو جائے اور دوئی اور تفرقہ کے سارے نشانات مٹ جائیں:

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

ظاہر ہے کہ یہ مطمح نظر شریعت کے مطمح نظر سے ایک بالکل مختلف مطمح نظر ہے۔ شریعت آدمی کو بـــنـــدہ بنانا چاہتی ہے اور اس کا تزکیہ کا سارا جہاد اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ برعکس اس کے

جوگیانہ تصوف میں آدمی اپنے آپ کو اللہ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی ساری ریاضت میں یہی غلط نقطۂ نظر کارفرما ہوتا ہے۔ اگر خدا کی شان تجرد ہے تو اس راہ پر چلنے والے اپنے اندر تجرد کی شان پیدا کرنا چاہیں گے۔ اگر خدا بے نیاز ہے تو یہ حضرات بھی بے نیاز بننے کی کوشش کریں گے۔ اگر خدا مصرف ہے تو یہ بھی مصرف ارواح وقلوب بننے کے لیے زور لگائیں گے۔ اگر خدا علیم وخبیر ہے تو یہ بھی غیب کے پردوں میں جھانکنے کے لیے طرح طرح کے چلے اور مراقبے کریں گے۔ اگر خدا شافی مطلق ہے تو یہ بھی چاہیں گے کہ ان کے ہاتھ لگانے اور ان کے چھو منتر سے بھی مریض شفا پائیں اور مردے جی اٹھیں۔ اگر خدا آگ اور پانی پر حکمران ہے تو یہ بھی پانی پر چلنا اور آگ سے کھیلنا چاہیں گے۔ یہاں تک کہ اس راہ پر چلنے والے لوگ اگر شریعت کی پابندیوں کو قبول بھی کرتے ہیں تو اپنے مذکورہ بالا مطمح نظر ہی کی خدمت کے نقطۂ نظر سے قبول کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ پابندیاں اس مطمح نظر تک پہنچنے کے لیے ایک زینے اور سہارے کا کام دیتی ہیں۔ بالآخر ان کے ہاں ایک وہ منزل بھی آتی ہے جہاں یہ ساری چیزیں بند حسن اور حجاب کے حکم میں داخل ہو جاتی ہیں اور حصول کمال مطلق کی راہ میں سبک روی کے لیے ان ساری پابندیوں سے آزاد ہو جانا ان کے ہاں ضروری ہو جاتا ہے۔

اسلام نے تعلق باللہ کے اس نقطۂ نظر کو بالکل غلط قرار دیا ہے۔ اس نے تعلق باللہ میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، جس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو صفات الٰہی کے تقاضوں کے مطابق بنائے۔ مثلاً یہ کہ خدا منعم ہے تو بندہ کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کا شکرگزار بندہ بنے۔ خدا خالق ہے تو چاہیے کہ بندہ اسی کے امر وحکم کی اطاعت کرے۔ خدا سمیع وعلیم ہے تو بندہ اسی سے مانگے اور اسی پر بھروسا کرے۔ خدا قدوس ہے تو بندہ کو چاہیے کہ اپنے ظاہر وباطن، دونوں کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ بنائے۔ خدا عادل وطاقتور ہے تو چاہیے کہ وہ ہر لحہ اس سے ڈرتا رہے اور ظلم وناانصافی کی ہر بات سے پرہیز کرے۔ غرض خدا کی ہر صفت بندے کو گوناگوں ذمہ داریوں اور بے شمار حقوق وفرائض کے بندھنوں میں باندھتی ہے اور بندہ خدا کی صفات اور ان کے عائد کردہ حقوق وفرائض کے علم وعمل کی راہ میں جتنا ہی بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی خدا سے اس کا قرب بھی بڑھتا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے اس کی ذمہ داریاں بھی مشکل

سے مشکل تر اور نازک تر ہوتی جاتی ہیں۔

اصل بحث سے پہلے یہاں یہ تنبیہ ہم نے اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ جوگیانہ تصوف کے بعض غلط اثرات اس تصوف میں بھی گھس آئے ہیں جس کو مسلمانوں نے اختیار کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض ذہنوں میں وہ غلط فہمی موجود ہو تو آدمی پر تزکیہ کے اس نظام کی اصلی قدر و قیمت واضح نہیں ہو سکتی جس کی طرف کتاب وسنت میں رہنمائی کی گئی ہے اور جس کے اصول ومبادی ہم واضح کرنا چاہتے ہیں۔

تصوف پر ہمارے متقدمین نے جو کتابیں تصنیف فرمائی ہیں ان میں سے بعض کتابوں کی قدر و قیمت کے ہم بہت قائل ہیں۔ لیکن ان کتابوں اور ان کے لائق احترام مصنفین کے واجبی احترام کے باوجود دیانتداری کے ساتھ ہماری رائے یہ ہے کہ ان میں مقامات کی جو تشریح کی گئی ہے اس میں اکثر جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بات کتاب وسنت کی حدود سے آگے نکل گئی ہے۔ ایک چیز کا جو اعلیٰ معیار وہ پیش کرتے ہیں اگر کتاب وسنت کی کسوٹی پر اس کو پرکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ مقام کتاب وسنت کے مقام سے ایک مافوق مقام ہے۔ یہاں تک کہ اگر اصلی معیار اس کو مان لیجیے تو صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس معیار پر شاید ہی پورے اتر سکیں! اس چیز کا اثر طبیعت پر یا تو مایوسی کی شکل میں پڑتا ہے، آدمی یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ باتیں ہمارے دائرۂ جدوجہد سے باہر ہیں یا پھر کتاب وسنت سے اس کو یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ ان میں جو معیار پیش کیا گیا ہے، وہ صرف عام معیار ہے، عبدیت وانابت وغیرہ کا حقیقی معیار وہ ہے جو اہل تصوف پیش کرتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ہم ان اساسات کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا کہ ہمارا تعلق اس کے ساتھ قائم ہو اور جن پر ہم اپنا تعلق اس کے ساتھ قائم کر کے اپنے آپ کو اس کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنا سکتے ہیں۔

باب ۲۱

شکر

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کی سب سے پہلی بنیاد شکر ہے۔ شکر کا تعلق دل سے بھی ہے، زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی ہے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں، اس کے بے نہایت احسانات اور اس کے ان گنت انعامات کے احساس واعتراف کے جذبے سے اس طرح لبریز رہے جس طرح ایک دودھیل بکری کا تھن دودھ سے لبریز رہتا ہے۔ یہ تمثیل ہم نے محض تمثیل کے مقصد سے نہیں اختیار کی ہے، بلکہ لفظ شکر کی لغوی حقیقت بھی کچھ اس سے ملتی جلتی ہے۔ دل جب اللہ تعالیٰ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز رہتا ہے تو جس طرح ذرا سی حرکت سے ایک لبریز ساغر چھلک جایا کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہر چھوٹی یا بڑی نعمت کی یاد اور اس کے مشاہدے سے بندے کی زبان سے شکر کا کوئی کلمہ چھلک پڑتا ہے۔

جس شخص کا دل اس طرح خدا کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز رہے اس کا اثر لازمی طور پر اس کے اعمال پر بھی پڑتا ہے۔ اس کو ہر وہ عمل دل سے محبوب ہو جاتا ہے جس سے اس جذبے کو تسکین حاصل ہو سکے، اور اسی کے برابر اس کو ہر اس عمل سے نفرت ہو جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی کسی ظاہری یا باطنی نعمت کی ناقدری ہو رہی ہو۔ کسی نعمت کی قدر کا حقیقی احساس اگر آدمی کے اندر موجود ہو تو وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس نعمت کو اپنے حقیقی منعم ہی کے منشاء کے خلاف استعمال کرے۔ اگر ایک کرم فرما ہمیں ایک ٹارچ عنایت کرے کہ ہم اس کی مدد سے

اندھیرے کی ٹھوکروں سے بچ سکیں، ایک تلوار عنایت کرے کہ دشمن کے خطرات کی مدافعت کر سکیں، ایک سواری عنایت کرے کہ پیدل چلنے کی مشقت سے بچ سکیں تو کوئی انتہائی درجے کا کمینہ اور لئیم ہی ہوگا جو ان سارے اسباب و وسائل کو اسی کرم فرما کے گھر پر حملہ اور اسی کے زن و فرزند کو قتل کرنے میں استعمال کرے جس نے یہ اسباب و اسلحہ اس کو عنایت فرمائے! اسی طرح جس بندے کے اندر ان نعمتوں کا سچا احساس ہوتا ہے، جو خدا نے اس کو عنایت کی ہیں، وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ ان نعمتوں کو وہ شیطان کی مقصد برآری میں صرف کرے۔ اسی عنایت کی طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اس خط میں اشارہ فرمایا ہے، جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ 'جس شخص پر انعام ہوا ہو اس کے اوپر کم سے کم جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس انعام کو اسی کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنائے جس نے وہ انعام اس پر کیا ہے۔'

اس شکر کے جذبے کو صحیح طور پر بیدار رکھنے کے لیے چند باتیں نہایت ضروری ہیں:

پہلی چیز تو یہ ہے کہ آدمی کو اس کے ظاہر اور باطن میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ملی ہوئی ہیں ان کو برابر نگاہ میں رکھنے کی کوشش کرے۔ انسان کے اندر یہ بڑی کمزوری ہے کہ اگر وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو وہ تو اس کے ذہن پر چوبیس گھنٹے مسلط رہتی ہے اور ہر کسی سے اس کا ذکر کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں جو اس کو ہر وقت حاصل ہیں ان سے وہ اس طرح غافل و بے پروا رہتا ہے گویا ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اگر آدمی کو نعمتوں کے نعمت ہونے اور نعمتوں سے بہرہ یاب ہونے کا کوئی احساس ہی نہ ہو تو وہ منعم کی قدر کیا کرے گا اور اس کے لیے اس کے اندر شکر و سپاس کا جذبہ کیا ہوگا؟ اس غفلت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی روزانہ کوئی نہ کوئی وقت تھوڑا سا ایسا ضرور نکالے جس میں ان نعمتوں پر غور کرے جو اس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے ظاہر و باطن دونوں میں بخشی ہیں، بلکہ ان کے مظاہر اس کائنات کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تنہائی میں کبھی کبھی غور کرتے کرتے وہ اس پہلو سے بھی سوچے کہ بالفرض یہ نعمتیں اس کو نہ حاصل ہوتیں تو کیا ہوتا؟ یہ آنکھ جس سے وہ دیکھتا ہے اس سے وہ محروم ہوتا، یہ کان جن سے وہ سنتا ہے یہ بہرے ہوتے، یہ ہاتھ جن سے وہ زور آزمائی کرتا ہے شل ہوتے، یہ پاؤں جن

سے وہ چلتا ہے مفلوج ہوتے تو اس کا حشر کیا ہوتا؟ اور پھر سب سے زیادہ اس بات پر دھیان کرے کہ یہ دماغ جس کی کارفرمائیوں پر وہ سب سے زیادہ نازاں ہے — خدانخواستہ — یہ ماؤف ہوتا تو اس کی گت کیا بنتی؟

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آدمی اس امر پر بھی ساتھ ہی ساتھ غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں ہمیں بخشی ہیں بلا کسی استحقاق کے بخشی ہیں۔ نہ ہمارا خدا پر کوئی حق قائم تھا نہ ہم نے کسی نعمت کا اس کو معاوضہ ادا کیا ہے اور نہ کسی نعمت کا معاوضہ ادا کر سکتے ہیں۔ پھر وہ جب چاہے اپنی ہر نعمت کو ہم سے چھین سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ آج آپ کو تخت شاہی کی عظمتیں حاصل ہیں، کل وہ آپ کے ہاتھ میں کاسہ گدائی پکڑا دے تو آپ اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ اس وجہ سے کبھی بھی ذلت و مصیبت میں پڑے ہوئے آدمی کو نظر انداز کرتے ہوئے گزر جانے کی کوشش نہ کیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسی حالت میں مبتلا کر دیتا یا آئندہ کر دے تو آپ کو اس چیز سے کون بچا سکے گا؟ دنیا میں مصیبت زدہ اور مفلوک سے مفلوک آدمی جو آپ نے دیکھا ہو، یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ ٹھیک اسی کی جگہ پر آپ کو کھڑا کر سکتا تھا اور اس کو آپ کی جگہ دے سکتا تھا، لیکن یہ اس کا فضل و احسان ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ آپ کو اس سے نہایت بہتر حالت میں رکھا۔

تیسری ضروری بات اپنے اندر شکر گزاری کا جذبہ بیدار رکھنے کے لیے یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ انہی لوگوں کو دیکھنے کی کوشش نہ کرے جو اپنے اسباب و وسائل اور اپنے حالات و ذرائع کے اعتبار سے اس سے بہتر حالت میں ہوں، بلکہ ان لوگوں کو بھی سامنے رکھ کر اپنا موازنہ کرتا رہے جو ہر پہلو سے اس سے فروتر زندگی رکھتے ہیں۔ جو آدمی ہمیشہ اپنے سے بہتر حالات رکھنے والوں ہی پر نگاہ رکھتا ہے وہ ہمیشہ اپنی تقدیر سے شاکی اور اپنے رب سے بدگمان رہتا ہے۔ اس کے دل کو سچی خوشی کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اس کو بہتر سے بہتر حالات بھی میسر آ جائیں جب بھی اس کا دل آسودہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ درجہ تو اس کو بہرحال حاصل ہونے سے رہا کہ اس آسمان کے نیچے کوئی شخص کسی اعتبار سے بھی اس سے بہتر حالت میں نہ رہے۔ اس وجہ سے خدا کی شکر گزاری کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ آدمی ان لوگوں کے حالات پر نگاہ ڈالے جو اسی خدا کے بندے ہیں جس کا بندہ وہ ہے، لیکن ان لوگوں کو ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی حاصل نہیں ہے جو اس کو

بڑی وسعت کے ساتھ حاصل ہیں۔

حضرت سعدیؒ کی ایک حکایت اس حقیقت کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی سیر و سیاحت کے سلسلے میں وہ دمشق یا کسی اور شہر میں جب پہنچے تو ان کی جوتی پھٹ چکی تھی اور ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ نئی جوتی خرید سکیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی اس غربت کے سبب سے میں دل میں نہایت ملول تھا اور بار بار یہ خیال ذہن میں پیدا ہو رہا تھا کہ اس فضل و کمال کے باوجود خدا نے مجھے اس حال میں رکھا ہے کہ میرے پاؤں میں جوتی بھی نہیں ہے؟ فرماتے ہیں کہ میں اسی دل گرفتگی کے ساتھ شہر کی مسجد میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچا تو میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس کے سرے سے پاؤں ہی نہیں تھے۔ اس کو دیکھتے ہی میں دفعۃً اپنے رب کے آگے سجدے میں گر پڑا کہ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے جوتی نہیں تو پاؤں تو دیے ہیں، یہ بے چارہ تو سرے سے پاؤں ہی سے محروم ہے۔

حضرت سعدیؒ نے اپنی اس سرگزشت میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات سمجھا دی ہے کہ خدا کا شکر گزار بندہ بننے کے لیے دنیا کو کس نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ دنیا کو سعدیؒ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کو قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں ملتی رہتی ہیں جو ان کو خدا کے شکر پر ابھارتی رہتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ کتنوں کے پاس پاؤں ہی نہیں ہیں، اپنی اس محرومی پر خدا سے شاکی رہتے ہیں کہ ان کے پاس کار نہیں ہے، وہ کبھی بھی خدا کی شکر گزاری کی توفیق نہیں پاتے۔

باب ۲۲

عبادت

خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد عبادت ہے۔ بندے کے اندر جب اپنے منعم حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ پیدا ہوا تو یہ جذبہ قدرتی طور پر منعم کے لیے اظہار احسان مندی، اظہار نیاز مندی اور اظہار تذلل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کی فطرت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اپنے منعم و محسن کے لیے، اس کی طرف سے آپ سے آپ، یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ انسان تو انسان حیوانات تک کی جبلت کا بھی یہی حال ہے۔ کتے، بلی، گھوڑے، گدھے، جس کی بھی آپ پرورش کیجیے اور جس پر بھی کوئی احسان کیجیے، ناممکن ہے کہ وہ آپ کو دیکھیں اور آپ کے سامنے اپنی نیاز مندی اور اپنی ممنونیت کا اظہار نہ کریں۔ یہ ممنونیت ان کی آواز، ان کی حرکات اور ان کی صورت و ہیئت، ہر چیز سے ظاہر ہوتی ہے۔

یہ چیز انسان کی فطرت کے اندر حیوانات کی جبلت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں ہے اور زیادہ نمایاں ہونی چاہیے بھی۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ جس کا بھی ہم پر کسی طرح کا کوئی احسان ہوتا ہے ہم اس کے احسان پر اپنی ممنونیت کا اظہار اپنی زبان سے بھی کرتے ہیں اور اپنی صورت و ہیئت سے بھی۔ جو لوگ محسن کے احسان کا یہ حق ادا نہیں کرتے وہ ہمارے اندر کمینے اور ناحسان شناس سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارا یہ رویہ اپنے عام محسنوں کے ساتھ ہوتا ہے یا ہونا چاہیے اور یہی رویہ فطرت انسانی کا حقیقی تقاضا ہے۔ پھر اسی سے اندازہ کیجیے کہ اس ذات کے انعامات و احسانات کے

مقابل میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے جو نہ صرف تمام انعامات و احسانات ہی کا منبع ہے، بلکہ خود ہمارے وجود کا سرچشمہ بھی ہے اور جس کے انعامات و احسانات عارضی اور وقتی نہیں ہیں، بلکہ دائمی اور ابدی ہیں؟ ظاہر ہے کہ اپنے حقیقی محسن و مربی کے لیے بندہ اپنی کامل نیازمندی اور کامل بندگی کا اظہار کرنا چاہے گا۔ اگر اس نے اپنی فطرت میں کوئی خرابی نہیں پیدا کرلی ہے تو یہ چیز عین اس کی فطرت کا مطالبہ ہے، جس کو پورا کیے بغیر وہ دل کا اطمینان اور روح کا سکون حاصل ہی نہیں کرسکے گا۔ اگر کسی کے اندر یہ چیز ظاہر نہ ہورہی ہو تو غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے دل کے اوپر یا تو غفلت کا حجاب ہے یا حماقت کا۔ غفلت کی حقیقت تو اس سلسلہ، مباحث میں مختلف مواقع پر ظاہر کی جاچکی، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، رہی حماقت تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان اسباب و وسائط ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں جو ان کے حقیقی منعم کے درمیان حائل ہوتے ہیں۔ حقیقی منعم کا یا تو ان کو کوئی خیال ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بالکل ضمنی اور محض سرسری طور پر۔

اسی اظہار ممنونیت و نیازمندی اور اسی اظہار تذلل کو عبادت کہتے ہیں۔ یہ اظہار زبان، حرکات اور صورت و ہیئت ہر چیز سے ہوتا ہے۔ جب تک ہر چیز سے یہ اظہار نہ ہو اس کی اصلی حقیقت وجود پذیر نہیں ہوسکتی۔ اس وجہ سے آدمی کی عبادت کی تکمیل میں اس کی ہر چیز کسی نہ کسی نوعیت سے شریک ہوتی ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کے جتنے بھی اعضاء و جوارح ہیں سب اس میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس کے اندر جتنی بھی عقلی و روحانی قابلیتیں ہیں سب اس میں اپنا نذرانہ پیش کرتی ہیں، بلکہ اس کی حقیقی تکمیل ہوتی ہی اس وقت ہے جب آدمی اپنے ان وسائل و ذرائع کو بھی اس کام میں شریک کرے جن سے وہ اس دنیا میں اپنی ضروریات، اپنی خواہشوں اور منصوبوں کی تکمیل کرتا ہے۔

یہ بات کچھ زیادہ دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت اس جذبہ شکر گزاری کا مظہر ہے جو اپنے منعم حقیقی کے لیے بندے کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ واضح ثبوت سورہ فاتحہ ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے شکر کی سورہ ہے اور اس کو اسلام کی سب سے بڑی عبادت — نماز — کی خاص سورہ قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں فاتحہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا

ہے کہ بندے پر خدا کی ربوبیت اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی شانوں کے مشاہدے سے شکر گزاری کا جو جذبہ طاری ہوتا ہے اس کا پہلا تقاضا جو اس کی زندگی میں نمایاں ہوتا ہے وہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں) کا اقرار ہے۔

قرآن مجید کے دوسرے مواقع سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت خدا کی شکر گزاری ہی کی عملی صورت ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

بَلِ اللّٰہَ فَاعْبُدْ وَکُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ ۝ (الزمر۔۳۹:۶۶)

بلکہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرو اور اسی کے شکر گزاروں میں سے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ ط (العنکبوت۔۲۹:۱۷)

اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کے شکر گزار ہو۔

نبی ﷺ کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ آپؐ رات میں نمازوں میں اتنی اتنی دیر تک قیام فرماتے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے۔ ایک روایت ملاحظہ ہو:

قالت عائشۃ: یا رسول اللہ! اتصنع ھذا وقد غفر لک ماتقدم من ذنبک وما تاخر؟ فقال: یا عائشۃ! افلا اکون عبدا شکورا؟

(صحیح مسلم: کتاب صفات المنافقین واحکامھم باب ۱۸)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا: یارسول اللہ! جب آپؐ کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ بخشے جاچکے ہیں تو آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ عائشہ! کیا میں یہ بات نہ چاہوں کہ خدا کا شکر گزار بندہ ہوں؟

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ عبادات میں اصل محرک خدا کی شکر گزاری کا احساس اور جذبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر ہمیں اپنی عبادات کا حکم دیا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کو یہ بات پسند آئی کہ وہ ہمیں کسی مشقت اور زحمت میں مبتلا کرے، بلکہ اس نے یہ پسند فرمایا کہ ہمارے جذبہ شکر گزاری کے اظہار کے لیے ایسی شکلیں معین فرمادے جو اس کی نگاہوں میں پسندیدہ

اور ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ نافع اور موجب خیر و برکت ہیں۔

عبادت کی اس روح کے لحاظ سے حقیقی عبادت وہی ہے جو خدا کی شکر گزاری کے سچے جذبے کے ساتھ ادا کی جائے۔ اگر کوئی عبادت اس جذبے سے خالی ہو، آدمی اس کو ایک بار اور ایک مصیبت سمجھ کر کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرے، تو یہ عبادت وہ عبادت نہیں جو خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل کرے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بندہ خدا کی عبادت کر کے درحقیقت وہ سب سے بڑا حق ادا کرتا ہے جو اس کے خالق و مالک اور منعم و محسن پروردگار کا اس کے اوپر عائد ہوتا ہے اور یہ حق وہ اس لیے ادا نہیں کرتا کہ اس میں اس کے خالق و مالک کا کوئی نفع ہے، بلکہ محض اس لیے ادا کرتا ہے کہ اس میں خود اس کا اپنا سراسر نفع ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو ان انعامات کا مزید سزاوار بناتا ہے جو اس کو اس کے رب کی جانب سے بلا کسی استحقاق کے حاصل ہیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ خالق ہے، مالک ہے، مربی ہے، پروردگار ہے، نہ اس لیے کہ اس کے کرنے سے خدا کو کوئی نفع پہنچتا ہے یا نہ کرنے سے اس کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔

باب ۲۳

اطاعت

عبادت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو استوار رکھنے کے لیے اس کی اطـــاعـــت بھی ضروری ہے۔ اسلام میں ہندویت اور عیسائیت کی طرح خدا صرف پوجا پاٹ ہی کا حق دار نہیں ہے، بلکہ اطاعت اور فرمانبرداری کا بھی حق دار ہے۔ اطاعت سے مطلب ان قوانین و احکام کی اطاعت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے اپنے بندوں کی انفرادی زندگی کی درستگی اور ان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لیے اتارے ہیں۔

اس اطاعت کے لیے سب سے پہلے تو عقل مطالبہ کرتی ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت عقل کے خلاف ہے کہ انسان جس ہستی کو اپنی عبادت کا مستحق تسلیم کرے اس کے احکام و قوانین کی اطاعت سے بے پروا رہے یا ان کا انکار کرے۔ اگر معبود ہستی نے کوئی حکم اور قانون دیا ہی نہ ہو (جس کا معبود حقیقی کے بارے میں تصور نہیں کیا جا سکتا) تب تو اور بات ہے، لیکن اس معبود ہستی نے اگر کچھ احکام و قوانین دیے ہیں تو انسان کی عقل اس سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جس کو عبادت کا مستحق سمجھتا ہے اسی کو اطاعت کا بھی مستحق سمجھے۔ عبادت کسی کی کرنا اور اطاعت کسی اور کی کرنا دونوں باتوں میں ایک کھلا ہوا تضاد ہے، جس پر صرف وہی شخص مطمئن ہو سکتا ہے جس کی عقل میں بہت بڑا فتور واقع ہو گیا ہو۔

دوسرے درجہ میں اس کا مطالبہ، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام کی ظاہری

شکل وصورت کرتی ہے۔ اسلام کو جو شخص تھوڑا بہت جانتا ہے وہ اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ اسلام کے خدا نے صرف اپنی پرستش ہی کا مطالبہ نہیں کیا ہے، بلکہ اپنی اطاعت کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ اس نے لوگوں کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور زکوۃ دینے ہی کے احکام نہیں دیے، بلکہ معاملات، کاروبار، زراعت، تجارت اور سیاست سے متعلق بھی بہت سے واضح اور قطعی احکام وقوانین دیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام وقوانین اس نے اسی لیے دیے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ اگر ان کی اطاعت مطلوب نہیں ہے تو پھر ان احکام کے دینے کا فائدہ ہی کیا؟ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ O (المائدۃ۔۵:۴۴)

اور جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں تو یہی لوگ کافر ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ O (المائدۃ۔۵:۴۵)

اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں گے تو وہی لوگ ہیں جو ظالم ٹھہریں گے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ O (المائدۃ۔۵:۴۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں گے تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں صرف اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ہی کا حکم نہیں آیا ہے، بلکہ بار بار اَطِيْعُوا اللّٰهَ کا حکم بھی آیا ہے جس کے معنی یہی ہیں کہ اللہ کے قانون کی اطاعت کرو:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ O
(آل عمران۔۳:۳۲)

کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ
(النساء۔۴:۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی۔

اس اطاعت کی عملی شکل درحقیقت رسول کی اطاعت ہے۔ اس لیے کہ رسول ہی ہے جو خدا کے نائب کی حیثیت سے خدا کے احکام وقوانین سے باخبر کرتا اور ان کی تنفیذ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی اَطِيْعُوا اللّٰهَ وارد ہے، ساتھ ہی اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا بھی حکم ہے۔ اس وجہ سے خدا اور رسول کی اطاعت کے درمیان فرق کرنے کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن رسول کی اطاعت تسلیم نہیں کرتے ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ وہ بادشاہ کی اطاعت تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے مقرر کیے ہوئے نائب کی اطاعت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خودمختاری کی گنجائش نہ تو دنیا کے قوانین میں کہیں تسلیم کی گئی ہے اور نہ خدا ہی نے اپنے قانون میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش رکھی ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا O (النساء۔۴:۶۵)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس اطاعت سے دو شکلوں کے سوا کسی شکل میں بھی انحراف کی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ ایک بھول چوک یا کسی جذبہ سے مغلوبیت، دوسرے مجبوری۔ پہلی صورت کا علاج استغفار اور توبہ اس نے بتایا ہے اور دوسری صورت کا علاج، امکان کے حد تک، اس مجبوری کی اصلاح یا اس سے نکلنے کی جدوجہد۔ ان شکلوں کے سوا خدا کی اطاعت سے انحراف اختیار کرنے والا اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق ہی منقطع کر لیتا ہے۔

مسلمان جہاں کہیں بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ خدا کے قانون کا نفاذ کر سکیں، ان کے اوپر یہ واجب ہے کہ وہ خدا ہی کے قانون کو نافذ کریں اور اسی کی اطاعت کریں۔ جو نظام خدا اور

رسول کے قانون پر مبنی ہو اور خدا اور رسول کے احکام ہی کے نفاذ کے لیے وجود میں آیا ہو اسلام میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے۔ اس نظام کے چلانے والے اولوالامر درحقیقت رسول کے خلفاء کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ان کی اطاعت واجب ہے۔ اوپر ہم نے سورہ نساء والی آیت جو نقل کی ہے اس میں اولوالامر سے ایسے ہی اولوالامر مراد ہیں۔ ایسے اولوالامر کی اطاعت سے اگر کوئی شخص انحراف اختیار کرے تو وہ گویا خدا اور رسول کی اطاعت سے انحرف اختیار کرتا ہے۔ ایک حدث ملاحظہ ہو:

> عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن اطاع الامام فقد اطاعنی. ومن عصانی فقد عصی اللہ. ومن عصی الامام فقد عصانی. (سنن ابن ماجہ: کتاب الجہاد باب ۳۹)
>
> حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے صاحب امر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے صاحب امر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کی اطاعت کے لیے اور رسول کی اطاعت کے لیے اسلامی نظام کے صاحب امر کی اطاعت شرط لازم ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت نہیں کی، اس نے خدا کی اطاعت نہیں کی اور جس نے صاحب امر کی اطاعت نہیں کی وہ رسول کی اطاعت سے محروم رہا۔

اسلامی نظام اطاعت کی یہ تینوں کڑیاں ایک دوسری سے الگ نہیں کی جاسکتی ہیں۔ یہ تینوں درحقیقت ظاہر میں تین ہیں اور الگ الگ نظر آتی ہیں، حقیقت میں یہ تینوں ایک ہی ہیں کیونکہ مقصود بالذات تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، بقیہ دونوں تو اس کا وسیلہ وذریعہ ہیں۔

اسلام نے اپنے نظام اطاعت میں اولوالامر کو یہ بلند منصب جو دیا ہے تو اس منصب کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ خود خدا کے قانون کی اطاعت کریں اور اس کے بندوں کے اندر اسی کے قانون کو جاری ونافذ کریں۔ جس طرح رسول کو یہ بات دل وجان سے زیادہ عزیز ومحبوب تھی کہ لوگ خدا

کے قانون کی اطاعت کریں اسی طرح انہیں بھی یہ بات محبوب ہو کہ لوگ خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت کریں اور جس طرح رسول کے نزدیک یہ چیز مبغوض تھی کہ لوگ اللہ کی اطاعت سے انحراف اختیار کریں اسی طرح ان کے نزدیک بھی یہ چیز مبغوض ہو کہ لوگ خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف اختیار کریں۔

اسی طرح کے منصب کا ایک بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ نہ خود خدا کے قانون کی نافرمانی کریں اور نہ دوسروں کو کسی ایسی بات کا حکم دیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں سے اطاعت کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ اس کائنات کا حقیقی حکمران وہی ہے۔ بندوں کا حقیقی منصب صرف اطاعت کا ہے اور اگر وہ کوئی تصرف کا حق رکھتے ہیں تو صرف اس کے نائب کی حیثیت سے، اس وجہ سے ان کے لیے یہ بات کسی حال میں جائز نہیں ہے کہ وہ اصل حکمران کے حکم کے خلاف کوئی حکم دیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھیں تو وہ اپنا وہ درجہ از خود ختم کر دیتے ہیں جو اسلام نے ان کو بخشا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام سخت بھی ہیں اور نرم بھی۔ ان پر عمل کرنے اور عمل کرانے میں بسا اوقات نہایت مشکل حالات اور صبر آزما کاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں اسی کی اطاعت کریں۔ جو لوگ صرف انہی باتوں میں خدا کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں جن کو وہ اپنی خواہشوں یا مصلحتوں کے مطابق پاتے ہیں، جن باتوں کو وہ اپنی خواہشوں اور مصلحتوں کے مطابق نہیں پاتے ان کی اطاعت سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں یا ان میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمایا ہے، بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے غضب اور اپنی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ پچھلی امتوں میں اس کی مثال یہود ہیں۔ یہود نے اللہ تعالیٰ کی شریعت کی بہت سی باتیں اپنی خواہشات اور اپنے مصالح کے خلاف سمجھ کر بدل ڈالیں۔ انہوں نے اپنے گمان کے مطابق خدا کی شریعت کو زمانے کے حالات کے مطابق ایک ترقی یافتہ شریعت کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت میں ان کی ان اصلاحات کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں فرمایا، بلکہ ان کی اس جسارت کی پاداش میں ان کو اپنی شریعت ہی سے محروم کر دیا اور ان پر لعنت کر دی۔

باب ۲۴

اخلاص

عبادت ہو یا اطاعت، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان میں سے قبولیت صرف اسی عمل کو حاصل ہوتی ہے جس میں اخلاص ہو۔ اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے، اس مقصد کے سوا کسی اور غرض کا اس میں شائبہ بھی نہ ہو۔

لوگوں نے اس کی تعریف اگرچہ مختلف الفاظ میں کی ہے لیکن یہ اختلاف محض الفاظ کا ہے، مدعا سب کا ایک ہی ہے۔ ایک عارف نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ اطاعت میں مقصود اللہ وحدہٗ کی ذات ہو۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی اپنے عمل کو مخلوق کے خیال و لحاظ سے بالکل بالاتر رکھے۔ ایک اور عارف کا قول ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کے اعمال ظاہر و باطن، دونوں میں بالکل یکساں ہوں۔ اسی طرح ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کی توجہ اس طرح خدا کی طرف ہو جائے کہ وہ اپنے عمل میں خلق کے لحاظ و خیال سے بالا ہو جائے۔ فضیل کا قول ہے کہ لوگوں کے خیال سے عمل کو چھوڑنا ریا ہے، کرنا شرک ہے، اخلاص یہ ہے کہ آدمی ان دونوں فتنوں سے محفوظ رہے۔ یہ اقوال علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی مدارج السالکین سے ماخوذ ہیں۔

احادیث سے بھی اخلاص کی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے:

عن عمر ان رسول اللہ ﷺ قال: الاعمال بالنیۃ ولکل امرئ مانوی. فمن

کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ. ومن کانت ھجرتہ لدنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوّجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ.
(صحیح البخاری: کتاب الایمان باب ۳۹)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ ہر آدمی کے سامنے اس کی نیت ہی آئے گی۔ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے شمار ہوگی۔ اور جس کی ہجرت کسی دنیوی مقصد کے لیے ہوگی، جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، یا کسی عورت کی خاطر ہوگی، جس سے وہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے ہے۔

عن ابی موسیٰ قال: سُئل رسول اللہ ﷺ عن الرجل یقاتل شجاعۃ ویقاتل حمیۃً ویقاتل ریاءً ایّ ذالک فی سبیل اللہ؟ فقال رسول اللہ ﷺ: من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ.
(صحیح مسلم: کتاب الامارۃ باب ۴۲)

حضرت ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ ایک شخص اپنی بہادری کی نمائش کے لیے جنگ کرتا ہے، ایک شخص مجرد حمیت کے تحت جنگ کرتا ہے، ایک شخص محض دکھاوے کے لیے جنگ کرتا ہے، ان میں سے کس کی جنگ اللہ کی راہ میں ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستہ میں اس شخص کی جنگ ہے جو اس مقصد کے لیے جنگ کرے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

اسی طرح ایک اور مشہور حدیث ہے، جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ سب سے پہلے تین قسم کے لوگوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی۔ ایک قرآن کے وہ قاری جو قاری کہلانے کے لیے قرآن پڑھتے ہیں، دوسرے وہ مجاہد جو بہادر کہلانے کے لیے جہاد کرتے ہیں، تیسرے وہ صدقہ کرنے والے جو اس لیے صدقہ کرتے ہیں کہ لوگوں میں ان کی داد و دہش کی دھوم ہو۔
(صحیح مسلم: کتاب الامارۃ باب ۴۳)

جو حقیقت ان احادیث میں واضح کی گئی ہے، غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اخلاص کی یہی اہمیت و حقیقت قرآن مجید میں بھی بیان ہوئی ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڏ حُنَفَآءَ (البینہ۔۹۸:۵)
ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ، بالکل یکسو ہو کر۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ (الزمر۔۳۹:۲۔۳)
تو تم اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔ یاد رکھو کہ اطاعت خالص کا سزاوار اللہ ہی ہے۔

پیغمبر ﷺ کی زبان سے اعلان کرایا گیا ہے:

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ ۝ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ
(الزمر۔۳۹:۱۴۔۱۵)
کہہ دو کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔ سو تم اس کے سوا جس کی چاہو بندگی کرو۔

تمام عبادات واطاعت کی روح اسی اخلاص کو قرار دیا گیا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (الانعام۔۶:۱۶۲۔۱۶۳)
کہہ دو: میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں تم میں پہلا مسلم ہوں۔

اس اخلاص کے لیے جہاں یہ بات ضروری ہے کہ آدمی کا عمل صرف اللہ کے لیے ہو وہیں یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس کا عمل خدا کے حکم اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ہو۔ یہ چیز اخلاص کی فطرت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص کام نہایت اخلاص کے ساتھ خدا ہی کے لیے کرے، لیکن اس کا وہ کام خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہو تو اس کا یہ اخلاص بے معنی، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی توہین ہے۔ اس کا طرز عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کی پسند و ناپسند کو خود خدا اور رسول سے زیادہ سمجھنے کا زعم رکھتا ہے اور یہ زعم غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ گھمنڈ اور شرک، دو چیزوں کا

مجموعہ ہے۔ اس وجہ سے کوئی عمل جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہو، وہ اخلاص کا عمل نہیں قرار پا سکتا، اگرچہ وہ کتنے ہی مخلصانہ طور پر انجام دیا جائے۔

فضیل بن عیاض کا ایک قول سننے اور سمجھنے کے قابل ہے۔ ان سے بہترین عمل کی حقیقت پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ بہترین عمل یہ ہے کہ وہ خالص اور بے لوث بھی ہو اور درست بھی۔ جب اس کی مزید تشریح ان سے چاہی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر عمل درست ہو، لیکن خالص نہ ہو جب بھی وہ قبول نہیں ہوتا۔ خدا کے ہاں قبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عمل خالص بھی ہو اور درست بھی۔ پھر انہوں نے خالص کی یہ تشریح فرمائی کہ وہ صرف اللہ کے لیے ہو۔ اور درست کی یہ تشریح فرمائی کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں چند آیتیں پڑھیں۔

اگر کوئی عمل خدا اور رسول کے حکم کے خلاف مجرد اخلاص کی بنا پر خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل کر سکتا تو رہبانیت کا نظام اللہ تعالیٰ کے ہاں ضرور قبولیت کا درجہ پاتا، اس لیے کہ جن لوگوں نے اس نظام کو ایجاد کیا، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کے اخلاص کا حوالہ دیا ہے، لیکن ان کے اس اخلاص کے حوالہ کے باوجود ان کی اس ایجاد کو بدعت اور باطل قرار دیا۔

بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ اگر ایک آدمی بھلائی کے کام کرے، لیکن وہ اللہ کے لیے نہ کرے یا اللہ کے ساتھ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرے تو آخر اس کے وہ عمل خدا کے ہاں قبولیت سے کیوں محروم رہتے ہیں، کام تو اس کے وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ قرار دیے گئے ہیں؟ جن لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے وہ دین کی ایک بنیادی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اچھائی اور بھلائی کے کاموں کا محتاج نہیں ہے کہ جو لوگ بھلائی کا کوئی کام کر دیں، خواہ وہ اس کے لیے کریں یا کسی اور کے لیے، خواہ وہ اس عمل کو اس کے حکم کے مطابق کریں یا اس کے خلاف، وہ ان کا ممنون کرم ہو جائے کہ ان لوگوں نے اس پر یا اس کی دنیا پر کوئی احسان کر دیا ہے، اس وجہ سے اس پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ ان کی بھلائیوں کی قدر کرے اور ان کا بدلہ دے۔

اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی اور بدی، دونوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنی ساری دنیا کو صرف فرشتوں ہی سے بھر دے، اس کے اندر کوئی برائی کرنے والا سرے سے رہ ہی نہ جائے۔

اسی طرح اگر وہ چاہے تو ہر آدمی کو اتنا نیک بنا دے کہ اس سے کسی شر کا صدور سرے سے ہو ہی نہیں۔ لیکن اختیار اور قدرت کے باوجود اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو صرف نیکی اور بھلائی ہی مطلوب نہیں ہے، بلکہ اصل چیز جو مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ لوگ بھلائی کے کام صرف اس کی رضا کے لیے کریں اور اس کے حکموں کے مطابق کریں۔ اس وجہ سے جو نیکی مذکورہ شرطوں کے ساتھ کی جاتی ہے اس کی تو اس کے ہاں بڑی قدر ہے، خواہ کتنی ہی چھوٹی ہو اور وہ اس کا اجر دیتا ہے، لیکن جس نیکی میں کسی اور شائبہ کی ملاوٹ ہو جاتی ہے، اس کا اس کے ہاں کوئی اجر نہیں ہے۔ وہ اس طرح کی نیکی کرنے والوں سے کہتا ہے کہ اس کا اجر اس سے لو جس کے لیے تم نے یہ نیکی کی ہے۔ احادیث میں یہی حقیقت اس طرح واضح کی گئی ہے۔ ایک حدیث قدسی ہے:

انا اغنی الشرکاء عن الشرک. فمن عمل لی عملاً اشرک فیه غیری فانا منه بریء وھو للذی اشرک. (سنن ابن ماجہ: کتاب الزھد باب ۲۱)

میں ساجھے کے تمام شریکوں سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ پس جس نے میرے لیے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ اس نے کسی دوسرے کو بھی شریک کر لیا تو میں اس سے بری ہو جاتا ہوں اور وہ عمل اسی کے لیے ہو جاتا ہے جس کو اس نے میرے ساتھ شریک کیا۔

جب آخرت میں ایسے لوگ اجر کے طالب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ:

اذھب فجد اجرک ممن عملت له. لا اجر لک عندنا.

جاؤ اس سے تم اپنے عمل کا معاوضہ لو جس کے لیے تم نے یہ کام کیا ہے۔ ہمارے ہاں تمہارے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔

یہ شریک کوئی بت اور صنم بھی ہو سکتا ہے، خاندان اور قبیلہ بھی ہو سکتا ہے، قوم اور وطن بھی ہو سکتے ہیں، شہرت، دکھاوے اور نفس کی دوسری خواہشیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے جو چیز بھی ہو وہ اخلاص کی ضد ہے اور وہ انسان کے عمل کو عنداللہ باطل کر دیتی ہے۔

اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ کوئی مخلص مسلمان اپنے خاندان یا قبیلہ، قوم اور وطن کے لیے کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے خاندان اور قبیلہ، قوم اور وطن کے حقوق و فرائض خود

نہایت تفصیل کے ساتھ متعین کر دیے ہیں اور ہر مسلمان پر یہ واجب کر دیا ہے کہ ہر شخص ان حقوق و فرائض کو اللہ کی رضا کے لیے اور اس کے احکام کے مطابق ادا کرے۔ جو شخص ان حقوق و فرائض کو اللہ کی رضا کے لیے اور اس کے احکام کے مطابق ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بڑا اجر ہے اور اس کا وہ کام جو خدا کے لیے نہ ہو تو وہ نری دنیا داری ہے، اگرچہ وہ، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بظاہر جہاد ہی کیوں نہ ہو۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس اخلاص کے ہونے یا نہ ہونے سے عمل کی فطرت میں بڑا تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ فرض کیجیے ایک ماں کی ممتا بچے کے لیے ہر شبہ سے بالاتر چیز ہے، لیکن اگر وہ اپنی ممتا کے جوش میں یہ کرے کہ بچے کی بیماری میں اس کو وہ سب کچھ کھلاتی جائے جس کے لیے بچہ ضد کرے، ڈاکٹر کی ہدایات کی وہ کوئی پروا نہ کرے تو اس ممتا کے باوجود اندیشہ ہے کہ وہ بچے کی جان لے کر رہے گی۔

اسی طرح فرض کیجیے، ایک شخص ہے جو کام تو اچھے کرتا ہے لیکن ان کاموں میں اس کے سامنے صرف خدا ہی کی رضا جوئی کا نصب العین نہیں ہے، بلکہ خدا کے سوا کوئی اور نصب العین ہے تو لازمی طور پر وہی نصب العین اس کے لیے حق اور باطل، پسند اور ناپسند، خیر اور شر کے لیے معیار بن جائے گا۔ آگے چل کر یہ چیز اس کی ہر بھلائی کو برائی کی شکل میں تبدیل کر دے گا۔ وہ اپنے قبیلہ اور اپنی قوم کے لیے اچھے اچھے کام کرتے کرتے بالآخر اس فلسفہ تک پہنچ سکتا ہے کہ میری قوم، خواہ حق پر ہو، یا باطل پر! یہ فلسفہ بالآخر اس کو ہٹلر اور مسولینی بنا دے سکتا ہے۔ یہ صرف خدا کی رضا جوئی کے نصب العین ہی کا خاصا ہے کہ وہ انسان کو کبھی بھٹکنے نہیں دیتا۔ یہ نصب العین انسان کو ایک جہانی اور آفاقی نقطۂ نگاہ دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے سامنے ہمیشہ اپنی ذات، اپنی قوم اور اپنے ملک کی بہبود کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت کا ہمہ گیر پروگرام رہتا ہے۔

اسی وجہ سے اسلام میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو پسند اور ناپسند کا معیار قرار دینا حرام قرار پایا۔ اسی حقیقت کو اخلاص کہتے ہیں۔ یہی اخلاص عقیدۂ توحید کی جان اور روح ہے، اور یہ عقیدۂ توحید — تعلق باللہ کا بنیادی پتھر ہے۔

محبت

ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آدمی اللہ کی عبادت واطاعت کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عبادت واطاعت اس کی سچی **محبت** کے ساتھ ہو۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو یہ عبادت واطاعت نفاق اور ریاکاری بن کے رہ جاتی ہے، جس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ وہ ہمارے کسی عمل کا محتاج نہیں ہے کہ جس طرح بھی کوئی شخص کوئی عمل کردے اس کو قبول کرے۔ وہ صرف اسی عمل کو قبول فرماتا ہے جو خالص اسی کے لیے کیا جائے اور مارے باندھے نہیں، بلکہ اس کی سچی محبت کے ساتھ کیا جائے۔ اس محبت کے لیے معیار یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ یہ دنیا کی تمام چیزوں کی محبت سے بڑھ کر ہو:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ۔۹:۲۴)

ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا، وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں اگر تمہیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ

عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمادے اور اللہ بدعہدوں کو بامراد نہیں کرتا۔

یہی بات حدیثوں میں یوں وارد ہوئی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ : لایؤمن عبد حتی اکون احب الیہ من اھلہ ومالہ والناس اجمعین. (صحیح مسلم: کتاب الایمان باب ۱۶)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی بندے کا ایمان معتبر نہیں ہے جب تک کہ میں اس کو اس کے اہل اور اس کے مال اور سارے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

بعض روایات میں **ومن نفسہ** کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی اس کو اللہ اور رسول اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ومحبوب نہ ہو جائیں:

عن انس عن النبی ﷺ قال: ثلاث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان: من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما، وان یحب المرء لایحبہ الا للہ، وان یکرہ ان یعود فی الکفر بعد ان انقذہ اللہ منہ کما یکرہ ان یقذف فی النار. (صحیح مسلم: کتاب الایمان باب ۱۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزیں جس میں ہوں گی وہ ان سے ایمان کی حلاوت پائے گا: ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں، دوسری یہ کہ وہ کسی سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرے اور تیسری یہ کہ کفر سے نجات پا جانے کے بعد اس میں لوٹنے کو وہ آگ میں ڈالے جانے کی طرح مبغوض جانے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا یہ ممکن بھی ہے کہ جو چیز انسان نے کبھی دیکھی نہ ہو اس سے اس کو محبت ہو اور محبت بھی ایسی کہ دوسری تمام چیزوں کی محبت سے بڑھ جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف ممکن ہی نہیں، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ انسان خود اپنے وجود کے اندر جو محبت ایک ان دیکھی چیز سے کرتا ہے وہ ان چیزوں سے نہیں کرتا جن کو وہ رات دن دیکھتا ہی نہیں، بلکہ اپنی خدمت میں سرگرم بھی پاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے کان آنکھ، ہر وقت اس کی فرمانبرداری میں مستعد ہیں اور وہ ان کی فرمانبرداری کا نہایت محتاج ہے لیکن اس کے سامنے اگر یہ مطالبہ رکھا جائے کہ اسے اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا اور بقیہ سے لازماً دست بردار ہونا ہے تو معقول انسان اپنی ظاہری قوتوں میں سے کسی ایک سے یا تمام سے دست بردار ہونا تو گوارا کرے گا لیکن وہ کسی قیمت پر بھی اپنی عقل سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کرے گا اگرچہ اس نے اسے نہ کبھی دیکھا ہے، نہ چھوا ہے اور نہ دیکھ اور چھو سکتا ہے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہوسکتی ہے کہ اگرچہ اس نے اس کو دیکھا نہیں، لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کے اندر ہی جوہر لطیف ہے جس پر اس کے تمام شرف اور اس کی ساری عظمت کی بنیاد ہے، دوسری تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے اگر وہ محروم ہو جائے تو اس سے اس کی اس حیثیت عرفی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، جو بحیثیت انسان اس کو حاصل ہے۔ لیکن عقل سے اگر وہ محروم ہو جائے تو دفعۃً وہ اشرف المخلوقات کے مرتبۂ بلند سے گر کر اراذل حیوانات کے درجہ میں آجائے گا۔

یہی حال اس کائنات کی دوسری چیزوں کا بھی ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک لاکھوں، کروڑوں چیزیں ہیں جن سے انسان شب و روز نفع اٹھا رہا ہے، لیکن وہ یہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں اس کی نفع رسانی میں از خود نہیں لگی ہوئی ہیں، بلکہ ایک مخفی ذات نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے نہ کسی چیز کو اس نے پیدا کیا ہے، نہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ ان کے پیدا کرنے والے پر اس کا کوئی حق ہی قائم ہے جس کی بنا پر وہ ان کی خدمت کا حق دار بن سکے۔ خاص طور پر جب یہ حقیقت اس پر واضح ہوتی ہے کہ دنیا میں جو محبوب سے محبوب چیز بھی اس کو حاصل ہے وہ اسی مخفی ذات کی بخشش سے حاصل ہے، وہ جب چاہے اس کو واپس لے سکتی ہے، کوئی دوسرا اس کو واپس نہیں دلا سکتا تو اس کا دل اس کی محبت سے اس طرح سرشار ہو جاتا ہے کہ ہر چیز اس کی محبت کے آگے ہیچ ہو جاتی ہے۔

پس یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ انسان خدا سے محبت نہیں کر سکتا۔ خدا مخفی ضرور ہے، لیکن اس

کے مخفی ہونے کی مثال یوں ہے کہ گویا تل کے اوٹ میں پہاڑ ہو۔ آسمان اور زمین کے ہر گوشے سے اس کی منادی ہو رہی ہے۔ ابر اور ہوا، سب اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ دریا اور پہاڑ، سب اس کے گواہ ہیں۔ پرندے اس کی حمد کے گیت گاتے اور درخت ان کے نغموں سے سرشار ہو کر جھوم رہے ہیں، اس دنیا کے ذرہ ذرہ پر اس کا نقش کندہ اور ایک ایک پتہ پر اس کی گواہی ثبت ہے۔ ایک ایسی ذات کو مخفی سمجھنا انسان کی اپنی عقل کا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ مخفی نہیں، بلکہ بدیہی ہے، بلکہ صحیح تر لفظوں میں یوں کہیے کہ ابدہ البدیہیات ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انسان کو ایسے مغالطے پیش آجاتے ہیں، جن کے سبب سے وہ اس کی صحیح معرفت سے محروم رہ جاتا ہے اور جب تک ایک چیز کی معرفت حاصل نہ ہو اس سے معمولی محبت بھی کرنا ممکن نہیں چہ جائیکہ تمام چیزوں سے بڑھ کر۔ بس یہی محرومی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم رکھتی ہے۔

خدا سے محبت کے لیے اس کی معرفت ضروری ہے

معلوم ہوا کہ محبت کی راہ میں اصلی حجاب اس کا مخفی ہونا نہیں، بلکہ اس کی صحیح معرفت سے محروم ہونا ہے۔ اس محرومی کے باعث آدمی خدا کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جو محبت تو در کنار سرے سے اس کا تعلق ہی خدا سے کاٹ دیتی ہیں۔

مثلاً بسا اوقات اس کو خدا کی قدرت اور اس کے علم کے باب میں غلط فہمی پیش آجاتی ہے، جس کے سبب سے وہ یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ اس عالم کا انتظام اس نے اپنے بہت سے مددگاروں میں تقسیم کر رکھا ہے، اس وجہ سے صرف اسی کی عبادت کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ان شریکوں کی عبادت بھی ضروری ہے۔ پھر خاص طور پر ان شریکوں سے محبت وہ خدا سے بھی زیادہ کرتا ہے جن سے، اس کے خیال میں، خود اس کی اپنی ضرورتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ کبھی خدا کے عدل کے صحیح تصور سے محروم ہونے کے باعث یا تو اس بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خدا کے ہاں خیر و شر میں سرے سے کوئی امتیاز ہے ہی نہیں یا بعض ظاہر یا مخفی ہستیوں سے متعلق اس گمان میں پھنس جاتا ہے کہ وہ خدا کے ایسے مقرب اور چہیتے ہیں کہ وہ جس کے لیے چاہیں دنیا میں بھی اس کو خدا اپنے انعامات سے نوازے گا اور آخرت ہوئی تو اس میں بھی

اس کو بخش دے گا، خواہ اس کے اعمال کچھ ہوں۔ چنانچہ وہ خدا کو چھوڑ کر اس کے ان مفروضہ مقربین ہی کی عبادت اور محبت کو اپنا دین بنا بیٹھتا ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ اس سنت الٰہی سے بے خبر ہوتے ہیں جس کے تحت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دکھ یا سکھ دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو خدا سے ڈھیٹ اور بے پروا ہو جاتے ہیں یا مایوس اور دل شکستہ۔ مثلاً اللہ تعالیٰ بعض لوگوں پر اپنا فضل فرماتا ہے کہ دیکھے وہ اس فضل کو پا کر اس کے شکر گزار رہتے ہیں یا مغرور و متکبر بن کر اکڑنے اور اترانے لگتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اس رمز سے واقف نہیں ہوتے وہ اس نوازش کو خدا کی طرف سے اپنی عزت افزائی سمجھ کر اکڑنے اور اترانے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے صبر کے امتحان کے لیے ان کو کسی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اگر وہ اس رمز سے واقف نہیں ہوتے تو وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ خدا نے ان کو ذلیل کر دیا ہے، جس کا اثر ان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ خدا سے مایوس اور بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کی غلط فہمیاں ہیں جو بالآخر شرک کے دروازے کھولتی اور انسان کو شیطان کے جال میں پھنساتی ہیں۔ ان سے محفوظ رہنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان کو خدا کی صحیح معرفت حاصل ہو۔ ایسی معرفت کہ شیطان کو اس کے اندر گھسنے کی کوئی راہ نہ ملے۔ اگرچہ ایسی مکمل رخنہ بندی آسان نہیں ہے، لیکن خدا کی صحیح معرفت سے وہ لوگ اپنے آپ کو شیطان کے حملوں سے بچا سکتے ہیں جو بچنا چاہیں۔ رہے وہ لوگ جو خود شیطان کے فتنوں میں پڑنا چاہتے ہیں [illegible] ان کو اس جال سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

خدا کی معرفت سے ہماری مراد صوفیانہ معرفت نہیں ہے۔ صوفیانہ معرفت کی بے حقیقتی اس کتاب کے پہلے حصہ میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ بلکہ اس سے ہماری مراد وہ معرفت ہے جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ محض ایک اجمالی تصور دینے کے لیے ہم بعض اصولی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

خدا کی معرفت کا سب سے زیادہ قطعی اور قابل اعتماد ذریعہ خدا کے وہ اسماء اور صفات ہیں جو اس نے خود اپنی کتاب میں بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کو خود ہی سب سے بہتر جانتا ہے، اس وجہ سے اس نے بندوں کو اپنی صفات کے معاملے میں دخل اندازی سے منع فرما دیا ہے:

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ط (النحل۔ ۱۶:۷۴)

تو تم اللہ کے لیے اپنے جی سے مثالیں نہ بیان کرو۔

ایک ماثور دعا میں بندے کی زبان سے خدا کی صفات کے باب میں یہ اعتراف عجز نقل ہوا ہے:

لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ. اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ.

(صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ باب ۴۲)

میں تیری ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ تو ویسا ہی ہے جتنی تو نے اپنی ثنا بیان فرمائی ہے۔

انسان اگر اپنے جی سے اللہ تعالیٰ کی صفتیں بیان کرے گا تو وہ اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق ایک مہادیو بنا کر رکھ دے گا اور پھر اپنے سارے دین کو اپنے اسی غلط تصور کے تحت اپنی خواہشوں کے سانچے میں ڈھالے گا۔ مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے بارے میں تصور کی غلطی تمام بنیادی غلطیوں کا سبب ہوتی ہے، اس وجہ سے سب سے زیادہ ضروری خدا کی صفات کی پکی معرفت ہی ہے۔

اسی سے بندے کو خدا کی پسند اور ناپسند کا بنیادی علم حاصل ہوتا ہے۔ اسی سے وہ خدا کی قدرت، ربوبیت، رحمت اور حکمت کا تصور حاصل کرتا ہے جو اس کے ایمان، توکل، صبر اور رضا کی بنیادیں استوار کرتا اور جہاد زندگانی میں اس کے لیے عزم اور قوت فراہم کرتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر خدا کی وہ خشیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ تنہائی کے گوشوں میں بیٹھا ہوا بھی یقین رکھتا ہے کہ اگرچہ وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن خدا اس کو ضرور دیکھ رہا ہے۔ یہی چیز اس کو توحید حقیقی کا شعور دیتی ہے کہ جو چیز اس کو خدا دینے والا نہیں ہے اس کو کوئی دوسرا دینے والا نہیں بن سکتا اور جو چیز اس کے رب نے اس کے لیے مقدر کر رکھی ہے آسمانوں اور زمین میں کسی کی قدرت نہیں کہ اس سے اسے محروم کر سکے۔ اسی سے اس کو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ تمام تر اس کے عدل، علم اور رحم پر مبنی ہے، کوئی دوسرا اس میں اس کے اذن کے بدون زبان نہیں کھول سکتا۔ پھر سب سے زیادہ اہم بات تزکیہ کے پہلو سے یہ ہے کہ خدا کی صفات ہی کے آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر وہ صحیح اندازہ کرتا ہے کہ کیا چیزیں اس کے اندر موجود نہیں ہیں جن کا ہونا

ضروری ہے اور کیا چیزیں اس کے اندر ایسی ابھر آئی ہیں جو اس کے خالق کی پسند کے خلاف ہیں۔

یہ حقیقت یہاں یاد رکھیے کہ تمام علم اور تمام شریعت کی بنیاد در حقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کے مقتضیات پر ہی ہے۔ انہی کی معرفت سے صحیح علم و معرفت کی راہیں کھلتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کا راستہ

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کا صحیح راستہ کیا ہے؟ اس سوال پر ہمارے علماء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اس پر بڑی جامع اور مطالعہ کے قابل بحث لکھی ہے۔ حضرات صوفیہ سے بھی اس باب میں بے شمار اقوال منقول ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس پر سب سے دل نشین بحث امام ابن قیم علیہ الرحمۃ نے اپنی بے مثال تصنیف مدارج السالکین میں کی ہے۔ انہوں نے اس کے لیے جو طریقہ بتایا ہے ہمارے نزدیک اس کی بنیاد کتاب و سنت اور عقل و فطرت پر ہے، اس وجہ سے ان کی بحث کا خلاصہ یہاں ہم اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے محبت الٰہی کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل دس باتیں اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

(۱) قرآن مجید کا مطالعہ پورے غور و تدبر کے ساتھ اس طرح کہ اس کے معانی و حقائق تک رسائی حاصل ہو۔

(۲) فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل کا اہتمام تاکہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہو۔ یہ چیز آدمی کو درجہ بدرجہ خدا کی محبت سے اس کی محبوبیت کے درجہ تک پہنچاتی ہے۔

(۳) ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام۔ یہ ذکر زبان، دل، عمل اور حال ہر چیز سے ہو۔ اس میں جتنی ہی سرگرمی ہوگی اس کے بقدر محبت الٰہی میں آدمی کا حصہ ہوگا۔

(۴) اس امر کی کوشش کہ جب نفس کی خواہشیں زور لگائیں تو آدمی اپنی پسند کو چھوڑ کر خدا کی پسند کو اختیار کرے۔ یہ چڑھائی اس کو کتنی ہی ہمت آزما نظر آئے لیکن وہ نہ ہارے۔

(۵) دل اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے مطالعہ، ان کے اسرار و حقائق کے مشاہدہ اور ان کی معرفت کے چمنستانوں کی سیر میں برابر لگا رہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اس کے اسماء و صفات

اور اس کے افعال کی راہ سے پہچانے گا وہ لازماً اس سے محبت بھی کرے گا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کے منکر ہیں ان کے لیے اس کی محبت میں کوئی حصہ نہیں۔

(۶) برابر اللہ تعالیٰ کے افضال و احسانات، اس کی شانوں اور اس کے کرشموں اور اس کی ظاہری و باطنی نعمتوں پر نگاہ رکھے۔ یہ چیز خاص طور پر اس کی محبت پیدا کرنے والی ہے۔

(۷) اور ان سب سے بالاتر شان رکھنے والی چیز رب کے سامنے بندے کے دل کا کامل انکسار ہے، جس کی حقیقت کی تعبیر الفاظ کی گرفت سے باہر ہے۔

(۸) جو اوقات اللہ تعالیٰ کے سمائے دنیا پر نزول کے ہیں ان میں اس سے مناجات، اس کے کلام کی تلاوت، آدابِ عبودیت کے ساتھ اس کے حضور میں حاضری کا اہتمام اور آخر میں استغفار اور توبہ پر اس کا اختتام۔

(۹) اللہ تعالیٰ کے صادق محبوں کی ہم نشینی، ان کے پاکیزہ ارشادات کی خوشہ چینی اور اس امر کا اہتمام کہ اس وقت تک زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالے جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ اب بات کہنے میں ہی اپنے حال کی اصلاح اور دوسروں کی مصلحت ہے۔

(۱۰) ان تمام چیزوں سے کلی احتراز جو آدمی کے دل اور اس کے رب کے درمیان حائل ہونے والی ہیں۔

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ راستہ ہے جس کو اختیار کر کے طالبین حق نے اللہ تعالیٰ کی محبت اور محبوبیت کا مقام پایا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ ارشاد صدق حق ہے۔ یہی راستہ کتاب و سنت کا بتایا ہوا راستہ ہے۔

محبت الٰہی کے حصول کا عملی راستہ

یہ راستہ جو بیان ہوا یہ علمی راستہ ہے۔ قرآن مجید نے اس کا ایک عملی طریقہ بھی بتایا ہے جو ایک معین اور محسوس شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے اور جس کو وہ لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں جو زیادہ علمی کاوشوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ پیغمبر ﷺ کے کامل اتباع کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے وجود گرامی کو دنیا میں اپنے کامل محب اور اپنے کامل محبوب کے ایک پیکر قدسی کی شکل میں

مبعوث فرمایا تا کہ لوگ ایک چلتی پھرتی اور تمام نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی زندگی میں دیکھ لیں کہ اللہ کے محب اور اس کے محبوب کی زندگی کیا ہوتی ہے اور وہ اپنے گھر میں اور گھر سے باہر لوگوں کے اندر اپنے شب و روز کس طرح گزارتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محبت اور محبوبیت جیسے نازک مسئلہ کو سمجھانے کے لیے سب سے زیادہ سہل راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک چلتی پھرتی زندگی میں اس کو لوگوں کے سامنے مشکل کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی کیا، جس کا ذکر سورہ آل عمران میں یوں ہوا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران۔۳:۳۱)

کہہ دو: اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی ﷺ محبت اور محبوبیت، دونوں کے کامل نمونہ ہیں۔ یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی محبت یا محبوبیت کا کوئی ایسا نمونہ بھی ہو سکتا ہے جو حضور ﷺ کے نمونہ سے اعلیٰ ہو۔ چنانچہ حضور ﷺ کے ارشادات پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جب بھی کسی نے زندگی کے کسی معاملے میں اس حد سے آگے قدم بڑھانے کی کوشش کی، جو حضور ﷺ کی مقرر کردہ حد سے ذرا بھی متجاوز تھی، تو آپؐ نے یہ کہہ کر اس کو روک دیا کہ میں اللہ سے تمہاری نسبت زیادہ محبت کرنے والا اور زیادہ ڈرنے والا ہوں، تو جب میں ایک کام کرتا ہوں تو تم اس کو تقویٰ کے خلاف کیوں سمجھو!

ایک تنبیہ

یہ امر نگاہ میں رہے کہ ہم نے لفظ محبت استعمال کیا ہے عشق یا اس قسم کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے لیے قرآن اور حدیث، دونوں میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے، کہیں عشق کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ لفظ عشق ایک غیر متوازن کیفیت پر دلیل ہوتا ہے، اس وجہ سے اللہ اور رسول کے لیے اس کا استعمال نہ صرف ناموزوں ہے، بلکہ اس میں احتمال سوءِ ادب کا بھی ہے۔ اللہ و رسول کے ساتھ بندوں کے سارے معاملات حدودِ شریعت کے پابند ہیں۔ اگر بال برابر بھی ان سے تجاوز ہو جائے تو گویہ تجاوز جذبۂ عشق کی تحریک ہی سے ہو، لیکن اس سے

بدعت اور ضلالت میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لفظ عشق کا استعمال زیادہ تر شاعروں نے کیا ہے یا صوفیوں نے۔ شاعروں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جب تک ہر چیز کو لیلیٰ اور مجنوں کی حکایت نہ بنا لیں ان کی شاعری بے مزا رہتی ہے، اس وجہ سے وہ چاہے روزہ اور نماز سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں، لیکن وہ اللہ سے بھی عشق رکھتے ہیں اور اس کے رسول سے بھی۔ ان کے ہاں ہر نعت گو اور ہر قوال عاشقِ رسول ہوتا ہے۔ صوفیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر میدان میں، جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے پہلے حصہ میں واضح کیا ہے، اپنا گول اصحاب شریعت سے آگے باندھنے کی کوشش کی ہے، اس وجہ سے انہوں نے محبت کے عام اور معروف لفظ کو اپنے جذبۂ محبت کی تعبیر سے قاصر پایا اور اس کی جگہ لفظ عشق کو اختیار کیا جو ان کے ہاں اصل محبوب لفظ ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک نزاعِ لفظی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس عشق نے تصوف میں جو بدعتیں داخل کی ہیں ان کا شمار ممکن نہیں ہے۔

محبت، عشق کی طرح، کوئی مبہم، مجہول اور بے قید چیز نہیں ہے، بلکہ ایک معروف، معین اور پابند آئین چیز ہے۔ یہ ایک جانی پہچانی کسوٹی ہے، جس پر آدمی اپنے کو بھی اور دوسروں کو بھی پرکھ کر دیکھ سکتا ہے کہ کس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کے سامنے جب کوئی ایسا موڑ آئے جب اسے یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ دو راستوں میں سے وہ کون سا راستہ اختیار کرے — وہ راستہ جو اس کی خواہشوں، اس کی حاضر مصلحتوں، اس کے عزیزوں اور دوستوں کی رائے اور پسند کے موافق ہے، لیکن اس کے اپنے علم کے حد تک وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے، یا وہ راستہ جو اگرچہ ان کی رائے کے خلاف ہے جن کی دلداری اس کو عزیز ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے موافق ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اپنی خواہشوں اور اپنے ہوا خواہوں کی پاسداری کو ترجیح دے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا سے زیادہ دوسروں سے محبت کرتا ہے اور اللہ پر ایمان کا دعویٰ محض ادعاء ہے اور اگر وہ دوسری راہ پسند کرتا ہے، یعنی سب کو نظر انداز کر کے بے دھڑک اللہ کے حکم کو اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا سچا محب بھی ہے اور سچا محبوب بھی اگرچہ اس نے عشقِ الٰہی کا کبھی دعویٰ نہ کیا ہو۔

یہ محبت ہے جس کا دین میں اعتبار اور جس پر آدمی کے اخروی مراتب کا انحصار ہے۔ اس کو

جانچنے اور پرکھنے کے لیے خود قرآن مجید نے ایک واضح کسوٹی بھی مقرر کر دی ہے جس پر ہر مدعی کو آپ جب چاہیں جانچ سکتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنے زعم میں، محبت کے زیر اثر، گریبان اور دامن چاک کر کے برہنہ سر اور برہنہ پا گھروں سے نکل کھڑے ہوتے اور صحراؤں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں تو ان کی محبت کو پرکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی کسوٹی نہیں ہے اور یہ کہنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے کہ فی الواقع یہ عشق الٰہی ہے یا عشق لیلیٰ ہے یا محض خلل دماغ!

باب ۲۶

خوف

جس طرح اللہ تعالیٰ کی محبت ایمان کے لازمی مقتضیات و مطالبات میں سے ہے اسی طرح خوف بھی اس امر کے بدیہی مطالبات میں سے ہے اور جس طرح ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دوسری تمام محبتوں پر غالب و حاکم ہو، اسی طرح یہ بھی واجب ہے کہ خدا کا خوف دوسرے تمام خوفوں پر غالب و حاکم ہو۔ چنانچہ قرآن حکیم نے جس طرح فرمایا ہے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی محبت میں سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرہ۔۲:۱۶۵) (جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہوتے ہیں) اسی طرح ان لوگوں کو جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے ڈر سمائے ہوئے تھے تنبیہ فرمائی کہ:

اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (التوبہ۔۹:۱۳)
کیا تم ان سے ڈرو گے؟ اصل حقدار تو اللہ ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔

اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ (البقرۃ۔۲:۱۵۰)
مگر جو ان میں سے ظالم ہیں تو ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ — العیاذ باللہ — وہ مشرکین کے خیالی بھوتوں کی طرح

کوئی ہولناک اور ڈراؤنی چیز ہے کہ ذرا ناخوش ہو جائے تو سب کو تباہ و پامال کر کے رکھ دے۔ اس نے اپنی جو صفتیں قرآن میں بتائی ہیں وہ سب اچھی، جمیل اور دل کو طمانیت بخشنے والی ہیں۔ بعض صفتیں اس کے جلال و جبروت کو ظاہر کرنے والی ضرور ہیں، لیکن ان کی صحیح نوعیت ہم نے اپنی تفسیر — تدبر قرآن — میں واضح کر دی ہے کہ یہ اس کی عظمت و قدرت کی بے پناہی اور اس کے حیطۂ قدرت کی ہمہ گیری کے اظہار کے لیے ہے تا کہ اہل ایمان کو ان سے پورا اعتماد حاصل ہو، اہل کفران سے عبرت اور تنبیہ حاصل کریں۔ ان سے یہ تاثر لینا کہ اللہ تعالیٰ کوئی خوفناک چیز ہے، ان کی روح کے بالکل منافی بات ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی صفات جمیلہ کے جو تقاضے ہیں اور ان سے جو سنن و قوانین ظہور میں آئے ہیں وہ بجائے خود ایسے اہم، اٹل اور بے پناہ ہیں کہ جو شخص بھی ان کا علم رکھتا ہے وہ لازماً اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔

یہ صفات اور ان کے تقاضے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نہایت تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ جو لوگ قرآن سے نابلد ہیں وہ تو بے شک بے خوفی کی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن جو اس سے آشنا ہیں ان کا حال خود اس کتاب ہی میں بیان ہوا ہے کہ تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؗ (السجدۃ۔۳۲:۱۶) (ان کے پہلو بستروں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف اور طمع سے)۔ جو قدم وہ اٹھاتے ہیں یہ اچھی طرح سوچ کر اٹھاتے ہیں کہ ایک دن ان کو اپنے مالک کے آگے ہر قول و فعل کا حساب دینا ہے۔ چنانچہ یہ بات قرآن مجید میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی ڈرنے والے اس کے بندوں میں سے وہی ہوتے ہیں جو اس کتاب کا علم رکھنے والے ہیں۔ فرمایا:

> اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (فاطر۔۳۵:۲۸)
>
> اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں۔ بے شک اللہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

اس آیت میں **علماء** سے مراد ظاہر ہے کہ اصطلاحی علماء نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے عطا کیے ہوئے **حقیقی علم** کے وارث ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صحیح صفات اور اس کے سنن اور قوانین سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اس طرح

ڈرتے ہیں جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ رہے وہ لوگ جو نہ اس کی صفات ہی سے واقف ہیں اور نہ اس کے سنن و قوانین ہی سے، ان لوگوں کے لیے نہ اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ ہے نہ وہ ڈرتے ہی ہیں اور اگر ڈرتے بھی ہیں تو اس طرح نہیں ڈرتے جس طرح اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ اس طرح ڈرتے ہیں جس طرح ایک بت پرست اپنے خیالی بھوت سے ڈرتا ہے درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے لیے قرآن نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے:

> يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آل عمران۔۳:۱۰۲)
>
> اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

مسئلہ کا یہ پہلو تقاضا کرتا ہے کہ قرآن کی روشنی میں ہم خوف الٰہی کے چند پہلو واضح کریں تا کہ ان لوگوں کو ان سے رہنمائی حاصل ہو جو صحیح علم کے طالب ہیں۔

خوفِ الٰہی کے اصلی محرکات

قرآن نے اللہ تعالیٰ سے برابر ڈرتے رہنے کے جو وجوہ تفصیل سے بیان کیے ہیں ان میں سے سب سے پہلی وجہ، جس کی بار بار وضاحت فرمائی ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس نے یہ دنیا ایک عظیم حکمت و غایت کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اس کی اس حکمت کا بدیہی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے جو اس دنیا میں نیکی اور پرہیزگاری کی زندگی گزاریں اور ان لوگوں کو قرار واقعی سزا دے جو دھاندلی اور فساد پھیلائیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے نزدیک نیکی اور بدی میں سرے سے کوئی فرق نہیں ہے اور وہ اس امر سے بالکل بے تعلق ہے کہ کون اس کی دنیا میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی گزارتا ہے اور کون نافرمانی اور بغاوت کی۔ یہ فرض کرنا اللہ تعالیٰ کی صفات رحمت، ربوبیت، عدل اور قدرت و حکمت کی کلی نفی ہے۔ چنانچہ قرآن نے قیامت کے منکروں کو خطاب کر کے جگہ جگہ یہ فرمایا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ یا یہ سوال کیا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ جو علم والے ہیں وہ اور جو علم سے محروم

ہیں وہ، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر قیامت نہیں ہے، جیسا کہ تم گمان کرتے ہو، تو اس کا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ نیک اور بد اور عالم و جاہل، دونوں یکساں ہو جائیں اور یہ دنیا ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک بازیچہ اطفال بن کے رہ جائے۔ اگر یہ فرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو ہر عاقل پر واجب ہے کہ وہ خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچنا چاہتا ہے تو اس کے حضور پیشی سے برابر ڈرتا رہے اور اپنی خواہشوں کو لگام دے۔ اس گروہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (آل عمران۔۳:۱۹۱)

یہ لوگ آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے پروردگار! تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے۔ سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

رہے وہ لوگ جو اس دنیا کو ایک بازیچہ اطفال اور اس کے خالق کو — العیاذ باللہ — ایک کھلنڈرا گمان کر کے اپنی زندگی بے خوفی میں گزار رہے ہیں لازم ہے کہ ایک دن وہ اپنی اس حماقت کا انجام دیکھیں۔

دوسری وجہ خدا سے ڈرنے کی یہ ہے کہ جو پکڑ وہ پکڑ سکتا اور جو سزا وہ دے سکتا ہے کوئی دوسرا، خواہ کتنا ہی بڑا بادشاہ اور کتنا ہی بڑا جبار ہو، نہ وہ اس طرح پکڑ سکتا اور نہ اس کی طرح کسی کو سزا دے سکتا۔ چنانچہ اس نے خود اپنی تعریف یہ فرمائی ہے کہ:

لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۝ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۝ (الفجر۔۸۹:۲۵۔۲۶)

نہ اس کا سا کوئی عذاب دے سکتا اور نہ اس کا سا باندھنا کوئی باندھ سکتا۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا جبار بھی کسی کو بڑی سے بڑی سزا جو دے سکتا ہے وہ بہر حال اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہوگی۔ اگر کوئی دوسرا نہیں تو موت آ کر اس کو اس زندگی اور اس کے عذاب، دونوں سے نجات دے سکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جو عذاب دے گا وہ ایک ابدی زندگی میں ہوگا جس کو نہ کوئی ختم کر سکتا اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور اس کی کلفتوں سے نجات دلا سکتا یا

اس میں تخفیف ہی کر سکتا۔

دوسروں کی گرفت یا ان کے دائرۂ اقتدار سے بچ نکلنا بھی ناممکن نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی خدائی آسمانوں اور زمین کے ایک ایک گوشہ پر محیط ہے۔ ان کی حدود سے باہر نکل بھاگنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے، نہ کسی جن کے لیے نہ کسی انسان کے لیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں دونوں کو مخاطب کر کے آگاہ فرمایا کہ:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا ۚ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ (الرحمن۔۵۵:۳۳)

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تم یہ کر سکو کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے اطراف سے تو نکل بھاگو۔ تم میرے پروانۂ راہداری کے بدون نہیں نکل سکو گے۔

دنیا کے قہاروں اور جباروں کے سراغ رسانوں اور ان کی پولیس سے بچ نکلنے کی سو تدبیریں ہو سکتی ہیں۔ سائنس کی اس ترقی کے زمانے میں بھی آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط جیلوں کے اندر اور ہوشیار سے ہوشیار پہرہ داروں کی نگرانی سے بھی بھاگنے والے بھاگ ہی جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فرشتہ اجل ایسا بے پناہ ہے کہ کوئی اس کے پنجہ سے کسی طور بھی چھوٹ نہیں سکتا اور اس کی رسائی مضبوط سے مضبوط قلعوں کے اندر بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مجرموں کے لیے جو جیل بنائی ہے اس پر اس نے ایسے سخت گیر ملائکہ مامور کیے ہیں جو کسی کی آہ و فریاد سے متاثر ہو کر نہ ذرا اس پر ترس کھائیں گے نہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں ذرا چشم پوشی برتیں گے:

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ أَمَرَهُمْ. (التحریم۔۶۶:۶)

اس پر درشت مزاج اور سخت گیر ملائکہ مامور ہوں گے۔ اللہ ان کو جو حکم دے گا اس کی تعمیل میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

اس معاملہ کا تیسرا پہلو جو مذکورہ دونوں باتوں سے بھی اہم ہے یہ ہے کہ اس دنیا میں فدیہ، رشوت اور سفارش سے بھی بہت سے کام نکل آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچنے کے لیے

یہ حربے بے سود ہیں۔

جہاں تک فدیہ اور رشوت کا تعلق ہے، اول تو کسی کے پاس وہاں کوئی چیز ہوگی ہی نہیں اور ہو بھی تو وہ کس کو فدیہ یا رشوت دے گا؟ کیا — العیاذ باللہ — اللہ تعالیٰ کو؟ اس دن کے ہولناک عذاب سے چھوٹنے کے لیے مجرمین چاہیں گے تو ضرور کہ اپنی عزیز سے عزیز چیز بھی فدیہ میں دے کر عذاب سے چھوٹ سکیں تو اپنے کو چھڑا لیں، لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہیں ہوگی۔ وہ دن جزائے اعمال سے دوچار ہونے کا ہوگا۔ عمل ہی چھڑائے گا اور عمل ہی سزا دلوائے گا:

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (الطور ۵۲:۲۱)

ہر ایک اس کمائی کے بدلے میں گرو ہوگا جو اس نے کی ہوگی۔

اس دن مجرمین کی بے بسی اور بے کسی کا حال قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۝ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝ كَلَّا

(المعارج ۷۰: ۱۱-۱۵)

مجرم تمنا کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے اس کنبہ کو جو اس کو پناہ دینے والا تھا اور تمام اہل زمین کو فدیہ میں دے کر اپنے کو بچا لے، لیکن ان کی یہ تمنا ہرگز بر نہیں آئے گی۔

نادانوں نے اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے سب سے زیادہ اعتماد اپنے فرضی معبودوں، اپنے پیروں، اپنے مشائخ اور ولیوں اور نبیوں کی سفارش پر کیا ہے۔ جس طرح مشرکین عرب اس وہم میں مبتلا تھے کہ اپنے جن دیویوں، دیوتاؤں کی وہ پرستش کرتے ہیں ان کو خدا کے ہاں وہ مقام حاصل ہے کہ وہ اپنے پجاریوں کو اپنے زور و اثر سے، خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے اسی طرح اس دور کے کتنے مسلمان اپنے پیروں اور مشائخ کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ ان کو ساتھ لیے بغیر تنہا جنت میں نہیں جائیں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کی دلداری میں ان کے تمام متوسلین کو جنت میں ضرور بھیجے گا، قطع نظر اس سے کہ ان کے عقائد و اعمال کیا ہیں۔ گویا اصل چیز ان کے نزدیک، نجات کے لیے اللہ اور رسول سے تعلق نہیں، بلکہ کسی مزار اور صاحب مزار سے

توسل ہے۔ ان کی سفارش کی امید نے ان کو دین کی تمام ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ شفاعت کے باب میں اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کیا ہیں، ورنہ وہ اپنی عاقبت اس طرح خطرہ میں نہ ڈالتے۔ ہم قرآن مجید کی روشنی میں چند اہم باتیں یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ اس طرح کے بے خبروں کو آگاہی حاصل ہو۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ خدا کے حضور میں ناز اور تدلل سے بات کرنا تو در کنار کوئی شخص اس کے اذن کے بغیر زبان کھولنے کی جرأت ہی نہیں کر سکے گا، صرف وہی زبان کھولے گا جس کو اجازت مرحمت ہوگی۔ اس پابندی سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ مقرب ترین فرشتوں کے متعلق بھی قرآن میں بیان ہوا ہے کہ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ (الانبیاء ۲۱:۲۷) (وہ اس کے آگے بات میں پہل نہیں کرتے)۔ یعنی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن نہ ہو جبریل امین بھی زبان نہیں کھولتے تو تا بہ دیگراں چہ رسد! یہی بات جگہ جگہ نبیوں اور رسولوں کے متعلق ارشاد ہوئی ہے تو کسی پیر یا شیخ سے متعلق یہ بات کیسے باور کی جا سکتی ہے کہ وہ پہل کر کے اللہ تعالیٰ سے کوئی بات ناز و تدلل سے کہنے کی جرأت کر سکے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس کو بات کرنے کی اجازت ملے گی وہ صرف اس شخص کے بارے میں بات کرے گا جس کے لیے اس کو اجازت ملے گی۔ مجال نہیں ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کے باب میں لب کشائی کر سکے۔ اس کی وضاحت بھی قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کر دی ہے:

وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ۝

(الانبیاء ۲۱:۲۸)

اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اللہ پسند فرمائے اور وہ اس کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف وہی بات کہے گا جو حق ہوگی، کوئی خلاف حقیقت بات زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے بارے میں سب سے زیادہ خود جانتا ہے۔ کوئی شخص اس پوزیشن میں نہیں ہو سکتا کہ کسی کے متعلق وہ یہ کہہ سکے کہ وہ اس کے

بارے میں خدا سے زیادہ جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم سب کو محیط ہے۔ دوسروں کو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا اس نے بخشا ہے، اس وجہ سے کسی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خدا کے سامنے دروغ بافی کر سکے۔

چوتھی حقیقت یہ ہے کہ کوئی سفارش نہ حق کو باطل بنا سکتی اور نہ باطل کو حق۔ اگر ایسا ہو تو اس سے وہی بات لازم آتی ہے کہ جو قیامت کے نہ ہونے سے آتی ہے۔ یعنی یہ دنیا ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کر رہ جاتی ہے، جو ایک حکیم خدا کی صفات اور شان کے منافی ہے۔

پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نجات کو کلیۃً آدمی کے اعمال اور اپنی رحمت سے وابستہ کیا ہے نہ کہ کسی کی سفارش سے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○
(الزلزال۔۹۹: ۸)

پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ بھی اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھے گا۔

ان کلیات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت کا دائرہ اتنا کشادہ نہیں ہے جتنا اپنی خواہشوں کو الاؤنس دینے والوں نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ یہ بہت محدود ہے۔ اس سے فائدہ انہی لوگوں کو پہنچے گا جو اللہ تعالیٰ کے قانون عدل کے تحت اس سے فائدہ اٹھانے کے حقدار ہوں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ یہ اس عدل و قسط کو باطل کر دے جس پر تمام شریعت، بلکہ تمام نظامِ عالم کی بنیاد ہے۔

زندگی پر خوفِ الٰہی کے اثرات

جو شخص قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات جلال و جبروت پر اور کائنات میں خالق کی بے پناہ قدرت و عظمت اور قوموں کی تاریخ میں اس کے عدل و قسط کے ظہور کی نشانیوں پر غور کرتا ہے تو بعض اوقات اس پر ایسی ہیبت و دہشت طاری ہو جاتی ہے کہ زندگی کی ہر لذت تلخ معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن یہ ہیبت و دہشت عقل و فکر کی راہ سے آتی ہے، اس وجہ سے نہ تو عقل کو مختل و ماؤف کرتی

نہ اس سے انسان پر اس طرح اثر پڑتا جس کا اثر اچانک کسی درندہ یا خوفناک سانپ کو دیکھ لینے سے پڑتا ہے کہ آدمی بھاگ کھڑا ہوا اور پھر مڑنے کا نام بھی نہ لے۔ بلکہ اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ وہ خدا سے ڈر کر خدا ہی کی طرف بھاگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی پکڑ سے خدا ہی پناہ دے سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ چنانچہ وہ، جیسا کہ حدیث ماثور میں ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ. (صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ باب ۴۲)

اے رب! اور میں تجھ سے تیری ہی پناہ چاہتا ہوں۔

وہ یہ کہتا ہوا اس طرح اپنے آپ کو اپنے رب کی پناہ میں دے دیتا ہے جس طرح بچہ ماں کے ڈرانے سے ماں ہی کی آغوش سے چمٹ جاتا ہے۔ جو لوگ خدا سے بھاگ کر کسی دوسرے کی پناہ ڈھونڈتے ہیں وہ وہی غلطی کرتے ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے نے کی۔ جب باپ نے اس کو قہر الٰہی سے بچانے کے لیے کشتی میں سوار ہو جانے کی دعوت دی تو وہ گھمنڈ سے بولا کہ میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے اس طوفان سے بچائے گا! لیکن اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ خدا کی پکڑ سے کوئی پہاڑ پناہ نہیں دے سکتا!

اس تاثر کا ایک دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے کہ یہ ایک ہی خوف دوسرے تمام خوفوں اور اندیشوں سے بالکل نچنت کر دیتا ہے۔ بندہ خدا سے ڈر کر جب اپنے تئیں اسی کی پناہ میں دے دیتا ہے تو اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی پناہ میں ہے جس کے سوا نہ کوئی نافع ہے نہ کوئی ضار۔ وہ جو کچھ دینا چاہے گا اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جو روک لے گا کوئی اس کو دے نہیں سکتا۔ یہ اطمینان جس کو حاصل ہوگا اس کو اس دنیا میں آسمانی بادشاہی حاصل ہوگی۔ جنت کی تعریف میں فرمایا ہے کہ اس میں نہ کوئی خوف ہوگا نہ کوئی غم۔ یہی حال اس دنیا میں اس شخص کو ہوتا ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے آشنا ہوگا۔ یہ خوف تو اس کو بے شک لاحق رہتا ہے کہ ایک دن اس کو اپنے رب کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے، لیکن یہ خوف دل کو توڑنے والا نہیں، بلکہ اس کے لیے سرمایۂ اطمینان و تسکین ہے۔ اس لیے کہ یہ دوسرے تمام وہمی اندیشوں کو یک قلم ختم کر دیتا ہے۔

خوفِ الٰہی کے یہ صرف دو نمایاں اثرات ہم نے بیان کیے ہیں، قرآن و حدیث میں اس کے اثرات کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ اتنی طویل ہے کہ اس مختصر مضمون میں اس کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ ہم اس کو چند کلیات کے تحت بیان کرتے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین ان کے تحت ان جزئیات کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے جو ان کے اندر مضمر ہیں۔

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوف لازماً انسان کو اس کی شخصی و ذاتی زندگی میں متقی، اس کی عائلی و خاندانی زندگی میں مشفق اور اس کی اجتماعی زندگی میں ایک مصلح بنا دیتا ہے اور یہ اس کے ایسے بدیہی اثرات ہیں کہ اگر کسی میں نہ پائے جائیں یا کامل طور پر نہ پائے جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا سینہ یا تو خوفِ خدا سے خالی ہے، اگرچہ وہ اس کا کتنا ہی مدعی ہو، یا وہ خدا اور اس کے خوف کے تصور سے بالکل ناآشنا ہے۔

اب اس اجمال کی وضاحت کے طور پر چند باتیں ذہن نشین کر لیجیے۔ اپنی شخصی و انفرادی زندگی میں متقی کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مخفی سے مخفی گوشوں میں بھی خدا کے حدود و محارم کی پوری پوری نگہداشت کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جہاں اس کو کوئی نہیں دیکھتا وہاں بھی خدا کی نگاہوں سے وہ مخفی نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وہ کہیں بھی اپنی خواہشوں کو ایسی آزادی نہیں دیتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی کسی حد سے تجاوز کر پائیں۔ اس کے ہر عمل میں احتیاط کی یہ شان نمایاں ہوتی ہے کہ وہ صرف برائی ہی نہیں بلکہ برائی کے قرب سے بھی اپنے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ نبی ﷺ کی یہ تنبیہ ہمیشہ اس کے سامنے رہتی ہے کہ جو چرواہا اپنا گلہ کسی کے رقبہ کے اردگرد چراتا ہے ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اس کا گلہ کھیتوں میں جا پڑے۔ یہ اندیشہ متقاضی ہوتا ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کی باگ برابر کھینچے رہے۔ اس کو ہر لمحہ یہ خوف ہی دامن گیر رہتا ہے کہ ایک دن اس کو اپنے رب کی عدالت میں کھڑے ہونا اور اپنے ہر قول و فعل کی جوابدہی کرنا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے باب میں ارشاد ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝
(النازعات۔۷۹:۴۰۔۴۱)

اور جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو خواہش کی پیروی سے روکا تو

اس کا ٹھکانا لاریب جنت ہے۔

اپنی عائلی و خاندانی زندگی میں مشفق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آل و اولاد اور اپنے کنبہ و خاندان کو اپنے لیے سرمایۂ فخر و غرور نہیں سمجھتا بلکہ الا! فکلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ! (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ باب ۵) (آگاہ رہو کہ تم میں سے ہر شخص چرواہا بنایا گیا ہے اور ہر شخص سے اس کے گلہ کے بارے میں پرسش ہونی ہے!) کی تنبیہ کی روشنی میں وہ اپنی اس ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جو گلہ اس کی تحویل میں دیا گیا ہے اس کی ایک ایک بھیڑ سے متعلق اس سے پرسش ہونی ہے کہ اس نے اس کی دیکھ بھال کا حق ادا کیا یا نہیں؟ اس احساسِ ذمہ داری کا قدرتی تقاضا ہے کہ بجائے اس کے کہ اس کو اپنے گلہ کی وسعت پر ناز و فخر ہو برابر فکر اس بات کی دامن گیر رہتی ہے کہ کوئی بھیڑ آوارہ ہو کر بھیڑیے کی نذر نہ ہو جائے کہ مالک کی طرف سے اس کی بابت پرسش ہو اور وہ ایک نالائق چرواہا ٹھہرے۔ چنانچہ وہ اپنے خاندان کو دیکھ کر اتراتا اور اکڑتا نہیں بلکہ برابر اس فکر میں رہتا ہے کہ ان کی ہدایت و ضلالت سے متعلق اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو ادا کرنے کی اس کو توفیق حاصل ہو تاکہ قیامت کے دن اس کو فاسقوں کے سردار کی حیثیت سے اٹھنے کی رسوائی نہ حاصل ہو، بلکہ وہ متقیوں کے امام کی حیثیت سے اٹھے۔ اس طرح فکرمند رہنے والوں کے باب میں قرآنِ حکیم نے یہ خبر دی ہے کہ ان کو اور ان کے صالح متعلقین کو جنت میں براجمان دیکھ کر جب سوال کرنے والے یہ سوال کریں گے کہ آپ کو یہ مقام کس نیکی کے صلے میں ملا؟ تو جواب دیں گے:

اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۔
(الطور۔۵۲:۲۶۔۲۷)

ہم اس سے پہلے اپنے اہل و عیال کے باب میں بڑے ہی چوکنے رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھا۔

یعنی ہم نے دنیا میں اپنے اہل و عیال کے اندر دنیا کے بدمستوں کی طرح بے فکری کی زندگی نہیں گزاری بلکہ اس ڈر سے کہ ایک دن ان کے خیر و شر سے متعلق ہمیں خدا کے آگے جواب دہی کرنی ہے ہم نے ان کی دنیا سے زیادہ ان کی عاقبت کی فکر رکھی، جس کا صلہ ہم کو یہ ملا ہے۔

قومی وملی زندگی میں مصلح کا مطلب یہ ہے کہ خوف خدا رکھنے والے اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ جو شخص اپنی قوم کے خیر وشر سے بالکل بے تعلق زندگی گزارتا ہے جب اس کی قوم اپنے اجتماعی فساد کے نتیجے میں خدا کی پکڑ میں آتی ہے تو لازماً وہ لوگ بھی اس عذاب کی زد میں آتے ہیں جو اگرچہ خود مفسد نہ رہے ہوں لیکن انہوں نے مفسدوں کی اصلاح کی کوئی کوشش بھی نہ کی ہو۔ قوموں کے معاملہ میں سنت الٰہی یہ ہے کہ ان کی عدالت اسی دنیا میں ہو جاتی ہے اور جب اس عدالت کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جنھوں نے تمام مخالفتوں اور عداوتوں سے بے پروا ہو کر بے خوف لامۃ لائم، قوم کو گمراہی سے بچانے کی کوشش کی ہو۔ جو لوگ اپنے مصالح کی خاطر اس طرح کے معاملات کو پرایا جھگڑا سمجھ کر ان سے الگ تھلگ رہتے ہیں وہ اگرچہ خود اپنی نگاہ میں نیک ہوں لیکن ان کا حشر وہی ہوتا ہے جو ایک کشتی کے مسافروں والی تمثیل میں نبی ﷺ نے سمجھایا ہے کہ اگر کشتی کے نیچے والے حصہ میں سفر کرنے والے کشتی کے پیندے میں سوراخ کرنا شروع کر دیں اور اوپر والے اس خیال سے ان کے ہاتھ نہ پکڑیں کہ یہ ایک پرایا جھگڑا ہے، اس میں ان کو مداخلت کا کیا حق ہے، تو اس کے نتیجے میں کشتی جب ڈوبے گی تو سب کو لے ڈوبے گی، اوپر والوں کو بھی اور نیچے والوں کو بھی؟

اس سعیٔ اصلاح کی حد قرآن نے یہ مقرر کی ہے کہ اگر اصلاح کرنے والوں کی یہ بات ایک شخص بھی سننے والا نہ ہو جب بھی انہیں اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا عذر مسموع ہو سکے۔ قرآن مجید میں مصلحین کے ایک گروہ کا ذکر ہوا ہے کہ جب ان کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے، حالات سے بددل ہو کر، یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ آخر ایسے لوگوں کے پیچھے اپنی اوقات رائگاں کرنے سے کیا حاصل جو کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو ان کے ذی علم ساتھیوں نے ان کو جواب دیا کہ مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ (الاعراف۔ ۷:۱۶۴) (یہ اس لیے کہ یہ تمہارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے)۔ یعنی ہمیں جدوجہد اس لیے جاری رکھنی چاہیے کہ ہمارے رب کے سامنے ہمارا عذر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ہمارا جو فرض تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوم کی اصلاح سے متعلق جو ذمہ داری اس کے صالح افراد پر عائد ہوتی ہے وہ کوئی سرسری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ جان کی بازی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے

ہاں بری الذمہ وہی لوگ قرار پائیں گے جو زندگی کے آخری لمحات تک تمام خطرات سے بے پروا ہو کر یہ بازی کھیلیں گے۔

ایک ضروری تنبیہ

آخر میں ایک تنبیہ بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اگر انسان خوف اور رجا میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم نہ رکھ سکے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو وہ استوار نہیں رکھ سکتا۔ ضروری ہے کہ یہ دونوں چیزیں نہایت تناسب کے ساتھ اس کے اندر موجود ہوں۔ قرآن مجید نے ان دونوں کو برابر کی نسبت کے ساتھ ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (الاعراف۔ ۷:۵۶)

اور اس کو پکارو بیم و رجا دونوں حالتوں میں۔

یہ مایوسی انسان کو شیطان کے لیے نہایت آسان شکار بنا دیتی ہے۔ وہ اس کو بھٹکا کر دوسرے پر ڈال دیتا ہے اور وہ شرک کے جال میں پھنس کر تباہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر اس پر رجائیت کا زیادہ استیلاء ہو جائے تو اس سے وہ اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے جس میں یہود مبتلا ہو گئے کہ وہ جرائم پر جرائم کرتے چلے جاتے اور سمجھتے کہ سَيُغْفَرُ لَنَا (الاعراف۔ ۷:۱۶۹) (ہمارے لیے سب معاف کر دیا جائے گا۔) یعنی ہم خدا کے برگزیدوں کی اولاد ہیں، جس طرح اب تک اس نے درگزر فرمایا ہے اسی طرح آئندہ بھی درگزر فرمائے گا۔ اسی رجائیت کے بطن سے مرجئیت بھی پیدا ہوتی ہے، جو اس دور کا عام دین ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مغفرت حاصل کرنے کے لیے چند باتوں کا زبانی اقرار کافی ہے۔ اعمال کی اہمیت ان کے نزدیک اول تو کچھ ہے نہیں اور اگر ہے بھی تو بہرحال اتنی نہیں ہے کہ ان کے اوپر نجات کا انحصار ہو۔

باب ۲۷

حیا

ایمان کے تقاضوں میں سے جس طرح خوف اور محبت ہیں، جن کی تفصیل پچھلے ابواب میں گزر چکی ہے، اسی طرح اس کے بدیہی تقاضوں میں سے حیا بھی ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

الحیاء شعبۃ من الایمان. (صحیح مسلم: کتاب الایمان باب ۱۲)
حیا ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔

یہاں حیا سے ہماری مراد وہ حیا نہیں ہے جو فطری تقاضوں کے تحت ہم آپس میں ایک دوسرے سے بعض معاملات میں کرتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ حیا ہے جو ایک بندہ اپنے رب سے کرتا ہے۔ یہی اس حیا کا بھی اصل منبع ہے جو ہم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ اگر یہ حیا ہمارے اندر سے مٹ جائے تو وہ حیا بھی بالآخر مٹ کر رہتی ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں حسن و جمال پیدا کرتی ہے اور اگر الف و عادات کے تحت ظاہر میں اس کے کچھ آثار باقی رہتے ہیں بھی تو اس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے وہ کسی بادِ مخالف کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ معمولی جھٹکا بھی اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں خدا سے نا آشنا معاشروں کی بے حیائی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ تہذیب و تمدن کے ادعاء کے باوجود، ان کی پارلیمنٹیں ایسے گھناؤنے جرائم کو قانونی جواز کی سند دے رہی ہیں جن کا کل تک شریف لوگ

تصور نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ان کی حیا کا تعلق اصل منبع سے نہیں تھا، بلکہ اس کی بنیاد مجرد رسوم و روایات پر تھی۔ اس وجہ سے رجحانِ عام کی تبدیلی کا مقابلہ وہ نہ کر سکی، بلکہ بدلتے ہوئے حالات سے اس کو شکست کھانی پڑی۔ غالباً یہی مطلب ہے اس حکیمانہ قول کا جس کو نبی کریم ﷺ نے سابق انبیائے کرام کی وراثت قرار دیا ہے۔ یعنی:

اذا لم تستحی فاصنعْ ما شئت. (صحیح البخاری: کتاب الانبیاء باب ۵۲)
یعنی جب تم میں خدا کی شرم باقی نہیں رہی تو جو چاہو کرو۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی شرم ہی انسان کو برائیوں سے بچانے والی ہے۔ جب یہ شرم اٹھ گئی تو کوئی برائی بھی انسان سے بعید نہیں رہی۔

یہ حیا انسان کی زندگی پر گوناگوں پہلوؤں سے اثر انداز ہوتی اور اس کو شیطان کے فتنوں سے بچاتی ہے۔ اس کی اس ہمہ گیری کی طرف نبی کریم ﷺ نے یوں اشارہ فرمایا ہے۔ سنن ترمذی میں مرفوعاً روایت ہے:

عن عبداللّٰہ بن مسعود قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: استحیوا من اللّٰہ حق الحیاء. قال: قلنا: یا رسول اللّٰہ! انا نستحی والحمدللّٰہ. قال: لیس ذاک، ولکن الاستحیاء من اللّٰہ حق الحیاء ان تحفظ الرأس وما وعی، والبطن وما حوی ولتذکر الموت والبلی. ومن اراد الآخرۃ ترک الدنیا. فمن فعل ذالک فقد استحیٰ من اللّٰہ حق الحیاء.
(سنن الترمذی: کتاب صفۃ القیامۃ باب ۲۴)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح شرم کرو جس طرح اس سے شرم کرنے کا حق ہے۔ لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم شرماتے تو ہیں، اللہ کا شکر ہے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ وہ چیز نہیں ہے۔ جو اللہ سے اس طرح شرمائے جس طرح اس سے شرمانے کا حق ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے دماغ کا اور جو کچھ وہ اس میں جمع کرتا ہے اس کا خیال رکھے، اپنے پیٹ کا اور جو کچھ اس میں بھرتا ہے اس پر نگاہ رکھے، اپنی موت کو اور اس کے بعد سڑنے اور گلنے کو یاد رکھے۔ اور جو آخرت کا

طالب ہوتا ہے وہ دنیا کی زینتوں کو خیر باد کہتا ہے۔ تو جس نے یہ کام کیے درحقیقت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے اسی طرح شرماتا ہے جس طرح اس سے شرمانے کا حق ہے۔

حیا کے اصل عوامل

اللہ تعالیٰ سے حیا پیدا کرنے میں اصل عامل کی حیثیت اس کی صفات کو ہے۔ جو بندہ اس کی صفتوں کو اچھی طرح جانتا اور ان پر مضبوط ایمان اور ایمان کا استحضار رکھتا ہے وہی اس سے صحیح معنوں میں شرماتا ہے۔ جو اس کی صفتوں سے بے خبر ہیں یا ان کی یادداشت کے لیے وہ اہتمام نہیں کرتے جو کرنا چاہیے ان کے اندر نہ خدا سے کسی شرم کا احساس ہوتا ہے نہ بندوں سے۔ ان کی مثال حیوانات کی ہے جو شرم کے احساس سے یک قلم عاری ہیں۔

یہ مسئلہ دقیق ہے، اس وجہ سے ہم چند مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کی کن صفات کا استحضار آدمی کے اندر اس سے حیا پیدا کرتا ہے اور ان کی اثر انگیزی کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

صفاتِ الٰہی میں سے سب سے زیادہ مؤثر صفات، جو انسان کے اندر خدا سے حیا کے شعور کو بیدار کرتی ہیں، وہ اس کے احاطہ علم کی صفات ہیں۔ جو بندہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر قول و فعل کی نگرانی کر رہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا. (النساء ۔۴:۱) (بے شک اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔) جس کو اس حقیقت کا علم ہے کہ وہ نگاہوں کی خیانتوں اور سینے کے ہر راز سے باخبر ہے: يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (المؤمن ۔۴۰:۱۹) (وہ نگاہوں کی چوری بھی جانتا ہے اور ان بھیدوں کی بھی جو سینے چھپائے ہوئے ہیں)۔ جو اچھی طرح جانتا ہے کہ آدمی جہاں کہیں بھی ہو اللہ تعالیٰ ہر جگہ اس کے ساتھ ہے، محفوظ سے محفوظ خلوت خانوں میں بھی کوئی سرگوشی ہو رہی ہو تو وہ وہاں بھی موجود ہوتا ہے: مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا. (المجادلہ ۔۵۸:۷) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین کے درمیان مگر ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور نہ

پانچ کے مابین مگر چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ کی مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی ہوں)۔

جس کو اس حقیقت کا علم ہے کہ وہ نگاہوں کی خیانتوں اور سینے کے ہر راز سے باخبر ہے: يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (المؤمن ۔۴۰:۱۹) (وہ نگاہوں کی چوری بھی جانتا ہے اور ان بھیدوں کی بھی جو سینے چھپائے ہوئے ہیں)۔ جو اچھی طرح جانتا ہے کہ آدمی جہاں کہیں بھی ہو اللہ تعالیٰ ہر جگہ اس کے ساتھ ہے، محفوظ سے محفوظ خلوت خانوں میں بھی کوئی سرگوشی ہو رہی ہو تو وہ وہاں بھی موجود ہوتا ہے: مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا (المجادلہ ۔۵۸:۷) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین کے درمیان مگر ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور نہ پانچ کے مابین مگر چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ کی مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی ہوں)۔

ان باتوں پر ایمان رکھنے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی مخفی سے مخفی گوشے میں بھی وہ کسی ایسی بات کا ارتکاب کر سکے جو اس کے رب کے سامنے اس کو شرمندہ کرنے والی ہو۔ وہ کسی ایسے مقام کا تصور نہیں کر سکتا جہاں اس کو خدا نہ دیکھ سکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ جہاں بھی کوئی گناہ کرے گا عین اپنے رب کے سامنے کرے گا۔ یہ جسارت ظاہر ہے کہ کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو انتہائی بے شرم یا انتہائی بے خوف ہو۔ اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں سورہ قیامہ میں فرمایا ہے:

> بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ. (القیمہ ۔۷۵:۵)
> بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ عین اللہ کے سامنے شرارت کرے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت غیور ہے۔ قدیم صحیفوں میں یہ صفت بار بار اللہ تعالیٰ کے لیے آئی ہے۔ اس کا تقاضا یہ بیان ہوا ہے کہ خداوند خدا، تمہارا خدا غیور ہے۔ جس طرح تم یہ گوارا نہیں کرتے کہ تمہاری بیوی غیر کی بغل میں سوئے اسی طرح وہ بھی یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کا بندہ کسی غیر کی عبادت کرے۔ ہمارے نزدیک یہی مضمون ذرا مختلف الفاظ میں

آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے:

> یاامۃ محمد! مامن احد اغیر من اللہ ان یزنی عبدہ او تزنی امتہ.
> (صحیح البخاری: کتاب الکسوف باب ۲)
> اے امت محمد! خدا کی قسم! اس معاملہ میں کوئی اللہ تعالیٰ سے زیادہ غیور نہیں ہے کہ اس کا بندہ زنا کا مرتکب ہو یا اس کی کوئی بندی زنا کرائے۔

قدیم صحیفوں اور قران مجید میں زنا اور شرک، دونوں کو بالکل مماثل جرم قرار دیا گیا ہے اس وجہ سے ہمیں خیال ہوتا ہے کہ اس حدیث میں لفظ زنا اپنے حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان دونوں کی مشابہت پر ہم نے تفسیر تدبر قرآن میں بحث کی ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفت متکبر درحقیقت صفت غیور کی ایک جامع تعبیر ہے۔

اس کا تیسرا نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ اس دنیا میں اپنے رب کی جو شانیں اور عظمتیں ہم ہر وقت دیکھتے ہیں ان کے دیکھتے ہمیں اپنے بارے میں یہ خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم بہت بڑی چیز ہیں۔ جس زمین پر ہم چلتے ہیں اس کی وسعتوں کا حال یہ ہے کہ اس کے اندر ہماری حیثیت ایک چیونٹی اور ایک مکھی سے زیادہ نہیں ہے۔ جن پہاڑوں کے نیچے ہم رہتے ہیں ان کی بلندی آسمانوں کو چھوتی ہے اور ہم ان کے آگے ایک ذرۂ ناچیز کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ جن سمندروں سے ہم گھرے ہوئے ہیں ان کے مقابل میں ہمارا وجود ایک قطرے کے برابر بھی نہیں۔ اس ماحول میں اگر ہم اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ کر اپنے اوپر فخر کرنے لگ جائیں اور اس زمین پر اترا کر چلیں تو اس کی مثال ایسی ہی ہوگی کہ کوئی چیونٹی غرور میں مبتلا ہو کر زمین پر پاؤں مار کر چلے۔ ایک قصہ ہے کہ کوئی مکھی ایک بیل کے سینگ پر جا بیٹھی۔ بیل کو بھلا اس کا کیا احساس ہوتا۔ لیکن مکھی اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ رہی تھی، اس وجہ سے اس نے کچھ دیر کے بعد نہایت بزرگانہ انداز میں بیل سے پوچھا کہ اگر تمہاری گردن میرے بوجھ سے ٹوٹی جا رہی ہو تو میں یہاں سے اڑ جاؤں؟ بیل نے اس کو جواب دیا کہ آپ شوق سے تشریف رکھو، مجھے تو اب خبر ہوئی ہے کہ آپ میرے سینگ پر تشریف فرما ہیں! اسی روایتی مکھی کی طرح بہت سے لوگ اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ بیٹھتے ہیں، جس سے ان کی چال میں ایک شان کبریائی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ چلتے ہیں تو زمین

پر پاؤں دھمکتے ہوئے چلتے ہیں۔ گردن ٹیڑھی اور اونچی رکھتے ہیں۔ بولتے ہیں تو کرخت لب ولہجہ میں بولتے ہیں۔ اس طرح کے برخود غلط لوگوں کے اندر احساس شرم پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو آگاہ فرمایا ہے کہ:

> وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا (بنی اسرائیل۔ ۱۷: ۳۷)
> اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کے طول کو پہنچ سکتے ہو۔

مطلب یہ ہوا کہ جب تم خدا کی یہ عظیم شانیں اور قدرتیں دیکھتے ہو جن کے آگے تم ایک ذرۂ ناچیز ہو تو تمہیں اس کی زمین میں سر اونچا کرنے سے شرمانا چاہیے۔ ایاز قدر خود بشناس!

اس احساس شرم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کو یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کے پاس جتنی قوتیں اور صلاحیتیں اور جتنے اسباب و وسائل ہیں، سب اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے ہیں۔ ان میں سے نہ کسی چیز کا وہ خالق ہے اور نہ خدا کی عنایت کے بغیر ان کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اگر یہ حقیقت برابر اس کے پیش نظر رہے تو لازماً یہ شرم بھی برابر دامن گیر رہے گی کہ کوئی ناشکری یا نافرمانی یا سرکشی اس سے صادر ہوئی تو لازماً وہ انہی قوتوں یا صلاحیتوں اور انہی اسباب و وسائل کے ذریعہ ہوگی جو خدا کے بخشے ہوئے ہیں۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں اس کو اس لیے بخشیں کہ وہ اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بن کر زندگی گزارے وہ اس نے اس سے بغاوت اور غداری کے لیے استعمال کیں۔ گویا غلام نے آقا کے بخشے ہوئے آلات و ادوات سے آقا ہی کے گھر میں نقب لگائی۔ نعمتوں کے شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے شرمساری کا یہ احساس ایک امر فطری ہے۔ جس کے اندر یہ احساس نہ ہو وہ ایک کمینہ اور لئیم انسان ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اتنی کثرت سے توجہ دلائی ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعض لوگ اپنے دینداری کے کاموں کو بڑی اہمیت دے بیٹھتے ہیں اور اپنے زعم میں وہ اللہ اور رسول کے محسن بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی

جو اپنے رب کے حضور میں کوئی پیش کرتا ہے کیا اس کی اپنی ہوتی ہے؟ اگر اس نے اپنا سارا مال خدا کی راہ میں لٹا دیا تو یہ مال خدا ہی کا دیا ہوا تھا۔ اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ اس نے اپنی صلاحیت و قابلیت سے حاصل کیا تھا تو اسے یہ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ صلاحیت و قابلیت بھی کوئی اپنے گھر سے نہیں لاتا، بلکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی بخشتا ہے۔ مال تو در کنار اگر کوئی شخص اپنی جان بھی، جس سے بڑی انسان کے پاس کوئی اور چیز نہیں ہے اللہ کی راہ میں قربان کر دے تو اس پر بھی فخر کے بجائے اعتراف تقصیر ہی کرنا چاہیے کہ:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہی اعتراف تقصیر و خجالت بندے کا اصلی سرمایہ اور یہی تمام عبادت و اطاعت کی روح ہے۔
قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارات ہیں اور بعض عارفوں نے بھی اس کا اظہار کیا ہے۔
قرآن مجید میں منافقین کے متعلق بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ اور رسول کا محسن سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام لائے ہیں۔ ان کو پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے جواب دلوایا گیا ہے کہ تم میرے اوپر احسان نہ جتاؤ کہ تم اسلام لائے، بلکہ یہ تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے تمہاری رہنمائی اسلام کی طرف فرمائی۔

اس خصلت کی تربیت کا طریقہ

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ جب اس حیا کی دین میں یہ عظمت و اہمیت ہے تو اپنے اندر اس کے پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس کا جواب ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ اس کی تربیت میں اصلی عامل کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی صفات کو حاصل ہے۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ جو شخص اس صفت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہے وہ اپنے دل و دماغ کے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کو برابر مستحضر رکھنے کی ممارست کرے۔ یہ کام نہایت دقیق اور مشکل ہے، اس لیے کہ ان صفات کا استحضار پورے شعور کے ساتھ مطلوب ہے۔ صرف اتنی چیز اس مقصد کے لیے کافی نہیں

ہوگی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو یاد کر چھوڑیں اور خاص خاص اوقات میں ان کا ورد کر لیا کریں۔ ثواب کے پہلو سے چاہے اس کی کچھ اہمیت ہو لیکن پیش نظر مقصد کے لیے یہ چیز بے سود ہوگی۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ان اسمائے حسنیٰ کا جو عکس انسان کی زندگی پر پڑنا چاہیے وہ عکس ہر زاویہ سے پڑے۔ تزکیہ کے نصب العین کے لیے اصلی مطلوب شے یہی ہے اور یہ چیز قرآن و حدیث کے تدبر کے سوا اور کسی راہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا ربط انسان کی زندگی کے ساتھ پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے ان کا عمیق مطالعہ اس مقصد کے لیے ضروری ہے۔

اگر اس جہاد کا حوصلہ کوئی شخص نہ کر سکتا ہو تو پھر ادنیٰ درجے میں وہ یہ طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہے کہ ان لوگوں کی معیت و رفاقت تلاش کرے جو اس صفت کے حامل ہوں۔ اچھی صحبت بڑی نعمت ہے بشرطیکہ حاصل ہو سکے اور اگر حاصل ہو جائے تو آدمی اس کو نباہ سکے۔ اگرچہ ایسی صحبت کا حصول کچھ مشکل نہیں ہے لیکن حق کے طالبوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا۔ اس وعدے پر اعتماد کر کے جو شخص پورے عزم و خلوص کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوگا، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی خضر راہ سے ملا دے گا:

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت۔۲۹:۶۹)
اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔

یہ صفت ایک بڑی گراں بہا متاع ہے۔ اس کی شان میں حدیث نبوی ہے کہ:

فاستحیٰ فاستحی اللّٰہ منہ. (صحیح مسلم: کتاب السلام باب ۱۰)
پس وہ اللہ سے شرمایا تو اللہ بھی اس سے شرمایا۔

حضور ﷺ کے اس ارشاد کے معانی و حقائق پر علماء نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن تمام موشگافیوں سے صرف نظر کر کے اگر اس کا مطلب صرف اتنا ہی لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ایسے بندے کی دعاؤں کو رد کرنے سے شرماتا ہے تو یہی اتنی بڑی دولت ہے کہ اس کے حاصل کرنے کے لیے اگر انسان اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے تو یہ اس کی سب سے بڑی خوش بختی ہوگی۔

باب ۲۸

وفا

حیا کی طرح وفا بھی ایمان کے لازمی اور بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ وفا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اپنے رب سے جو عہد و میثاق کیے ہیں وہ پوری راستبازی کے ساتھ پورے کریں۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق دو مضبوط میثاقوں پر قائم ہے۔ ایک وہ میثاق ہے جو اس نے ہمارے پیدا کرنے سے پہلے ہماری ارواح سے لیا ہے اور جس کا ذکر سورہ اعراف میں ہوا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ O (الاعراف۔ ۷:۱۷۲)

اور (یاد کرو) جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے — ان کی پیٹھوں سے — ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے: ہاں! تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔

عہدِ فطرت

یہی وہ عہد ہے، جس کو قرآن حکیم نے عہدِ فطرت سے بھی تعبیر فرمایا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ (الروم۔ ۳۰:۳۰)
اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔

اس عہد میں جس طرح توحید کا اقرار شامل ہے اسی طرح تمام بنیادی نیکیوں کے نیکی اور تمام بڑی برائیوں کے برائی ہونے کا شعور بھی شامل ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے خود انسان کے نفس کو اس کے اوپر ایک حجت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورہ شمس میں فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا O فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا O قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا O وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا O (الشمس۔ ۹۱:۱۰)
اور شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا! پس اس کو سجھا دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

اسی عہدِ فطرت کی بنا پر ہر سلیم الحواس انسان توحید اور بنیادی نیکیوں اور بدیوں سے متعلق، قیامت کے دن، مسئول ہوگا، خواہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے ہر انسان پر حجت تمام کر دی ہے۔ جس کے بعد کوئی شخص، جیسا کہ سورہ اعراف کی مذکورہ بالا آیت سے واضح ہے، یہ نہیں کہہ سکتا کہ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ (الاعراف۔ ۷:۱۷۲) (ہم تو ان باتوں سے بے خبر ہی رہے)۔

قرآن مجید کے نزدیک اس عہدِ فطرت کا اذعان و یقین انسان کے اندر اتنا محکم ہے کہ کوئی شخص اپنے رب کی کوئی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عین اس کے سامنے اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ قیامہ میں فرمایا ہے:

بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ (القیمۃ۔ ۷۵:۵)
(بلکہ انسان چاہتا ہے کہ عین اپنے رب کے سامنے اس کی نافرمانی کرے)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کا اپنا ضمیر خدائی کوتوال کی حیثیت سے اس کو عہدِ فطرت کی یاددہانی کراتا رہتا ہے اور خود اپنے ضمیر کی یہ تنبیہ کوئی دوسرا سنتا ہو یا نہ سنتا ہو، لیکن آدمی خود اس کے سننے سے قاصر نہیں رہتا، اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ○ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (القیمۃ ۔۷۵:۱۴۔۱۵)

(بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگر چہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

اگر چہ ایک بہانہ باز یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کو نہ تو اس طرح کا کوئی عہد ہی یاد ہے اور نہ وہ اپنے اندر اس طرح کی کوئی خلش ہی محسوس کرتا، جس کو ضمیر سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن آدمی سے اپنا باطن پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ایک نفس لوامہ چھپا ہوا ہے جو اس کو اس کی ہر خلاف ضمیر حرکت پر اس وقت تک سرزنش کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے اس کی زبان بالکل ہی بند نہ کر دے۔

باطن کی یہ آواز کسی خارجی دلیل وشہادت کی محتاج نہیں ہوتی ہے۔ اس کی دلیل وشہادت خود اس کے اندر ہی ہوتی ہے۔ خارج کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی اس سے زیادہ واضح نہیں ہے کہ اس سے اس پر دلیل قائم کی جا سکے۔ اس کی دلیل بس یہ ہے کہ انسان اس کو اپنے اندر پا رہا ہے اور ایسے تواتر وتسلسل اور ایسی وضاحت وقطعیت کے ساتھ پا رہا ہے کہ اس کی کسی طرح بھی تکذیب نہیں کر سکتا الا آنکہ وہ ہٹ دھرمی سے کام لے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مشہور فلسفی کانٹ نے اس اندرونی آواز (INNER VIOCE) کو فلسفہ ومنطق کے طریق احتجاج واستدلال کی گرفت سے بالکل بالاتر قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی یہ بات نہایت گہری حکمت پر مبنی ہے۔

یہ بات کہ انسان بدی کے بدی ہونے اور نیکی کے نیکی ہونے سے از روئے فطرت واقف ہے یوں بھی ثابت ہے کہ اگر چہ وہ خود دوسروں کے ساتھ بدی کرتا ہے، لیکن وہی بدی اگر دوسرا اس کے ساتھ کرے تو اس کو ظلم وناانصافی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ نیکی اور بدی کے شعور سے عاری نہیں ہے، لیکن خود فریبی کے سبب سے اپنے لیے تو دوسروں سے وہ نیکی چاہتا ہے، لیکن دوسروں کے ساتھ بدی کی آزادی کا بھی خواہاں ہے۔ سورہ مطففین میں قرآن مجید نے اس کی اس کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○ (المطففین ۔۸۳:۱۔۳)

برا ہو، ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا! جو دوسروں سے نپوائیں تو پورا نپوائیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں۔

میثاقِ شریعت

اگر چہ انسان پر حجت قائم کرنے اور اس کو مستوجب جزاوسزا قرار دینے کے لیے یہ عہد فطرت بھی کافی تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر مزید یہ فضل فرمایا کہ اپنے نبی اور رسول بھیج کر اور اپنی شریعت نازل کر کے اس عہد فطرت کو بالکل واضح اور مبرہن اور ہر پہلو سے جامع ومکمل بھی کر دیا کہ کسی گمراہی میں پڑنے کے لیے کوئی رخنہ باقی نہ رہے تاکہ جو ہلاک ہو وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندگی اختیار کرے وہ بھی دلیل کے ساتھ اختیار کرے:

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ط (الانفال ۔۸:۴۲)

تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شریعت انسان کے لیے کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ عہد فطرت کے اوپر ایک دوسرا میثاق ہے جس نے سابق میثاق کو مزید مؤکد وموثق کر دیا ہے، جس سے گمراہی کی ہر راہ مسدود ہو گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں کہیے کہ شریعت کی حیثیت انسان کے لیے تاریکی کے اوپر روشنی کی نہیں، بلکہ روشنی کے اوپر روشنی کی ہے، جیسا کہ سورہ نور میں ارشاد ہے: نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ (النور ۔۲۴:۳۵) (روشنی کے اوپر روشنی!) اس سے انسان کا باطن اور ظاہر، دونوں جگمگا اٹھتے ہیں۔ اس کی تمثیل قرآن مجید میں یوں بیان ہوئی ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ لا يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط

(النور ۔۲۴:۳۵)

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ دل کے اندر اس کے نورِ ایمان کی تمثیل یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو۔ چراغ ایک ایسے شاداب درخت زیتون کے روغن سے جلایا جاتا ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔ روشنی کے اوپر روشنی!

شریعت کے عہد میثاق ہونے کا ذکر قرآن مجید میں اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنا تحصیل حاصل ہے۔ بعض عظیم سورتوں کا تو موضوع ہی میثاق کی عظمت و اہمیت اور اس کی ذمہ داریوں کی توضیح و تفصیل ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس میثاق کی پابندی ہی پر بندوں کی دنیا اور آخرت، دونوں کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس میثاق میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے حقوق اور فرائض، دونوں تفصیل سے بیان کر دیے ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ بندے اپنے فرائض اگر وفاداری سے پورے کریں گے تو لازماً وہ اپنے حقوق اپنے اللہ تعالیٰ سے حاصل کریں گے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو اس بے وفائی کی سزا اس عالم میں بھی بھگتیں گے اور آخرت میں بھی۔

سورہ مائدہ میں اس میثاق کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (المائدۃ۔۵:۷)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔

اس آیت میں نِعْمَةَ اللّٰهِ سے مراد شریعت الٰہی ہے، جو سب سے بڑے فضل کی حیثیت سے اس امت کو حاصل ہوئی اور مِيْثَاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو اس شریعت پر پوری راستبازی اور کامل وفاداری سے عمل کرنے اور عمل کرانے کا لیا گیا اور پوری امت نے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہہ کر اس عہد کی پابندی کا اقرار کیا۔ اگرچہ یہ اقرار اول اول امت کے ہراول دستے یعنی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہی نے کیا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی مخاطب

وہی تھے، لیکن ہم بھی اس عہد و اقرار میں برابر کے شریک ہیں اگر ہم ان مقدس اسلاف کے خلف ہونے کے مدعی ہیں اور اس شرف سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

وفاداری بشرطِ استواری

اس دوہرے میثاق کی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ یہ بڑے جان جوکھم کا کام ہے۔ اس میں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہیں، جن سے صرف وہی عہدہ برآ ہوتے ہیں جن کو توفیقِ الٰہی کا بدرقہ حاصل ہو۔ اس میثاق کا صحیح صحیح حق ادا کرنے کے لیے اس حقیقت کو ہر وقت مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ یہ حق صرف چند رسوم ادا کر دینے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ پوری صداقت اور پوری عزیمت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کی تعمیل اس کی شرطِ اول ہے اگرچہ اس راہ میں جان و مال اور کنبہ و خاندان، ہر چیز کو قربان کر دینا پڑے۔ ہم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جن قوموں سے میثاق لیا جب انہوں نے محض شریعت کے چند رسوم ادا کر کے اس کے وفاداروں میں نام لکھوانے کی کوشش کی تو اس نے ان کو ٹھکرا دیا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام نہاد مدعیانِ وفاداری کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ، دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ۔۲:۱۷۷)

خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کر لو، بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدقِ دل سے ایمان لائیں اور اپنے مال اس کی محبت کے باوجود، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ،

تکالیف جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔

آیت کی تفسیر

اس آیت نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری کے تمام تقاضے پوری وضاحت سے بیان کر دیے ہیں۔ اس وجہ سے ہم اس کے بعض اہم اجزاء کی شرح کر کے ان کا مفہوم اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں تاکہ اوپر ہم نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ہر بات، قرآن کی روشنی میں، مبرہن ہو جائے۔

اس آیت میں لفظ بِر جو آیا ہے اس کا ترجمہ عام طور پر ہمارے مترجم نیکی کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس لفظ کا ادھورا ترجمہ ہے، جس سے اس کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ قرآن اور کلام عرب میں اس لفظ کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم وفاداری ہے۔ ہم نے اپنی تفسیر — تدبر قرآن — میں اس کی تحقیق بیان کی ہے۔ اس مادہ سے لفظ بَرٌّ بھی ہے۔ جس کے معنی وفاشعار اور فرمانبردار کے ہیں۔ مثلاً بَرٌّ بِوالدیہ اس بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا نہایت وفادار اور ان کے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ اسی طرح بَرٌّ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو عہد و پیمان اور جو وعدے کیے ہیں وہ سب ایک دن لازماً پورے کرنے والا ہے۔

اس روشنی میں لَیْسَ الْبِرَّ ... هُمُ الْمُتَّقُوْنَ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا حق صرف اتنے سے ادا نہیں ہو جاتا کہ رخ مشرق کی طرف کر لیا۔ یہ تو محض دین کے ظواہر ہیں۔ اصل وفاداری اور دینداری تو ان لوگوں کی ہے جو اللہ پر، روز جزا و سزا پر، فرشتوں پر اور کتاب الٰہی پر سچا اور پکا ایمان لائیں اور ساتھ ہی قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے اپنے مال خرچ کریں۔

یہ بات، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے فرمائی گئی ہے جن کے ہاں ایک خاص دور میں یہ بحث کہ قبلہ مشرق کی طرف ھے یا مغرب کی

طرف اس زور شور سے چھڑی ہوئی تھی کہ گویا تمام دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے درآنحالیکہ دین کی بنیادی باتوں یعنی ایمان کے تقاضوں اور اس کے عملی مطالبات کا کسی کو بھی احساس نہیں تھا۔ ان کو مخاطب کر کے تنبیہ فرمائی گئی کہ نادانو! ان ظاہری رسم داریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ خدا کا حق ادا کرنے والے وہ لوگ بنیں گے جو ایمان کے حقیقی عقائد اور عملی تقاضے پورے کرنے والے ثابت ہوں گے۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے، جس طرح کی تنبیہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے یہود کو فرمائی کہ:

> تم پیالے اور رکابی کو اوپر سے تو صاف کرتے ہو لیکن تمہارے اندر لوٹ اور بدی بھری ہے O (انجیل لوقا: باب ۱۱: ۳۹)

یہاں یہ بات نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ ایمان کے عملی تقاضوں میں سے سب سے پہلے انفاق کا ذکر آیا ہے حالانکہ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ ایمان کے بعد وہ بالعموم نماز کا ذکر کرتا ہے، لیکن یہاں نماز کا ذکر مؤخر ہو گیا ہے۔ پھر مزید قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایتائے مال کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر الگ ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالیٰ کا حق صرف زکوٰۃ ہی نہیں، بلکہ اس کے علاوہ بھی ہے اور وفاداری کا مقام حاصل کرنے کے لیے اس کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ پہلو خاص اہمیت رکھنے والے ہیں اس وجہ سے ہم بالاختصار ان کی وضاحت کی کوشش کریں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہاں ایتائے مال کا ذکر اقامت صلوٰۃ پر مقدم ہے جو بظاہر قرآن مجید کے معروف اسلوب کے خلاف ہے۔ لیکن اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ مومن کو اللہ تعالیٰ کی کامل وفاداری کا مرتبہ و مقام کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ اس کا واحد جواب، قرآن کی روشنی میں، یہی ہے کہ یہ مرتبہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں محبوب مال کے انفاق سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں ارشاد ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (آل عمران۔ ۳: ۹۲) (تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو)۔ بالکل یہی بات یہاں وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى

خُبِّہٖ کے الفاظ سے فرمائی ہے۔ یعنی وہ اپنے مال، ان کے محبوب ہونے کے باوجود، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ مال کے محبوب ہونے کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ مال بجائے خود اعلیٰ اور قیمتی ہو، دوسرا یہ کہ زمانہ ایسا ہو کہ اس میں وہ مال کمیاب ہو، مثلاً زمانہ قحط یا گرانی کا ہو، تیسرا یہ کہ آدمی کو خود اس مال کی احتیاج ہو، لیکن وہ اپنی ضرورت پر اللہ کے دوسرے بندوں کی ضرورت کو ترجیح دے۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر۔۵۹:۹) (اور وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں خود احتیاج ہو)۔ یہاں عَلٰی حُبِّہٖ کے الفاظ ان تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

رہا دوسرا سوال کہ کیا زکوٰۃ کے علاوہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالیٰ کے کچھ اور حقوق بھی ہیں جن کا ادا کرنا مرتبۂ بر ووفا حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ مسلمان کے مال میں سے وہ کم سے کم مطالبہ ہے، جس کا پورا کرنا اسلامی حکومت کی گرفت سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ مطالبہ پورا کر دینے کے بعد حکومت اس سے کوئی تعرض نہیں کرے گی، لیکن اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے صرف زکوٰۃ کا نہیں ہے بلکہ انفاق کا ہے، جو سراً بھی ہو اور علانیۃً بھی۔ اقراض کا مطلب یہ ہے کہ اگر ملت کو کوئی ناگہانی ضرورت یا حالت جنگ یا قحط یا کوئی آفت کے باعث کوئی ناگزیر حاجت پیش آ جائے تو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ذمہ قرض کی حیثیت سے قبول فرمائے گا اور قیامت میں اس کو ایک عظیم خزانہ کی صورت میں واپس کرے گا، بشرطیکہ یہ قرض، قرضِ حسن ہو۔ اس انفاق کی آخری حد مقرر فرما دی ہے کہ اس طرح کے حالات میں آدمی اپنے اور اپنے بیوی بچوں کی ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔ قُلِ الْعَفْوَ میں عَفْوَ کی تفسیر ہمارے نزدیک یہی ہے۔ یہی انفاق ان لوگوں کے شایان شان ہے جو اللہ کے وفادار اور کامل العیار بندے بننا چاہتے ہیں اور قرآن مجید کے تدبر سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ یہی انفاق ہے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ انفاق کرنے والے کو حکمت کا خزانہ بخشتا ہے، جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ط (البقرۃ۔۲:۲۶۹)
اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔

اس آیت میں وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا کے الفاظ بھی خاص طور پر غور کرنے کے ہیں۔ اوپر کی باتیں تو فعل کے صیغوں میں بیان فرمائیں، لیکن ایفائے عہد کو صفت کے صیغہ سے بیان کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا حق ٹھیک ٹھیک وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کے اندر ایفائے عہد کی خصلت صفۃً موجود ہو۔ وہ جب کبھی کسی سے کوئی عہد کر بیٹھتے ہوں تو اس کے ایفاء کو اپنی فتوت کا لازمی تقاضا اور اپنی حمیت کا ایک واجبی مطالبہ سمجھتے ہوں۔ اس حقیقت کا اظہار اِذَا عٰهَدُوْا کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یعنی جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو قول مرداں جان دارد کے مصداق اس کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے عام وعدوں کے معاملہ میں جن کا کردار یہ ہو گا وہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کے معاملہ میں کبھی کسی کمزوری کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۔ اس ٹکڑے کا عطف ہے تو وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ ہی پر لیکن صفت صبر پر خاص طور پر زور دینے کے لیے اس کو حالت نصب میں کر دیا ہے، جس سے اس کے معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا کرنے والے خاص طور پر وہ لوگ ہوں گے جو فقر و فاقہ، جسمانی تکلیف اور جنگ کے مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے والے ہوں گے۔

یہی بات اس باب کی آخری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وفاداری بشرطِ استواری مطلوب ہے، جس کے بغیر ایمان، ایمان نہیں، بلکہ صریح نفاق ہے تو اس کے لیے سب سے بڑی شرط صبر یعنی عزیمت و استقامت ہی ٹھہرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو مخاطب کر کے سرزنش کی ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ تم ایمان کا دعویٰ کر کے اپنے کو اہل ایمان میں شمار کرا لو گے اور تمہارے جھوٹے اور سچے میں امتیاز کے لیے اللہ تعالیٰ تمہیں کسی امتحان میں نہیں ڈالے گا؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر مدعی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس کے ہاں شرف باریابی صرف انہی کو حاصل ہو گا جو ہر قسم کے امتحانوں سے گزر کر یہ ثابت کر دیں گے کہ انہوں نے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کا

جو عہد کیا ہے اس میں وہ بالکل سچے اور پکے ہیں۔ فرمایا کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا یہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے ہاں راستباز ٹھہریں گے اور وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ اور یہی لوگ ہیں جو اس کی نگاہوں میں حقیقی متقی ہیں۔

باب ۲۹

حمیّت، حمایت اور جہاد

ایمان کے لازمی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی کے اندر اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے لیے حمیّت، حمایت اور جہاد کا جذبہ ہو۔ یہی چیز اس کے ایمان کی صداقت کی شہادت ہے۔ اگر کسی کے اندر یہ جوہر نہ ہو اور وہ ایمان کا مدعی ہو تو اس کا دعویٰ معتبر نہیں ہے، بلکہ اغلب یہ ہے کہ ایسا شخص منافق ہے۔

اللہ تعالیٰ اگرچہ کسی کی حمیت وحمایت اور اس کی تائید ونصرت کا محتاج نہیں ہے، وہ اپنی ذات میں مستغنی اور سب سے بے نیاز ہے، لیکن اس نے اپنے دین کے معاملے میں یہ سنت ٹھہرائی ہے کہ بندوں کے دلوں میں وہ اس کو زبردستی نہیں اتارتا، بلکہ اس کے ردوقبول کو اس نے کلیتہً ان کے انتخاب واختیار پر چھوڑا ہے۔ اگر وہ اپنی پسند سے اس کو اختیار کرنے اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے قربانیاں پیش کرتے ہیں تو ان کی اس قدر دانی کو قبول فرماتا اور ان کے دین کو دنیا اور آخرت، دونوں میں ان کے لیے مثمر بناتا ہے اور اگر وہ اس کو رد کردیتے ہیں یا اس کے مدعی تو بن بیٹھتے ہیں، لیکن اس کا حق ادا کرنے کا حوصلہ نہیں کرتے تو وہ ان کے لیے سبب خیر نہیں بنتا، بلکہ دنیا اور آخرت، دونوں میں موجب خسران ووبال بن جاتا ہے۔ اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں قرآن نے وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ط (البقرۃ ۲: ۹۱) (اور وہ خدا کا غضب لے کر لوٹے) کے الفاظ سے تعبیر فرمائی ہے۔ یعنی جس کے دروازے سے ان کو سب سے بڑی سرفرازی لے کر لوٹنا

تھا، وہاں سے وہ سب سے بڑا غضب لے کر لوٹے۔

دین کے ساتھ تعلق کی یہ نوعیت متقاضی ہوئی کہ آدمی کے اندر اسی کے لیے حمیت اور حمایت کا جذبہ اور اس کی سربلندی اور سرفرازی کا برابر زندہ رہنے والا ولولہ ہو۔ یہی حمیت و حمایت اور یہی ولولہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ہے جو اس کو، باوجود ہر چیز سے بے نیاز ہونے کے، بہت محبوب ہے اور وہ اپنے ان بندوں کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے جو اس متاعِ عزیز کا نذرانہ اس کے حضور میں سب سے بڑی مقدار میں پیش کرنے کا حوصلہ کرتے ہیں۔

حمیت، حمایت اور جہاد، یہ تینوں چیزیں بتدریج ایک دوسری سے ظہور میں آتی ہیں اور ان کے اندر باہم دگر نہایت گہرا معنوی تعلق ہے، اس وجہ سے ہم ان تینوں پر اس باب میں یک جا بحث کریں گے۔

حمیّت

ہر وہ شخص جس کے اندر فتوت، یعنی جس کی جوانی میں جوانمردی ہوگی لازماً اس کے اندر حمیت بھی ہوگی۔ حمیت کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص ظلم اور مظلومی، جبر اور مجبوری اور حق اور باطل کی کسی آویزش میں، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، بے تعلق، سرد مہر اور خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا، بلکہ وہ لازماً اپنی استطاعت کے حد تک، مظلوم اور کمزور کا ساتھ دے گا اور جابر و ظالم کا ہاتھ پکڑے گا اگرچہ اس میں خود اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ اگر کوئی شخص اس جذبہ سے عاری ہے تو وہ انسانیت سے عاری ہے۔ اس فتوت و حمیت کی بہترین مثالیں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہیں۔ انہوں نے ایک مظلوم اسرائیلی کو ایک قبطی کے ہاتھوں پٹتے دیکھا تو اس کو ایک پرایا جھگڑا سمجھ کر وہاں سے گزر نہیں گئے، بلکہ مظلوم کی حمایت کے لیے فوراً سینہ سپر ہو گئے۔ پھر جب وہ ظالم بالکل غیر ارادی طور پر ان کے گھونسے سے ڈھیر ہو گیا تو اس حادثہ پر ان کو نہایت افسوس ہوا اور انہوں نے صدقِ دل سے توبہ کی، اس لیے کہ ان کے پیشِ نظر صرف مظلوم کی حمایت تھی، ظالم کو قتل کر دینا نہیں تھا۔ حمیت اگر مجرد خاندانی اور نسلی عصبیت پر مبنی ہو تو وہ حق و

باطل کے امتیاز سے عاری ہوتی ہے، لیکن جو حمیت، حق کے منبع سے ظہور میں آتی ہے وہ کسی ادنیٰ تجاوز کو بھی گوارا نہیں کرتی اگرچہ وہ بلا ارادہ ہی واقع ہو گیا ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کا افسوس ہوا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس افسوس کو پسند کیا اور ان کی توبہ قبول فرمائی۔

اس طرح کا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دوسرے روز بھی پیش آیا۔ وہ شہر میں نکلے تو دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو پہلے روز کے واقعہ کا سبب ہوا تھا، آج ایک دوسرے قبطی سے الجھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر بھی ان کی حمیت میں حرکت پیدا ہوئی، لیکن اب کے اس کا رخ اور تھا۔ انہوں نے اندازہ فرما لیا کہ اگرچہ اسرائیلی ان کا بھائی ہے، لیکن وہ شر پسند اور دنگئی آدمی ہے۔ اس کو ڈانٹا اور آگے بڑھے کہ اس کو اس کے شر سے روکیں۔ اپنے بھائی کو اس کے غلط اقدام سے روکنا بھی درحقیقت اس کی مدد اور صحیح فتوت کا تقاضا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ ہمارے نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا: اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِماً اَوْ مَظْلُوْماً۔ (سنن الترمذی: کتاب الفتن باب ۶۸) (اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظلم کر رہا ہو یا مظلوم ہو)۔ کسی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! اگر مظلوم ہو تب تو اس کی مدد بجا ہے، لیکن اگر وہ ظلم کر رہا ہو تو تب اس کی مدد کس طرح کی جائے؟ ارشاد ہوا کہ اس کو اس ظلم سے روکو، یہی اس کی مدد ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر اس دوسری شکل میں اپنے بھائی کی مدد کرنی چاہی، لیکن اسرائیلی نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو مجرم ٹھہراتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں تو اس کو ڈر ہوا کہ کہیں ان کا بے پناہ گھونسا آج اس پر نہ پڑ جائے۔ یہ خیال کر کے وہ چلایا: معلوم ہوتا ہے کہ کل تم نے جس طرح ایک قبطی کو قتل کیا ہے، اسی طرح آج مجھے ہلاک کر دینا چاہتے ہو! ساتھ ہی کمینوں کی طرح یہ طعنہ بھی دے دیا کہ تم بننا تو چاہتے ہو اصلاح کرنے والے، لیکن تمہاری یہ روش مفسدوں کی ہے۔ اسرائیلی کے اس کمینہ پن کے سبب قبطی کے قتل کا راز فاش ہوا اور فرعون کی حکومت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان کے درپے ہو گئی، جس کے نتیجہ میں آپ کو گھر در چھوڑنا پڑا۔

بظاہر دیکھیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمیت و فتوت ان کو بڑی مہنگی پڑی، اس لیے کہ اس کے نتیجہ میں انہیں ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن فتوت کی راہ میں یہ قربانی ایک معمولی قربانی ہے۔ اللہ

کے جن بندوں کو یہ توفیق ملتی ہے زندگی کی اصلی منزل درحقیقت انھی کو ملتی ہے اور اس کی راہ میں وہ سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔

اسی طرح کا امتحان حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین پہنچ کر پیش آیا۔ وہاں وہ مدین کے کنویں پر بیٹھ گئے۔ کچھ نہیں پتا کہ اب کہاں جائیں اور کس سے منزل کا نشان معلوم کریں؟ ایسی صورت حال میں آدمی اپنی ہی فکر سے فارغ نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ دوسروں کے قضیے نبیڑنے کی کوشش کرے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فتوت و مروت اس بے بسی میں بھی پوری طرح بیدار رہی۔ انہوں نے دیکھا کہ چرواہے اپنی اپنی بکریوں کو پانی کے ڈول بھر بھر کے پلا رہے ہیں اور دو لڑکیاں اپنے ریوڑ کو روکے کھڑی ہیں۔ ان کی اس بے بسی پر ان کو ترس آیا۔ پوچھا: بیبیو! تمہارا ماجرا کیا ہے؟ تم کیوں دور کھڑی ہو؟ وہ بولیں ہمارے باپ بوڑھے ہیں، بکریوں کی چرواہی ہمیں کرنی پڑ رہی ہے۔ ہمارے لیے چرواہوں کی اس بھیڑ میں گھسنا ممکن نہیں، مجبوراً ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا ہے جب تک چرواہے فارغ ہو کر یہاں سے چلے نہ جائیں۔ جب وہ چلے جاتے ہیں تب ہماری باری آتی ہے۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھے، ڈول ہاتھ میں لیا اور اپنے مضبوط بازوؤں سے پانی بھر بھر کے نکالا، ان کی بکریوں کو پلایا اور پھر جا کر اس درخت کے نیچے بیٹھ گئے جس کے نیچے سے اٹھے تھے۔ اس دوران میں ایک لفظ بھی ان کی زبان سے اپنی غربت و مسافرت کے بارے میں نہیں نکلا۔ بس یہ دعا زبان پر جاری ہوئی کہ رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ۔ (القصص-۲۸:۲۴) (اے میرے رب! جو خیر بھی اس وقت تو میرے لیے اتارے، میں اس کا حاجت مند ہوں)۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد یہ راز ان پر کھل گیا کہ جہاں ان کو جانا تھا وہ منزل آ گئی۔ ان کی جس حمیت و فتوت نے ان کو گھر سے نکالا، اسی نے ان کو منزل کا سراغ دیا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا یہ شان کون دکھا سکتا ہے! جو لوگ اپنے اندر اس روح ملکوتی کو بیدار رکھتے ہیں وہ اسی طرح امتحانات سے دوچار ہوتے اور پھر اسی طرح ان سے سرخرو ہو کر نکلتے ہیں، لیکن اس بھید سے واقف بہت تھوڑے لوگ ہیں۔

اسی روح کو بیدار رکھنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ:

من رای منکم منکرا فاستطاع ان یغیرہ بیدہ فلیغیرہ بیدہ. فان لم یستطع

فبلسانہ. فان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان.

(سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن باب ۲۰)

اگر تم میں سے کوئی شخص شریعت اور فطرت کے معروف کے خلاف کوئی بات دیکھے اور وہ اس کی اصلاح کا اختیار رکھتا ہو تو چاہیے کہ وہ اس کی اصلاح کر دے۔ اور اگر اختیار نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کو روکے۔ اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو وہ دل سے اسے ناگوار جانے (یعنی اس سے اپنے آپ کو دور رکھے) اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین مقام ہے۔

اس حدیث کے آخری الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھیے جو شاہد ہیں کہ جو شخص کسی منکر کے معاملہ میں اتنی حمیت و غیرت بھی اپنے اندر نہیں رکھتا کہ کم از کم دل ہی میں اس سے بیزار اور اپنی ذات کی حد تک اس سے مجتنب رہے تو وہ ایمان سے عاری ہے۔

اس حمیت ہی کو زندہ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جس سوسائٹی کو وہ دیکھیں کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی باتوں اور اس کے حکموں کی عملاً یا قولاً بے حرمتی کی جاتی ہے، اس سے دور رہیں:

اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا وَیُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ

(النساء-۴:۱۴۰)

جب تم سنو کہ آیات الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو۔

ایسے لوگوں کے اندر عزت و شرف کا طلب گار بن کر جانا تو درکنار اگر آدمی بھول کر بھی چلا جائے تو چاہیے کہ یاد آتے ہی وہاں سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی باتوں کا مذاق اڑانے والے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہدایت ہے:

فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○ (الانعام-۶:۶۸)

تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو!

اس آیت سے دو باتیں بالکل واضح طور پر نکلتی ہیں: ایک یہ کہ ایسے لوگوں کے اندر آدمی ان کا

ساتھی اور ہم مشرب بن کر نہیں جاسکتا۔ اگر جاسکتا ہے تو یا تو مقصد اصلاح سے جاسکتا ہے یا بھول کر۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی شخص اس کا ساتھی بن کر ان کے ساتھ بیٹھتا ہے تو وہ انھی میں سے ایک ہے اور اس کا حشر انھی کے ساتھ ہوگا۔

ایک روایت میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ جا کر کسی بستی کو الٹ دیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ باری تعالیٰ اس میں تیرا فلاں نیک بندہ بھی ہے۔ حکم ہوا کہ اس کے سمیت بستی کو الٹ دو، اس لیے کہ اس کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر تمتمایا نہیں! حدیث ملاحظہ ہو:

> عن جابر قال: قال رسول اللہ ﷺ: اوحی اللہ عزوجل الی جبریل علیہ السلام ان قلب مدینۃ کذا و کذا باھلھا. فقال: یا ربّ! ان فیھم عبدک فلانا لم یعصک طرفۃ عین. قال: قال: اقلبھا علیہ وعلیھم فان وجھہ لم یتمعر فی ساعۃ قط!
>
> حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم بھیجا کہ فلاں بستی کو اس کے باشندوں سمیت الٹ دو۔ جبریلؑ نے عرض کیا کہ اے رب! اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ حکم ہوا کہ اس پر اور تمام دوسروں پر اس کو الٹ دو کیونکہ اس شخص کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی کے لیے تمتمایا بھی نہیں!

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ان لوگوں کی رسمی فرض داری کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جن کے اندر دین کے لیے غیرت وحمیت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ غیور ہے، وہ غیرت سے خالی لوگوں کے رسمی تحفوں کو قبول نہیں کرتا۔

حمایت

حمیت کا لازمی تقاضا ہے کہ اس سے حق کی حمایت ونصرت ظہور میں آئے۔ یہی چیز اس کے وجود کی

شہادت ہے اور یہی، جیسا کہ اوپر ہم نے عرض کیا، اس کے پرکھنے کے لیے کسوٹی بھی ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کے ضعف وقوت کا کیا حال ہے اور کس حد تک اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

اس کا علم اس وجہ سے ضروری ہے کہ کسی اچھے معاشرے کے اندر کسی فرد کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس کے اس جوہر حمیت ہی سے ہوتا ہے، دوسری چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس مال ہو، خاندان کی وجاہت بھی ہو، صحت، قوت اور علم بھی ہو، لیکن اس کے اندر حمیت وفتوت نہ ہو تو یہ ساری چیزیں رکھنے کے باوجود اس کا وجود معاشرے کے لیے بالکل بے قیمت ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص اگرچہ ان چیزوں میں سے کوئی شے بھی اپنے پاس نہ رکھتا ہو، لیکن اس کے خون میں فتوت کی حرارت ہو تو وہ پوری ملت کے لیے ایک دولت گرانمایہ ہے۔ وہ تیغ کے بغیر لڑنے والا سپاہی ہے، جو اپنی قوم کے لیے ایک لشکر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس وصف کی اس خاص اہمیت کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی صداقت کے لیے معیار یہ ٹھہرایا ہے کہ وہ حق کی حمایت ونصرت کے لیے مال اور جان کی قربانیاں پیش کریں۔ اسی امتحان پر ان کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے۔ جو شخص اس امتحان میں کامیاب ہو وہ مومن ہے، جو ناکام ہوا وہ منافق۔

قرآن میں یہ حقیقت یوں واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی حق کی حفاظت کے لیے کسی دوسرے کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ہر ظلم وتعدی کا انتقام خود لے سکتا ہے اور ہر حق کو خود اپنے بل پر قائم کرسکتا اور برابر قائم رکھ سکتا ہے، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ لوگوں کو آزادی دے کر یہ امتحان کرے کہ کون اس کی مخالفت کے لیے اٹھتا ہے اور کون اس کی حمایت ونصرت کے لیے سردھڑ کی بازی لگاتا ہے۔ اس سنت الٰہی کا بیان سورۂ محمد میں یوں ہوا ہے:

> وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ۚ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ (محمد۔ ۴۷:۴)
>
> اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے انتقام لے لیتا، لیکن اس نے تم کو یہ حکم اس لیے دیا کہ ایک کو دوسرے سے آزمائے۔

مطلب یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو جو دعوت دی گئی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کے لیے ان کا محتاج ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے لشکر کو خود چشم زدن میں اس طرح مٹا سکتا ہے کہ روئے زمین پر ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان کے مخلص اور منافق پرکھے جائیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی تائید و نصرت سے نوازے۔

یہی امتحان ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کریں اور یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اس کی مدد کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○ (الحج۔۲۲:۴۰)

اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔ بے شک اللہ نہایت قوی اور غالب ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر لوگوں کو اپنی مدد کی دعوت دیتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج ہے، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ اس پردے میں وہ اپنے ان بندوں کی مدد کرے جو اس کے دین کی نصرت کے لیے اٹھیں۔

اللہ تعالیٰ کی مدد کا سب سے بڑا مظہر اس کے رسول کی مدد ہے۔ اس لیے کہ اس کے نمائندے کی حیثیت سے وہی لوگوں کے سامنے آتا ہے۔ اس کی مدد ہی درحقیقت اللہ کی مدد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ
(آل عمران۔۳:۸۱)

پھر آئے گا تمہارے پاس ایک رسول، مصداق بن کر ان (پیشین گوئیوں) کا جو تمہارے پاس موجود ہیں تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔

اس رسول کی تائید و نصرت کی صورت اور اس کے صلہ کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (الاعراف۔۷:۱۵۷)

تو جو اس پر ایمان لائے، جنھوں نے اس کی عزت کی، اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

دوسرے درجہ میں اس مدد کے حق دار خود مسلمان آپس میں ایک دوسرے کی طرف سے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان چونکہ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے اخوت کا رشتہ ہے، اس وجہ سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جو مدد کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی مدد کرتا ہے اور اس پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلہ کا حق دار ہے۔ چنانچہ کوئی مسلمان اگر دین کے معاملہ میں اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے مدد کا طلب گار ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ تا حد امکان اس کی مدد کرے۔ اگر قدرت رکھتے ہوئے وہ اس میں کوتاہی کرے گا تو وہ اس پر دنیا میں بھی ملامت کا سزاوار ٹھیرے گا اور آخرت میں بھی اس کے لیے جواب دہ ہوگا۔ دین میں اس کی اہمیت اس درجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو مسلمان کفار کے نرغے میں تھے ان کے متعلق یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وہ ہجرت کر کے ایسے مقامات پر چلے جائیں جہاں ان کو توقع ہو کہ وہ اپنے دین کی حفاظت کر سکیں گے اور ساتھ ہی دوسرے مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ وہ اپنے ان بھائیوں کی اس طرح مدد کریں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکیں اور اگر کسی مجبوری کے سبب سے وہ ہجرت نہ کر سکیں تو اس صورت میں بھی، جہاں تک ان کے دین کی حفاظت کا تعلق ہے، وہ مسلمانوں کی مدد کے حقدار ہوں گے۔ اسی طرح کے مسلمانوں کے بارے میں فرمایا ہے:

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ. (الانفال۔۸:۷۲)

اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے طالب مدد ہوں تو تم پر مدد واجب ہے۔

اس فرض کی اہمیت اسلام میں اس درجہ ہے کہ بعض شرعی مجبوریوں کے سوا، جن کی قرآن میں وضاحت کر دی گئی ہے، اور کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

جہاد

یہی مقام ہے جہاں سے حمایت و نصرت، جہاد فی سبیل اللہ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یعنی حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندے اس امر کا اہتمام کریں کہ وہ باہمی تعاون سے ایسی قوت فراہم کریں کہ دین کی راہ میں پیش آنے والی مزاحمتوں کا وہ موثر مقابلہ کر سکیں۔ انفرادی قوتوں سے صرف انفرادی مزاحمتوں ہی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مزاحمت اگر جماعتی ہو تو اس سے مقابلہ کے لیے لازماً ضرورت ہوگی کہ جماعتی قوت فراہم کی جائے۔ دنیا عالم اسباب ہے، ہر چند حق کے اندر بجائے خود بڑی طاقت مضمر ہوتی ہے، لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ ہر طرح کی مضمر طاقت رکھنے کے باوجود اپنے دین کی نصرت کا کام اپنے بندوں سے لیتا ہے، اسی طرح حق کی طاقت بھی اسباب کے پردے ہی سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ سنت ابتلاء کا لازمی تقاضا ہے، جو اس کائنات میں جاری ہے اور جس کی طرف ہم نے تمہید میں اشارہ کیا ہے۔

اسی جہادی قوت کو فراہم کرنے کے لیے سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو دعوت دی۔ یہ دعوت اگرچہ تمام نبیوں نے دی ہے، لیکن ہم نے حضرت مسیح علیہ السلام کا حوالہ خاص طور پر دو وجوہ سے دیا ہے: ایک تو اس وجہ سے کہ آنجنابؑ کے متعلق یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ آپ صرف پندو موعظت کے پیغمبر تھے، اپنے ساتھیوں کے اندر آپ نے اس طرح کا کوئی ولولہ نہیں ابھارا جس کا تعلق کسی نوعیت سے جنگ و جہاد سے ہو۔ دوسرے اس وجہ سے کہ قرآن نے آپ کی اس دعوت اور آپ کے ساتھیوں کے اس رویہ کو جو انہوں نے اس دعوت کے جواب میں اختیار کیا مسلمانوں کے سامنے بطور ایک اعلیٰ مثال کے پیش کیا ہے۔ چنانچہ سورہ صف میں فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝ (الصف۔ ۶۱:۱۴)

اے ایمان والو! تم اللہ کے انصار بنو، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے دعوت دی حواریوں کو: کون

میرا مددگار بنتا ہے، اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے انصار بنتے ہیں اتو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا تو ہم نے ایمان والوں کی، ان کے دشمنوں کے مقابلے میں، مدد کی تو وہ غالب رہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت کا ذکر سورہ آل عمران میں بھی ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے، پہلے تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی معروف سنت کے مطابق، اپنی قوم کے سادات و اکابر اور علماء و فقہاء کو دعوت دی، لیکن جب آپ کو یہ اندازہ ہو گیا کہ دین داری کے یہ پشتینی ٹھیکہ دار پیچھنے والے نہیں ہیں تو آپ نے ان کو چھوڑ کر اپنے غریب ساتھیوں اور دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کو دعوت دی کہ میرے پیچھے چلے آؤ تو میں تم کو آدم گیر بناؤں گا۔ (انجیل متی: باب ۴:۱۹) غریب مچھیروں نے آپ کی دعوت قبول فرمائی اور انہی کو اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کے فروغ اور اس کے غلبہ کا ذریعہ بنا دیا۔

آیت میں اس صورت حال کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران۔ ۳:۵۲)

پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے، اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار! ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں۔

یہاں وہ حقیقت پیش نظر رہے، جس کی طرف ہم نے تمہید میں اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اندر اصل روح حمیت حق ہے، جس پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ (آل عمران۔ ۳:۵۲) یہ اللہ کے فضل سے اس کے ان بندوں کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی فطرت کو مسخ ہونے سے بچائے رکھتے ہیں، عام اس سے کہ وہ امیر ہیں یا غریب، اعیان و اکابر میں سے ہیں یا غرباء و عوام میں سے، عالی نسب قرشی ہیں یا حبشی غلام۔ سیدنا مسیح علیہ السلام انسانی فطرت کے اس رمز سے اچھی طرح واقف تھے، اس وجہ سے جب آپ نے وقت کے اکابر کو ٹٹول کر دیکھ لیا کہ ان کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے تو آپ نے عوام کے اندر منادی کی اور اللہ نے انہی کے اندر ایسے ساتھی آپ کو

دے دیے جو تمام خلق کے داعی اور معلم بنے اور جو اگرچہ آئے تو تھے دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کے اندر سے لیکن ان کی دعوت نے بڑے بڑے تاج داروں کو مسخر کرلیا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں کے بعد اس حمیت حق اور نصرت و جہاد کی سب سے زیادہ شاندار مثال مدینہ کے انصار نے پیش کی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ابتدائی دور میں انصار کے جو قافلے مکہ حج کے لیے آتے وہ یہ معلوم کر کے نہایت متاثر ہوتے کہ یہاں ایک شخص لوگوں کو نیکی اور خدا پرستی کی دعوت دے رہا ہے، لیکن لوگ اس کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے اس کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ اس صورتحال نے ان کی حمیت حق کو بیدار کیا اور ان میں سے بعض غیور اس مظلوم حق کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اللہ کے ان بندوں کے ذریعہ سے یہ دعوت مدینہ پہنچ گئی اور وہاں کی سرزمین اس کے لیے اتنی سازگار ثابت ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے وہاں جڑ پکڑ لی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ صورت پیدا ہو گئی کہ مکہ کے مظلوم مسلمان اس سرزمین کو اپنے لیے ایک مامن خیال کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے ان کے لیے ایک دارالہجرت کی حیثیت اختیار کرلی۔ پہلے کمزور مسلمانوں نے اس کا رخ کیا، اس کے بعد وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے خود سرور عالم ﷺ نے بھی ہجرت فرمائی، جس کے بعد قدرتی طور پر مدینہ اسلام اور دعوت اسلامی کا مرکز بن گیا۔

انصار نے جس جوش و خروش اور جس دریا دلی سے اپنے مہاجر بھائیوں کا خیر مقدم کیا، جس فیاضی سے اپنے باغوں اور اپنی جائدادوں اور ملکیتوں میں ان کو شریک بنایا اور جس عقیدت و احترام سے اللہ کے رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو اپنے سروں اور دلوں پر بٹھایا، اس کے متعلق کم سے کم جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے اس کی کوئی اور نظیر نہیں ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انصار و مہاجرین کی اخوت کی حیثیت صرف اخلاقی اخوت کی نہیں تھی بلکہ ایک عرصہ تک اس کو قانونی حیثیت بھی حاصل رہی اور جب اس کی حیثیت منسوخ ہوئی تو یہ انصار کے کسی مطالبہ پر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسلامی شریعت کے مزاج کے تقاضوں کے تحت منسوخ ہوئی، اس لیے کہ مہاجرین کے مسائل اس طرح حل ہو گئے تھے کہ اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

یہ حقیقت نفس الامری یہاں ملحوظ رہے کہ انصار نے مہاجرین کو پناہ دینے کا کام بظاہر نہ تو معاشی نقطۂ نظر سے اپنے لیے مفید کیا تھا، نہ سیاسی نقطۂ نظر سے۔ معاشی پہلو سے تو اس کی غلطی یوں واضح تھی کہ انہوں نے اپنی رفاہیت میں ایک ایسے جم غفیر کو ساجھی بنالیا جس کو قریش نے ان کے گھروں سے بالکل خالی ہاتھ نکالا تھا۔ سیاسی اعتبار سے اس میں یہ غلطی تھی کہ مدینہ کو اسلامی دعوت کا مرکز بنا کر انہوں نے اس کی پر سکون زندگی کو تمام عرب و عجم کی دشمنی کا ہدف بنادیا۔ اس گمان کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ انصار اپنے اس اقدام کے نتائج کا کوئی اندازہ نہیں رکھتے تھے۔ ان دونوں باتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ پیش آنے والے سیاسی خطرات سے تو خود قریش نے ان کو آگاہ کر دیا تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کو جب یہ اندازہ ہوا کہ انصار آنحضرت ﷺ کو بھی اپنے پاس لے جانا چاہتے ہیں تو انہوں نے نہایت کھلے لفظوں میں ان کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے یہ اقدام کرنے کی جسارت کی تو تمام اسود و احمر سے جنگ کے لیے تیار رہیں۔ لیکن انصار نے ان کی ان دھمکیوں کی خس برابر بھی پروا نہ کی۔

آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے بعد مدینہ پر حملوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، لیکن انصار ان حملوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ انہوں نے آپؐ کو جس حمایت و نصرت کا اطمینان دلایا تھا اس پر پوری پامردی سے قائم رہے۔ بعض جنگوں کے مواقع پر جب ان کو گمان ہوا کہ آنحضرت ﷺ یہ اندازہ فرمانا چاہتے ہیں کہ ان آئے دن کے حملوں سے متعلق انصار کے تاثرات کیا ہیں، وہ کس حد تک ان کو برداشت کر سکتے ہیں تو انصار کے لیڈروں نے آپؐ کو ایسے الفاظ میں اطمینان دلایا جو تاریخ میں تا ابد یادر کھے جائیں گے۔ ایک موقع پر انصار کے لیڈر نے کہا کہ حضور! ہم بنی اسرائیل کی طرح کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ آپؐ اور آپؐ کا خدا جا کر دشمنوں سے لڑیں، ہم گھر میں بیٹھیں گے۔ خدا کی قسم! اگر آپؐ یہ حکم دیں گے کہ ہم اپنے گھوڑے سمندروں میں ڈال دیں تو ہم اس حکم کی بھی بے چون و چرا تعمیل کریں گے!

باب ۳۰

انسان کا تعلق اپنی ذات سے

پچھلے ابواب میں ہم نے بندے اور رب کے تعلق کے مقتضیات بیان کیے ہیں۔ اگر وہ ذہن میں مستحضر ہیں تو یہ سمجھنا آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے کہ اپنی ذات کے ساتھ آپ کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی روشنی میں آپ خود، بے تکلف، اس حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں کہ آپ خالق نہیں، بلکہ مخلوق ہیں، خدا نہیں، بلکہ بندے ہیں۔ تو لازماً آپ اپنی ذات کے معاملہ میں خودمختار اور مطلق العنان بھی نہیں ہو سکتے، بلکہ اخلاقاً اور عقلاً آپ پابند ہیں کہ آپ کا ہر اقدام اس خالق و پروردگار کی پسند کے مطابق ہو، جس نے آپ کو وجود بخشا ہے اور جو آپ کی پرورش کر رہا ہے۔

یہ شعور یہ رہنمائی دیتا ہے کہ آپ اپنی ذات اور اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنے رب کی امانت تصور کریں اور اسی حیثیت سے ان کے ساتھ معاملہ کریں۔ آپ ان میں سے کسی چیز کو اپنے ارادہ سے ضائع اور برباد کر سکتے اور نہ رہن اور بیع کر سکتے اور نہ امانت رکھنے والے کی مرضی کے خلاف ان میں کوئی تصرف کر سکتے۔

خالق نے آپ کے اندر جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی ودیعت کی ہیں وہ سب بلا استثناء آپ کے مقصد وجود کے لیے لازمی اور ضروری ہیں، کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو کاٹ پھینکنے کے لائق ہو۔ ان میں سے کوئی چیز کسی برائی کا سبب بنتی ہو تو آپ کے سوء استعمال سے بنتی ہے۔ خرابی شے میں نہیں،

بلکہ آپ کے طریق استعمال میں ہوتی ہے۔ آپ اگر اپنی قوتوں کو صحیح محل میں استعمال کریں گے تو ان سے اپنی اور اپنی پوری نوع کی خدمت کریں گے اور غلط طریقہ اور غلط محل میں استعمال کریں گے تو ان سے اپنی دنیا اور آخرت، دونوں برباد کریں گے۔ جوگیوں اور راہبوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے جسم اور جسمانی قوتوں کو بجائے خود روح کی ترقی میں مزاحم تصور کیا اور اس تصور کے تحت اپنے جوگیانہ اور راہبانہ نظام میں ان کو ختم کرنے کے لیے جاں گسل ریاضتیں ایجاد کیں جن کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ حالانکہ اس طرح انہوں نے روح کی ترقی و اصلاح کے مقصد کو کوئی فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹا اس کو نہایت شدید نقصان پہنچایا۔ روح انسانی جس طرح آسمان سے غذا حاصل کرتی ہے اسی طرح زمین سے بھی غذا حاصل کرتی ہے۔ جسم کی قوتیں اگر صحیح طور پر نشو و نما پائیں اور اپنے صحیح محل میں استعمال ہوں تو ان سے روح قوت حاصل کرتی ہے۔ برعکس اس کے اگر جسم بیمار ہو تو بیمار جسم کی روح بھی مضمحل ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔ جوگیوں اور راہبوں نے انسان کی جنسی خواہش کو نہایت مہلک ٹھہرایا ہے اور روح کی آزادی اور اس کی تطہیر کے لیے اس کے قلع قمع کو لازمی بتایا ہے حالانکہ جس شخص کے اندر قوت مردانگی نہ ہو اس کے اندر فتوت، بسالت اور شجاعت کا پایا جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ درآنحالیکہ یہ صفتیں ایک زندہ اور بیدار روح کا اصلی جمال ہیں۔ اگر کسی شخص میں یہ چیزیں نہ ہوں تو وہ نیم مردہ انسان ہے، جس کے اندر بعض منفی قسم کی صوفیانہ نیکیاں تو پرورش پا سکتی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ محراب و منبر کی زینت بننے کے لیے بھی بعض اوصاف اپنے اندر پیدا کر لے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کر سکے جس کے لیے فتوت کا جوہر مطلوب ہوتا ہے۔

یہ تنبیہ ہم نے اس لیے یہاں ضروری سمجھی ہے کہ اسی راہبانہ تصور کے تحت ہمارے ارباب تصوف نے بھی روح کی تطہیر کے لیے بعض ایسے اعمال و اشغال ایجاد کیے ہیں جن کی شریعت میں اگرچہ کوئی اصل نہیں ہے، لیکن وہ ان کے زیادہ سے زیادہ اہتمام پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کاموں میں جو مشقت اٹھائی جاتی ہے روح کے لیے اصلی برکت اسی کے اندر ہے۔ کھانے پینے اور لذات کی تقلیل، بلکہ ان کے ترک کے لیے وہ نہایت جاں گسل ریاضتیں کرتے ہیں اور ان کا زعم یہ ہے کہ اس سے ان کے اندر باطن کا جو نور پیدا ہوتا ہے وہ مخفی حقائق سے

پردے اٹھادیتا ہے۔

اس طرح کی کوئی چیز نبی ﷺ اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں ہمیں نہیں ملتی، حالانکہ روحانی پاکیزگی کے اعتبار سے ان کا جو مرتبہ ہے وہ کسی دوسرے کا نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے ہاں ہر معاملہ میں اعتدال و میانہ روی کی تعلیم ملتی ہے اور اگر کسی کے کسی عمل سے اس کے اندر کسی غالیانہ رجحان کا اظہار ہوا ہے تو اس کی حوصلہ شکنی نبی ﷺ نے بھی فرمائی ہے اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی۔ اگر کسی نے دین کے معاملہ میں تشدد کی راہ اختیار کرنی چاہی تو حضور ﷺ نے اس کو متنبہ فرمایا کہ 'جو دین سے دھینگا مشتی کرنی چاہے گا تو وہ شکست کھا جائے گا'۔

بعض لوگوں نے زندگی کی بعض لذتوں کو دینداری کے خلاف سمجھ کر ترک کر دینے کا اظہار کیا تو حضور ﷺ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ میں تم سب سے زیادہ علم رکھنے والا اور اپنے رب سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ تو جب میں یہ سارے کام کرتا ہوں تو تم ان سے کیوں احتراز کرو؟ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

> صنع النبی ﷺ شیئاً ترخص فیه و تنزه عنه قوم. فبلغ ذالک النبی ﷺ فحمد اللّٰه ثم قال: ما بال اقوام یتنزهون عن الشیء اصنعه. فواللّٰه! انی اعلمهم باللّٰه واشد هم له خشیة.
> (صحیح البخاری: کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ باب ۵)
>
> نبی ﷺ نے کوئی کام کیا اور بعد میں اس میں رخصت دے دی تو بعض لوگ اس رخصت سے فائدہ اٹھانے سے احتراز کرنے لگے۔ جب نبی ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی، پھر فرمایا: بعض لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ان کاموں کو کرنے سے احتراز کرتے ہیں جن کو میں خود کرتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں ان سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔

ایک دوسری حدیث سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہوتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

> ان رسول اللّٰه ﷺ کان یقول: لا تشددوا علی انفسکم فیشدد علیکم. فان قوماً شددوا علی انفسهم فشدد اللّٰه علیهم فتلک بقایاهم فی الصوامع والدیار. (سنن ابی داود: کتاب الادب باب ۵۲)
>
> کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنے تئیں تشدد کی روش مت اختیار کرو کہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے باب میں تشدد کی پالیسی اختیار کرنے لگے۔ ایک قوم نے اپنے اوپر سختی کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لیے سختی ہی کو روا رکھا۔ انھی کی یادگاریں کلیساؤں اور گرجوں میں دیکھ رہے ہو۔

جن لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال بسا ہوا تھا کہ نفس کو زیادہ سے زیادہ مشقت میں ڈالنا روحانی ترقی کے لیے ضروری ہے، ان کو نبی ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ تمہارے نفس کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔ اسی ذیل میں نفس کے بعض متعلقات کے نام لے کر آپؐ نے اس تعلیم کی اچھی طرح وضاحت بھی فرما دی کہ لوگوں کو اس کے سمجھنے میں کوئی اشتباہ نہ رہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

> قال لی رسول اللّٰه ﷺ: یا عبداللّٰه! الم أخبر انک تصوم النهار و تقوم اللیل؟ فقلت: بلی، یا رسول اللّٰه! قال: فلا تفعل. صم وافطر وقم و نم. فان لجسدک علیک حقاً، وان لعینک علیک حقاً، وان لزوجک علیک حقاً، وان لزورک علیک حقاً. (صحیح البخاری: کتاب الصوم باب ۵۴)
>
> مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ عبداللہ! کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم دن کو روزے رکھتے ہو اور رات بھر نمازیں پڑھا کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ صحیح ہے، یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: ایسا نہ کرو۔ کبھی روزہ رکھو، کبھی افطار کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔ کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جورو کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔

ان تعلیموں سے اسلام کا صحیح مزاج سامنے آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوتوں اور نعمتوں میں سے کسی چیز کو روحانی ترقی کے لیے ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ پورے اعتدال

کے ساتھ،اس کے صحیح مصرف میں، استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کسی چیز کا صحیح مصرف کیا ہے اور اس کے باب میں صحیح نقطۂ اعتدال کیا ہے اور اس اعتدال کی تربیت کے لیے انسان کو کیا راہ اختیار کرنی چاہیے تو ان میں سے کسی سوال کے جواب کے باب میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو تاریکی میں نہیں چھوڑا ہے، بلکہ قوتوں کے صحیح محل استعمال کی بھی وضاحت کی ہے اور وہ طریقے بھی تعلیم کیے ہیں جن پر عمل کر کے انسان اپنے راہوار نفس کو لگام لگا سکتا ہے اور اس کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھ سکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو لوگ اپنی دین داری کی نمائش کرنی چاہتے ہیں وہ صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتے جو اللہ اور رسول نے بتایا ہے، بلکہ وہ یہ کرتے ہیں کہ جو چیز دین میں سیر بھر مطلوب ہے اس کو من بھر بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو ان کی طرف توجہ ہو کہ اصلی دیندار یہ ہیں، اس لیے کہ ان کا گول دوسروں سے آگے ہے حالانکہ ان کی یہ نمائش عارضی ہوتی ہے۔ بہت جلد وہ وقت آجاتا ہے جب وہ دین کی اصلی چیز کو تو چھوڑ بیٹھتے ہیں اور اپنی ایجاد کی ہوئی بدعت کو اس کی جگہ اصل قرار دے لیتے ہیں۔ اس طرح سنت تو مٹ جاتی ہے اور اس کی جگہ بدعت رہ جاتی ہے۔ شاید نبی ﷺ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ اس طرح کے الفاظ فرمائے ہیں کہ جو بدعت بھی وجود میں آتی ہے، وہ ایک سنت کو مٹا کر وجود میں آتی ہے۔

نفس کے حقوق

نفس کے بارے میں یہ غلط فہمیاں غور کیجیے تو خاصی سنگین ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ارباب تصوف نے بھی اس باب میں تقریباً وہی نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہے جو عیسائی متکلمین اور ان کے راہبوں کا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ اس میں ہندو جوگیوں کے تصورات کی بھی آمیزش ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم قرآن اور حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ نفس کے ہم پر کیا حقوق ہیں اور وہ کس طرح ادا کیے جا سکتے ہیں۔

پہلا حق — معرفت نفس

ہمارے اوپر نفس کا پہلا حق یہ ہے کہ ہم اس کی صحیح صحیح معرفت حاصل کریں۔ انسان ایک عالم اصغر ہے اور اس کے نفس کے چھوٹے سے آئینہ میں وہ سب کچھ منعکس کر دیا گیا ہے جس کا جاننا اس کی زندگی کی رہنمائی کے لیے ضروری ہے۔ حکماء میں سے جو واقعی حکیم ہیں، انہوں نے اس حقیقت کا سراغ دیا ہے۔ سقراط، جو تمام حکماء کا امام ہے، کا یہ قول مشہور ہے کہ 'اے انسان! تو اپنے آپ کو پہچان'۔ افلاطون نے اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ 'روح انسانی کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے تمام حقائق سے آگاہ کر دیا گیا ہے، لیکن اس پر ذہول طاری ہو گیا ہے۔ تذکیر اور تذکر سے اس کی یاد دہانی ہوتی رہتی ہے۔' ارسطو کی رائے یہ ہے کہ 'انسان کے نفس کے اندر جو خزانہ ہے اگر وہ اس کو برآمد کر لے تو اس کے لیے کافی ہے۔' بعد کے ادوار میں بھی تمام قابل ذکر حکماء نے اس حقیقت کا اظہار و اعتراف کیا ہے۔

قرآن حکیم میں بھی یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اس دنیا میں بھیجے جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کی ارواح سے اپنی توحید اور ربوبیت کا اقرار لیا ہے:

> وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی ج شَھِدْنَا ج (الاعراف ۔ ۷:۱۷۲)
>
> اور (یاد کرو) جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے — ان کی پیٹھوں سے — ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے: ہاں! تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔

قرآن میں یہ بات بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی کے تمام مبادی الہام کر دیے ہیں تاکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جائے:

> وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا O فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا O (الشمس ۔ ۹۱:۷۔۸)
>
> شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا پس اس کو سجھا دی اس کی بدی اور نیکی کی۔

قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ O وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ O (القیمۃ۔۷۵:۱۴-۱۵)

بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔

یہ تمام باتیں دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دہرا انتظام فرمایا ہے۔ سب سے پہلے اس کی فطرت کو اپنی ہدایت سے نوازا۔ اس کے بعد اپنی وحی سے بھی اس کو مشرف کیا تاکہ اندر اور باہر، دونوں طرف سے اس کو نور حاصل ہو اور وہ چاہے تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ بن جائے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ باہر کے نور کی بھی حقیقی قدر انھی کے اندر پیدا ہوتی ہے جن کا اندر کا نور زندہ ہوتا ہے۔ وہ ان کے لیے دلیل اور رہنما کا کام کرتا ہے۔ جو اپنے اندر کے نور کو بجھا دیتے ہیں، وہ باہر کے نور سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس وجہ سے انسان کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کے مخفی خزانوں سے اچھی طرح واقف ہو، ان کا برابر جائزہ لیتا رہے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ اپنے اندر کی آواز انسان کے لیے سب سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس کو وہ جس طرح سنتا اور سمجھتا ہے اور پھر اس پر اس کو جس درجہ اذعان ہوتا ہے اس درجہ اذعان خارج کی آواز پر مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ یہ آواز اپنی صداقت کے لیے کسی دلیل کی محتاج نہیں ہوتی، بلکہ خود آپ اپنی دلیل ہوتی ہے۔

دوسرا حق — تربیت نفس

نفس کا دوسرا حق یہ ہے کہ انسان اس کی تربیت کرے۔ تربیت سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو روشنی ودیعت فرمائی ہے کوشش کرے کہ وہ بجھنے نہ پائے، بلکہ اس میں برابر افزونی ہوتی رہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس سے کبھی تغافل نہ برتے، بلکہ اس کی ہر آواز کو سنے اور اس پر لبیک کہے۔ انسان کا ضمیر رہنمائی کرنے میں کبھی غفلت نہیں برتتا۔ لیکن انسان بعض اوقات اپنی خواہشوں کے دباؤ کے تحت، اس کی تعمیل سے کترانے کے لیے، کچھ مصلحتیں اور بہانے پیدا کر لیتا ہے۔ اگر وہ اس طرح کی بہانہ بازی کا خوگر ہو جائے تو پھر ضمیر کی قوت کمزور ہو جاتی ہے اور وہ

آہستہ آہستہ بالکل مضمحل، بلکہ بے جان ہو جاتا ہے۔ یہ حالت ظاہر ہے کہ ضمیر کی موت کے ہم معنی ہے اور اگر ضمیر مردہ ہو جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اب فطرت کی ترجمانی کرنے والا کوئی نہیں رہا اور انسان اپنے باطن کی روشنی سے بالکل محروم ہو گیا۔

اس فتنہ سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے ضمیر کی مخالفت سے اپنے امکان کے حد تک اپنے کو بچائے اور اگر اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے، اس لیے کہ ضمیر کی موت ایسی چیز نہیں ہے جو کسی حالت میں بھی گوارا کی جا سکے۔ جس آدمی کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو اس کی زندگی زمین کے لیے لعنت ہے۔ جس شخص سے اس طرح کا گناہ صادر ہو وہ اگر پھر روحانی زندگی حاصل کرنا چاہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ خالق اور خلق، دونوں کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرے اور اپنے ضمیر اور اپنے رب سے بصمیم قلب اقرار کرے کہ آئندہ وہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرے گا۔

تربیت نفس کے اس جہاد میں اس نصب العین کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی کمال درجہ ترقی کا بتایا ہے۔ کمال درجہ ترقی کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر صوفیوں کے نقطۂ نظر سے بہت مختلف ہے۔ صوفی حضرات تو اپنے وحدت الوجود کے فلسفہ کے تحت نفس انسانی کے لیے کمال درجہ ترقی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا میں ضم ہو جائے:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

لیکن ہمارے نزدیک یہ محض شاعری اور خیال آرائی ہے۔ قرآن حکیم کی روشنی میں نفس کی سب سے بڑی ترقی یہ ہے کہ اس کی ایسی تربیت ہو جائے کہ وہ **نفسِ مطمئنہ** بن جائے تاکہ آخرت میں اس کو رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً کا اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل ہو جائے:

یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ O ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً O
(الفجر۔۸۹:۲۷-۲۸)

اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جمار ہا! چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی!

نفسِ مطمئنّہ سے مراد یہ ہے کہ دل اس طرح خدا اور اس کی باتوں پر ٹھک جائے کہ سخت سے سخت حالات میں بھی وہ ڈانواڈول اور اپنے نصب العین سے منحرف نہ ہو۔ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً سے مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقام حاصل کرے کہ پکار اٹھے کہ جو کچھ اس نے اپنے رب سے امیدیں باندھیں وہ اس کے گمانوں اور امیدوں سے کہیں زیادہ پوری ہوئیں اور اس کا رب بھی اس کو بندگی کے معیار پر پورا پائے۔ بس یہی مقام سب سے اونچا مقام ہے۔ جو یہ حاصل کرے اس کے لیے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ○ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (الفجر۔۸۹:۲۹۔۳۰)(مل جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری بہشت میں!) کی بشارت ہے اگرچہ اس نے نہ کبھی کوئی بشارت انگیز خواب دیکھا ہو اور نہ کبھی اس پر کوئی غیب منکشف ہوا ہو۔ اور جو اس سے محروم رہا وہ اللہ تعالیٰ سے محروم ہے اگرچہ وہ پانی پر چلتا اور ہوا میں اڑتا ہو۔

تربیت نفس کے لیے نصب العین کی حیثیت تو اسی چیز کو حاصل ہے، لیکن یہ عمر بھر کے لیے ایک کٹھن جہاد ہے، اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر رہنمائی اور بدرقہ کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت قرآن مجید کے تدبر اور نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے پوری ہوگی، بشرطیکہ آدمی آزاد ذہن کے ساتھ مطالعہ کرے، تقلید و تقید سے آزاد ہو اور اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ صحیح اور کامل علم کی دولت صرف حضرات انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوئی۔

تیسرا حق — عزتِ نفس

نفس کا تیسرا حق یہ ہے کہ آدمی اس کی عزت کرے۔ عزت سے مراد یہ نہیں کہ آدمی اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے کہ چو من دیگرے نیست۔ یہ عزت نفس نہیں، بلکہ کبر نفس ہے۔ جو اس میں مبتلا ہوا وہ شیطان کے سب سے بڑے فتنہ میں مبتلا ہوا اور اس کی ہلاکت یقینی ہے۔

عزتِ نفس سے ہماری مراد یہ ہے کہ انسان اس امر واقعی کو ہمیشہ یاد رکھے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی خلافت سے نوازا ہے، اس کو اس عظیم امانت کا امین بنایا ہے جس کو آسمان اور زمین نہ اٹھا سکے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (الاحزاب۔۳۳:۷۲)

اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

اس کے رب نے اس کے اندر وہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائیں جو اپنی تمام مخلوقات میں سے کسی کو بھی نہیں بخشیں۔ دنیا کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی، لیکن وہ کسی کے لیے نہیں مسخر کیا گیا، بلکہ اس کے رب نے اس کو صرف اپنی بندگی کے لیے خاص کیا ہے۔ اس سرفرازی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی ایسی بات کا مرتکب نہ ہو جو اس کے اس تمام شرف کو خاک میں ملا دے۔

انسان کا جتنا بڑا مرتبہ ہے اتنی ہی بڑی ذلت بھی اس کے لیے ہے اگر وہ اس مرتبہ کی قدر نہ کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی عزت کی قدر نہیں کرتا تو پھر وہ اسفل سافلین کے کھڈ میں پھینک دیا جاتا ہے، جس سے کبھی اس کو نکلنا نصیب نہیں ہوتا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ○ (التین۔۹۵:۴۔۵)

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا۔ پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا جبکہ وہ خود گرنے والا بنا۔

سورہ اعراف میں یہود کی تاریخ بیان کرتے ہوئے واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوموں کی امامت بخشی، لیکن انہوں نے اس کی قدر نہیں کی تو ان کو تنبیہ فرمائی گئی کہ وہ متنبہ ہوں، لیکن جب انہوں نے اس سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل کر دیا اور وہ کتوں کے مانند ہو کے رہ گئے، جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کو اگر ماریے تو بھی زبان نکالے رکھتے ہیں اور اگر چھوڑ دیجیے جب بھی زبان نکالے رکھتے ہیں:

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ج فَمَثَلُهٗ

كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ (الاعراف۔ ۷:۱۷۵۔۱۷۶)

اوران کواس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا، پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے، لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی تمثیل کتے کی ہے — اگر تم اس کو دھتکارو، جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو، جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔

اس عزت نفس کے تحفظ کے لیے چند حقیقتوں کا شعور ہر لمحہ انسان میں تازہ رہنا چاہیے، ورنہ شیطان اس کو کسی ایسے فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ ذلت کے حوالے کر دے تو اس کو کوئی بھی عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم نے یوں واضح فرمایا ہے کہ:

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ (الحج۔ ۲۲:۱۸)

اور جس کو خدا ذلیل کر دے تو اس کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ انسان اس نکتہ کو ہمیشہ یاد رکھے کہ جو شخص خود اپنی عزت نہیں کرتا اس کی دوسرے بھی عزت نہیں کرتے۔ ایک حکیم شاعر کا قول ہے کہ:

من لا یکرم نفسہ لا یُکرم

(جو خود اپنی عزت نہیں کرتا اس کی دوسرے بھی عزت نہیں کرتے)

مطلب یہ ہے کہ جب آپ خود اپنی پیشانی کی، اپنی نگاہ کی، اپنی زبان کی اور اپنی عقل و ذہانت کی قدر نہیں کرتے، بلکہ ان کو خریدنی و فروختنی شے سمجھ کر ہر اس شخص کے ہاتھ بیچتے ہیں جو آپ کو کچھ پیسے دے، قطع نظر اس سے کہ اس کا معیار کیا ہے اور جس مقصد کے لیے وہ خرید رہا ہے اس مقصد کے لیے ان کا استعمال ان کے خالق نے جائز بھی رکھا ہے یا نہیں، تو پھر آپ کو یہ شکایت

نہیں ہونی چاہیے کہ دوسرے آپ کے گہر کو پشیز کے برابر سمجھتے ہیں، اس لیے کہ خود آپ کی نگاہوں میں ان کی اس سے زیادہ قدر نہیں ہے۔ جب آپ کی پیشانی ہر دروازے کے سجدہ سے آلودہ ہے، آپ کی نگاہ ہر تاک جھانک کے لیے آزاد ہے، آپ کی زبان ہر اہل و نااہل کی قصیدہ خوانی کر سکتی ہے، سوال صرف قیمت کا ہے، تو پھر معاف کیجیے کہ جس طرح ایک بازاری عورت کسی احترام کی حق دار نہیں سمجھی جاتی آپ بھی کسی عزت و احترام کے حق دار نہیں ہیں۔

چوتھا حق — احتسابِ نفس

نفس کا چوتھا حق یہ ہے کہ اس کا برابر محاسبہ کرتے رہیے کہ اس نے کیا نیکی کمائی ہے اور کیا برائی کمائی ہے، کیونکہ اس چیز پر آپ کی نجات یا ہلاکت کا انحصار ہے۔ مرنے کے بعد آپ کے عمل کے سوا اور کوئی چیز کام آنے والی نہیں ہے۔ یہی پکڑوائے گا اور یہی چھڑائے گا۔ اس کے ذرہ ذرہ کا حساب ہونا ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس حساب سے پہلے آپ خود اپنا حساب کر رکھیں۔ اس سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک نہایت حکیمانہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

حاسبوا انفسکم قبل ان تُحاسبوا. وتزینوا للعرض الاکبر. وانما یخف الحساب یوم القیامة علی من حاسب نفسه فی الدنیا.

(سنن الترمذی: کتاب صفة القیامة، باب ۲۵)

اپنے نفسوں کا محاسبہ کر لو قبل اس کے کہ تمہارا حساب ہو۔ اور بڑے میدان کے واسطے تیار ہو جاؤ۔ اور بے شک قیامت کے دن کا حساب اسی پر آسان ہوگا جو دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے گا۔

قرآن مجید میں یہ ہدایت موجود ہے کہ:

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ (الحشر۔ ۵۹:۱۸)

اور چاہیے کہ ہر نفس اچھی طرح جائزہ لے رکھے اس کا جو اس نے کل کے لیے کیا ہے۔

یہ جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیے۔ یہ کام ہر روز سونے سے پہلے بھی آپ کر سکتے ہیں لیکن

موزوں ترین وقت اس کا فجر سے پہلے یعنی تہجد کا ہے بشرطیکہ اس کی توفیق حاصل ہو۔ قرآن مجید کے اشارات سے اس مقصد کے لیے اس وقت کی موزونیت واضح ہے۔ اس وقت رحمت آسمانی مغفرت کرنے والوں کی تلاش میں ہوتی ہے۔ کیا عجب کہ کسی خوش قسمت کی قسمت لڑ جائے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے!

اپنا محاسبہ کرنے میں رواداری اور ڈھیل سے کام نہ لیجیے اور نہ اپنے کو الاؤنس دینے کی کوشش کیجیے، بلکہ ایک ایک چیز پر نگاہ ڈالیے اور ہر کوتاہی اور حق تلفی کی تلافی کی کوشش کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے معاملہ میں تو توبہ واستغفار سے گناہ دھل جاتے ہیں، لیکن بندوں کے حقوق کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ اس میں ضروری ہے کہ تا بحد امکان اس ظلم کی تلافی کی جائے جو صادر ہوا ہے اور بندے کو بھی راضی کیا جائے اور ساتھ ہی اپنے رب سے بھی اس تعدی کی معافی مانگی جائے جس کا ارتکاب ہوا ہے۔

باب ۳۱

آدمی کا تعلق کنبہ، خاندان، معاشرہ اور ریاست سے

علمائے عمرانیات نے انسانی فطرت کا یہ ایک نہایت اہم راز منکشف کیا ہے کہ وہ ایک اجتماعیت پسند حیوان (SOCIAL ANIMAL) ہے۔ اس کی مثال انگور کی بیل کی ہے جو پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے ایک سہارے کی محتاج ہوتی ہے۔ یہ سہارا اس کو حاصل ہو تب تو وہ پھلتی پھولتی ہے، ورنہ سکڑ کے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ انسان بھی، اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق، پروان چڑھنے کے لیے سہارے کا محتاج ہے۔ یہ سہارا اس کو خاندان اور معاشرے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ چیز اگر اس کو حاصل ہوجائے تب تو اس کی تمام مخفی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اگر کسی سبب سے یہ حاصل نہ ہوسکیں تو یہ سب دب کر ختم ہوجاتی ہیں۔

یہ تمثیل ہمارے نزدیک بالکل صحیح ہے۔ بس اتنا فرق دونوں میں ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انگور کی بیل کو جو سہارا مطلوب ہے، وہ اس کو چمن کا مالی مہیا کرتا ہے اور انسان کو جو سہارا مطلوب ہے، وہ ابتدائے خلقت ہی سے خود اسی کے اندر مضمر ہے۔ وہ جب دنیا میں آیا ہے تو یکہ و تنہا نہیں آیا ہے، بلکہ اپنا سارا باغ وچمن اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ اس نے اس زمین پر جہاں بھی ڈیرا ڈالا تھوڑی ہی مدت میں اپنی بزم اس طرح آراستہ کرلی کہ اس کی ذہنی اور مادی صلاحیتوں کو اپنا عمل کرنے

کے لیے جن محرکات اور سہاروں کی ضرورت تھی، وہ سب اس کو حاصل ہو گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے انسان — حضرت آدمؑ — جب اس دنیا میں تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تنہا نہیں بھیجا، بلکہ ان کی رفاقت کے لیے انہی کی جنس سے ان کا جوڑا پیدا کیا۔ اس جوڑے سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا ہوئیں۔ پھر انہوں نے بالتدریج خاندانوں اور قبیلوں کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ ان کی باہمی یوتگی سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جس کے اندر انسان کے اجتماعی اور سیاسی شعور کی تربیت کے لیے وہ سب کچھ فراہم ہو گیا جو مطلوب تھا۔ قرآن مجید نے اپنے مختصر اور جامع الفاظ میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ (النساء ۴:۱)

اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم باہم گر طالب مدد ہوتے ہو اور ڈرو قطع رحم سے۔ بے شک اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔

اس آیت پر تدبر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے اندر ان تمام اساسات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جن پر اس کائنات کے فاطر نے انسانی اجتماعیت کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ان کو اجاگر کر دیا جائے اور ان پر زندگی کی تعمیر کی جائے تو خاندان، معاشرہ اور ریاست، ہر چیز کی اٹھان اس نقشہ پر ہو گی جو اس دنیا کے خالق کا بنایا ہوا نقشہ ہے اور جس کو بروئے کار لانے ہی کے لیے اس نے انسان کو اس زمین کی خلافت بخشی ہے۔

یہ بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہیں:

ایک یہ کہ یہ دنیا کوئی بے راعی کا گلہ نہیں ہے، بلکہ اس کو اس خدا نے وجود بخشا ہے جو سب کا پروردگار ہے۔ اس وجہ سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس میں دھاندلی مچائے اور من مانی

کرنے کی جسارت کرے، بلکہ سب کو اس خداوند کی پکڑ سے ڈرتے رہنا چاہیے جو سب کا خالق و مالک ہے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک ہی نفس — حضرت آدمؑ — سے وجود بخشا ہے، اس وجہ سے نسب کے اعتبار سے سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ عربی اور عجمی، کالے اور گورے سب برابر ہیں۔ ان میں کسی کو کسی پر ترجیح ہو گی تو اکتسابی صفات کی بنا پر ہو گی۔ اس کے سوا شرف کے دوسرے معیارات سب باطل ہیں۔

تیسرا یہ کہ جس طرح سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اسی طرح سب کی ماں بھی اصلاً ایک ہی — حضرت حوا — ہیں۔ اس اعتبار سے بھی کسی کو کسی پر کوئی ترجیح اور فوقیت حاصل نہیں ہے۔ ایک ہی باپ ماں سے یہ پورا گھرانا وجود میں آیا ہے۔ حضرت حوا، آیت سے واضح ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی کی جنس سے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ عورت مرد کے مقابل میں کوئی حقیر اور فرو مخلوق نہیں ہے، بلکہ وہ بھی اس شرف میں برابر کی شریک ہے جو انسان کو بحیثیت انسان حاصل ہے۔

چوتھا یہ کہ انسانی معاشرہ میں تعاضد و تناصر کی بنیاد وحدتِ الٰہ، وحدتِ آدم اور اشتراکِ رحم کے عقیدے اور جذبے پر ہے۔ ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اس اشتراک کا حق پہچانے اور اس کو ادا کرے اور ساتھ ہی اس امر کا اہتمام رکھے کہ کوئی ایسا نعرہ لوگوں پر غالب نہ ہونے پائے جو اس فطری اشتراکیت کی بنیاد کو منہدم کر دینے والا اور اس کی جگہ کسی جاہلی جذبہ کو ابھارنے والا ہو۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز ابھرتی نظر آئے تو یہ پورے معاشرے کے لیے ایک شدید خطرے کا الارم ہے اور معاشرے کے ہر دردمند کا فرض ہے کہ وہ اس کو روکنے کے لیے اپنا زور صرف کرے۔ آیت کے آخر میں وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ (اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم باہم گر طالب مدد ہوتے ہو اور ڈرو قطع رحم سے) کے الفاظ سے اسی خطرے سے متنبہ کیا ہے، اس لیے کہ حقیقت میں یہی ستون ہیں جن پر اسلام نے خاندان، معاشرہ اور ریاست کی عمارت تعمیر کی ہے۔ جب تک یہ ستون قائم ہیں یہ عمارت قائم رہے گی، جب یہ کمزور ہو جائیں گے، عمارت خطرے میں پڑ جائے گی اور جب یہ گر جائیں گے، عمارت

بھی پیوندِ زمین ہو جائے گی۔

ان اصولوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آیئے دیکھیے کہ انسان کو اپنے کنبہ و خاندان، اپنی قوم اور معاشرہ اور ریاست کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہر کام پر کس طرح ان کی نگرانی کرنی پڑتی ہے اور اگر وہ ذرا غافل ہو جائے تو کس طرح وہ کشتی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے جس پر وہ اپنے پورے خاندان، بلکہ اپنی پوری قوم سمیت سوار ہوتا ہے۔

باب ۳۲

آدمی کا تعلق کنبہ اور خاندان سے

کنبہ اور خاندان میں آدمی کا سب سے زیادہ قریبی تعلق اوپر کی جانب اپنے ماں باپ اور نیچے کی جانب اپنے بیوی بچوں سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے پہلے انہی کے اندر دیکھنا چاہیے کہ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے یا کیا ہونی چاہیے۔ اس کی روشنی میں دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ سب سے پہلے ماں باپ کے ساتھ اس کے تعلق کو لیجیے۔

ماں باپ کے ساتھ آدمی کا تعلق

آدمی کو پیدا تو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، لیکن اس کے پیدا کرنے کا ذریعہ اس کے ماں باپ کو بنایا ہے۔ وہی اس کی زندگی کے ابتدائی دور میں، جب اس کی حیثیت ایک مضغۂ گوشت سے زیادہ نہیں ہوتی، اس کی غور و پرداخت، رضاعت و پرورش اور دیکھ بھال کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور وہ اس خدمت کو، کسی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کے بغیر، ایسے دلی جوش و جذبہ کے ساتھ انجام دیتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی ذات کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ گویا ان کی زندگی کا سارا لطف و عیش اس ننھے سے وجود کی خدمت کے اندر سمٹ آیا ہے، جو ان کی گود میں ڈال دیا گیا ہے۔ ان کی اس فدویت و قربانی کا کم سے کم صلہ ان کی اولاد کی طرف سے، جبکہ وہ جوانی کو پہنچے اور وہ پیری اور ناتوانی کے دور میں داخل ہو رہے ہوں، یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی نگاہوں میں جو درجہ ان کا ہو اللہ

تعالیٰ کے سوا کسی کا بھی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا درجہ سب سے بلند و بالا ہونا تو ایک امر بدیہی ہے، اس لیے کہ حقیقی خالق، پروردگار اور محسن وہی ہے، دوسروں کی حیثیت، خواہ ان کے ذریعہ سے کتنا ہی بڑا احسان ظہور میں آیا ہو، وسائل و ذرائع کی ہے اور وسائل و ذرائع جس کو بھی حاصل ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے عقل و فطرت کی رو سے سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہوا، دوسروں کا حق بہرحال اس کے حق کے تحت ہی ہوگا۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ○ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ

(لقمان۔۳۱: ۱۴۔۱۵)

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے شکر گزار ہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا، جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو ان کی بات نہ مانیو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو۔

ان آیات میں پہلی چیز جو والدین کے عظیم مرتبہ کی شہادت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکر گزاری کے حق کو اپنی شکر گزاری کے ہم پلہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے، جس سے وہ بات صاف طور پر نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ آدمی پر اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا حق اس کے والدین ہی کا ہے اور کسی کا بھی نہیں۔ آیت کے فحویٰ سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے پیدا کرنے اور اس کے پروان چڑھانے میں جو حصہ والدین کا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی دوسرے کا ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اگرچہ اولاد کی شکر گزاری کے حق دار ماں اور باپ، دونوں ہیں، لیکن ماں کا حق اولاد کے اوپر باپ کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بات یوں واضح ہوئی کہ

اگرچہ شکر گزاری کے حق دار کی حیثیت سے ماں اور باپ دونوں کا ذکر ہوا ہے، لیکن تین نمایاں خدمات — حمل اٹھائے پھرنے کی سختیاں جھیلنا، وضع کے وقت جان کی بازی کھیلنا اور پھر پورے دو سال تک اپنے خون کو دودھ بنا کر رضاعت کی خدمت انجام دینا — صرف ماں ہی کی بیان ہوئی ہیں، باپ کی کسی خدمت کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگرچہ خدمت اور شکر گزاری کے حق دار ماں اور باپ، دونوں ہی ہیں، لیکن ماں کا حق باپ کے مقابل میں تین گنا ہے۔ آیت سے یہ بات اشارۃً نکلتی ہے۔ نبی ﷺ نے اس اشارہ کو ایک شخص کے سوال کے جواب میں واضح فرما دیا۔ سائل نے سوال کیا کہ میرے حسن خدمت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں! یہی سوال اس نے دوسری مرتبہ اور تیسری مرتبہ دہرایا تو ہر بار آپؐ نے یہی جواب دیا۔ پھر جب اس نے چوتھی مرتبہ دہرایا تو اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ تمہارا باپ! نبی ﷺ کا یہ جواب اس آیت کی بہترین تفسیر ہے۔ حدیث ملاحظہ ہو:

عن ابی ھریرۃ قال: جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ فقال: من احق الناس بحسن صحابتی؟ قال: امک. قال: ثم من؟ قال: ثم امک. قال: ثم من؟ قال: ثم امک. قال: ثم من؟ قال: ثم ابوک.

(صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ والآداب باب ۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ میرے حسن خدمت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پھر پوچھا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پھر پوچھا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تیرا باپ۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اولاد پر ماں باپ کے حقوق کسی دنیوی اختلاف تو درکنار ایمان اور عقیدہ کے اختلاف کی صورت میں بھی باقی رہیں گے۔ ان کو یہ حق تو نہیں ہوگا کہ وہ اولاد کو اللہ تعالیٰ کے ایمان اور اس کے دین سے روکنے کے لیے زور لگائیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو اولاد ان کی اطاعت سے انکار کر دے گی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا حق ان کے حق سے بڑا ہے۔ لیکن اس

اختلاف کے باوجود، جہاں تک دنیوی زندگی کے حالات ومعاملات ہیں ان میں، ان کے احترام، ان کی خدمت اور ان کی محبت وفرمانبرداری کی ذمہ داریاں بدستور اولاد پر باقی رہیں گی۔ بیماری میں ان کی عیادت وتیمارداری، ضرورت میں ان کی تابہ حد استطاعت مدد، کسی مصیبت میں ان کی حمایت ومدافعت، کسی بار کے اتارنے میں ان کے ساتھ فراخ دلانہ تعاون، یہاں تک کہ ان کے تندوتلخ رویہ کے باوجود ان کی ہدایت ومغفرت کے لیے دل سوزی کے ساتھ دعا واستغفار سے اولاد کے لیے بے پرواہونا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ آپؑ کے باپ کا رویہ کتنا ظالمانہ اور سنگ دلانہ تھا، لیکن عین اس وقت جبکہ اس نے آپؑ کو ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دیا آپؑ نے اس سے کہا تو صرف یہ کہا کہ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا (مریم۔۱۹:۴۷)(میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا وہ میرے حال پر بڑا ہی مہربان ہے) اور آپ نے اس کی تمام تعدیوں کے باوجود اپنے اس وعدے کے مطابق، اس وقت تک برابر اس کے لیے استغفار کا سلسلہ جاری رکھا جب تک اللہ تعالیٰ نے اس سے آپ کو روک نہیں دیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک خاص حد پر اس استغفار سے روک دیا، قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے لیے ان کی اس دردمندی کو اس نے پسند فرمایا اور اس کو ان کے اَوَّاہ اور حلیم یعنی دردمند اور بردبار ہونے کا نتیجہ قرار دیا اور خاص اہتمام سے اُن کی ان صفات کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

> وَمَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ ○ (التوبہ۔۹:۱۱۴)
>
> اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت مانگنا صرف اس وعدے کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا۔ پھر جب اس پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اعلان براءت کر دیا۔ بے شک ابراہیم بڑا رقیق القلب اور بردبار تھا۔

ہمارے نبی کریم ﷺ کو اگرچہ اپنے والدین کی خدمت کا موقع نہیں ملا لیکن رضاعی ماں، حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپؐ کا جو سلوک رہا وہ شاہد ہے کہ جب رضاعی ماں کے لیے آپؐ کے جذبات یہ تھے تو حقیقی ماں کے لیے کیا کچھ ہوتے اگر ان کے ظہور میں آنے کی

نوبت آتی! روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا جب کبھی دیہات سے مدینہ تشریف لاتیں تو آپؐ ان کو دیکھ کر فرطِ محبت سے میری ماں! میری ماں! کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ پھر جب وہ رخصت ہونے لگتیں تو آپؐ ان کو تحفوں اور ہدیوں کے ساتھ نہایت محبت واکرام کے ساتھ رخصت فرماتے۔

والدین سے متعلق اولاد کے فرائض

ان اصولی باتوں کے علاوہ قرآن مجید نے والدین سے متعلق اولاد کے فرائض کی مزید تفصیل بھی بیان کی ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا ہے:

> وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ کِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ○ (بنی اسرائیل۔۱۷:۲۳۔۲۴)
>
> اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کر اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کر۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو اور ان کے لیے رحم دلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب ان پر رحم فرما، جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

ان آیات سے بھی پہلی بات تو وہی سامنے آئی جو اوپر گزری کہ آدمی پر سب سے بڑا حق اس کے رب کا ہے۔ جو یہ ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرے۔

دوسری بات جو سیاق وسباق سے نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی بندگی کے سوا کسی اور کی بندگی کا روادار ہوتا تو وہ اولاد کو حکم دیتا کہ وہ اپنے والدین کی عبادت کرے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا۔ لیکن اس نے ان کی عبادت کا حکم نہیں دیا، صرف ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ تو جب وہ عبادت میں حصہ دار نہ بن

سکے جن کو اللہ نے اس کے وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

تیسری یہ کہ والدین کے معاملہ میں اولاد کے لیے امتحان کا اصلی مرحلہ اس وقت آتا ہے جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی بڑھاپے کو پہنچتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ حق دار تو ہوتے ہیں، لیکن اکثر حالات میں محتاج نہیں ہوتے، لیکن بڑھاپے میں وہ محتاج ہوتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اسی طرح محتاج ہوں جس طرح اولاد اپنی شیر خوارگی اور طفولیت کے دور میں محتاج رہی ہے۔ اسی وجہ سے اس سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی اس شفقت و رحمت کو یاد کر کے جو انھوں نے اس کے بچپن میں اس پر کی ہے ان کے بڑھاپے میں ان کی خدمت کر کے ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔ پس مبارک ہے وہ فرزند جس نے یہ حق پہچانا! اس لیے کہ اس نے جنت حاصل کرنے کی وہ راہ پائی جس سے زیادہ آسان راہ جنت حاصل کرنے کی اور کوئی نہیں ہے۔ انسانی فطرت میں شفقت اور رحمت کا جو جذبہ قدرت نے اولاد کے لیے والدین کے اندر رکھا ہے وہی جذبہ رحمت و قربانی اولاد کے اندر والدین کے لیے رکھا ہے بشرطیکہ اولاد ان کے حق کو یاد رکھے۔ اگر کسی کے اندر یہ جذبہ مردہ ہو گیا ہے تو اس اعتبار سے وہ بد قسمت ترین انسان ہے کہ جنت حاصل کرنے کا وہ موقع اس نے کھو دیا جس سے زیادہ آسان موقع اس کو دوسرا ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ یہی حقیقت نبی ﷺ سے یوں بیان ہوئی ہے:

> عن ابی هریرة عن النبی ﷺ قال: رَغِمَ انفه. ثم رغم انفه. ثم رغم انفه. قیل: من؟ یا رسول اللّٰه! قال: من ادرک والدیه عند الکبر، احدهما او کلیهما، ثم لم یدخل الجنة. (صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ والآداب باب ۳)
>
> حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک مرتبہ) فرمایا: اس کی ناک خاک آلودہ ہوئی! اس کی ناک خاک آلودہ ہوئی!! اس کی ناک خاک آلودہ ہوئی!!! سوال کیا گیا کہ کس کی؟ یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: اس کی جس نے اپنے ماں باپ کو، ان میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو، ان کے بڑھاپے میں پایا، لیکن جنت حاصل نہ کر سکا۔

چوتھی نہایت اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی اگر عمر کی اس

حد کو پہنچ جائیں جو ارذل عمر کہلاتی ہے، جس میں آدمی سمع و بصر اور ہاتھ پاؤں سے قاصر اور جملہ ضروریات میں دوسروں کا محتاج، بلکہ ان پر بوجھ بن کر رہ جاتا ہے تو گویا امتحان اولاد کے لیے ایک بڑا ہی صبر آزما امتحان ہے، لیکن اس کی وفاداری اور سعادت مندی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے دل کے اندر نہ ان سے بیزاری پیدا ہونے دے اور نہ تنگ آ کر کوئی کلمہ زبان سے ایسا نکال بیٹھے جو ان کی دل شکنی یا توہین کا باعث ہو۔ بلکہ سخت سے سخت حالات میں بھی وہی بات زبان پر لائے جو ایک بوڑھے ماں باپ کے لیے ایک شریف بیٹے کے شایانِ شان ہے۔ یہاں اسی امتحان سے آگاہ فرمایا گیا ہے:

> اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا. (بنی اسرائیل ۔ ۱۷: ۲۳)
>
> اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو۔

لفظ اُف عربی میں کسی چیز سے دل کی شدید بیزاری کی تعبیر ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے: اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط (الانبیاء ۔ ۲۱: ۶۷) (تف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو!)۔ اس کے بعد لفظ نہر جو جھڑکنے کے معنی میں آتا ہے اسی قلبی بیزاری کا گویا اظہار ہے۔ جب آدمی کے دل میں بیزاری پیدا ہو جائے تو لازماً لب و لہجہ میں خشونت اور کرختگی بھی پیدا ہو جائے گی۔ پھر جب یہ برق خرمن سوز بوڑھی ماں اور بے بس باپ کے نازک دل پر گرے گی تو ایک طرف تو یہ ان کے سارے خرمن امید کو جلا کر رکھ دے گی اور دوسری طرف اولاد کے سارے کیے کرائے کو بھی خاک میں ملا دے گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو چیز اس کے لیے جنت کی ضامن بن سکتی تھی وہ اس کے لیے ابدی نامرادی اور تباہی کا سبب بن جائے گی۔

یہ نفسیاتی حقیقت ہر شخص کو یاد رکھنی چاہیے کہ اولاد بچپن میں خواہ کتنی ہی شدید بیماری میں مبتلا ہو اور اس کے سبب سے ماں باپ کتنے ہی دکھ میں مبتلا ہوں، لیکن وہ انتہائی ناداری اور افلاس کے باوجود اولاد کو کبھی بار محسوس کر کے جھٹکنے کے خواہاں نہیں ہوتے، بلکہ اس کی صحت کی آرزو میں آخری لمحہ تک سینہ سے چمٹائے در در لیے پھرتے ہیں کہ شاید کسی ڈاکٹر یا حکیم کی نظر کرم ہو جائے اور اگر

ڈاکٹروں اور حکیموں تک نہیں پہنچ پاتے تو سیانوں اور جھاڑ پھونک والوں ہی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ شاید انہی کی توجہ سے ان کا بجھتا چراغ روشن ہو جائے۔ اس جدوجہد میں وہ اپنے رات دن ایک کر دیتے ہیں۔ دوسرے خواہ کتنے ہی مایوس ہو جائیں، لیکن وہ مایوس ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کا یہ جذبہ رحمت کوئی معمولی چیز نہیں ہے کہ اس کو بھلا کر کوئی شریف ابن شریف چین کی نیند سو سکے، بلکہ وہ ان کے بڑھاپے میں، اپنی نمازوں میں، ان کے لیے برابر یہ دعا بھی کرے گا کہ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔ (بنی اسرائیل۔ ۱۷:۲۴) (اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا) اور ساتھ ہی ان کے ایک ایک سانس کو اپنے لیے دولت گراں مایہ سمجھے گا کہ ان کی خدمت کی ہر سعادت اس کے لیے جنت کی بشارت اور خوشنودیٔ رب کی ضمانت ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

رضی الربّ فی رضی الوالد، وسخط الربّ فی سخط الوالد.

(سنن الترمذی: کتاب البر والصلۃ باب ۳)

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے۔

پانچویں حقیقت جو آیت کے آخری الفاظ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔ (بنی اسرائیل۔ ۱۷:۲۴) (اور ان کے لیے رحم دلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔) سے نکلتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماں باپ کی خدمت و اطاعت صرف رحمت کے جذبہ اور ان کی اس بے پایاں شفقت کے صلہ کی حیثیت سے ہونی چاہیے جو انہوں نے اولاد پر اس کے بچپن میں کی ہے۔

اس میں کسی ریا کی خواہش یا لوگوں کی ملامت کے اندیشہ یا ان کے اموال و جائداد کی طمع کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے، ورنہ جس طرح ریا کی عبادت اور غیر مخلصانہ اطاعت کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے اسی طرح یہ خود غرضانہ خدمت والدین بھی اس کے ہاں کسی صلہ کی حقدار نہیں ٹھہرے گی۔ اگرچہ یہ حقیقت کسی ایسے شخص کو سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہیں آ سکتی جس کو دین کی

باتیں سمجھنے کا کچھ ذوق ہو، لیکن کسی کو اس میں کچھ تردد ہو تو اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ والدین کی صحیح خدمت کی راہ میں ایسا مرحلہ بھی پیش آنے کا امکان ہے جس میں اس شخص کے سوا کوئی دوسرا اس امتحان میں پورا اتر ہی نہیں سکتا جو اس محرک کے سوا، جو اوپر مذکور ہوا، کسی اور محرک کے تحت اس فرض کو انجام دینے کا ارادہ کرے گا۔ صرف ایک ہی چیز اس کو سخت سے سخت امتحان میں بھی پابرجا رکھ سکتی ہے کہ وہ یاد رکھے کہ اس کے ماں باپ کسی سخت سے سخت امتحان میں بھی اس کو چھوڑ کر کہیں بھاگنے والے نہیں بن سکتے تھے درآنحالیکہ ان کو مجھ سے اس وقت کسی منفعت کی امید نہیں ہو سکتی تھی تو میرے لیے یہ بات کس طرح جائز ہو سکتی ہے کہ میں ان کی خدمت سے گھبرا کر انہیں چھوڑ بیٹھوں جبکہ میں ان سے کم یا زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی توقع بھی رکھتا ہوں؟

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اسلام میں ماں باپ کی خدمت ایک عظیم عبادت بھی ہے۔ اس امر کی وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے:

عن عبداللہ بن عمرو قال: جاء رجل الی النبی ﷺ یستاذنہ فی الجھاد. فقال: احیّ والداک؟ قال: نعم. قال: ففیھما فجاھد.

(صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ والآداب باب ۱)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے جہاد میں حصہ لینے کی اجازت مانگی۔ آپؐ نے اس سے سوال کیا کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں، یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: تم ان کی خدمت کرو، تمہارے لیے یہی جہاد ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ:

اقبل رجل الی نبی اللہ ﷺ فقال: ابایعک علی الھجرۃ والجھاد، ابتغی الاجر من اللہ. قال: فھل من والدیک احد حیّ؟ قال: نعم. بل کلاھما. قال: فتبتغی الاجر من اللہ؟ قال: نعم. قال: فارجع الی والدیک فاحسن صحبتھما. (صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ والآداب باب ۱)

ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے

لیے آپؐ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی حیات ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! دونوں ہی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کے اجر کا طالب ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: تو اپنے والدین کے پاس لوٹ جاؤ اور ان کی خدمت کرو، جیسا کہ خدمت کا حق ہے۔

اس خدمت کا یہ مزاج بھی مقتضی ہے کہ اس میں اخلاص کی شرط لازم ہو، اس لیے کہ اسلام میں کوئی خدمت اخلاص کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔

باب ۳۳

آدمی کا تعلق اپنے کنبہ اور بیوی بچوں سے

انسان، جیسا کہ پچھلے باب میں واضح ہو چکا ہے، مدنی الطبع ہے، اس وجہ سے اس کے ترک اور تیاگ، زہد اور انقطاع کی وہ زندگی جس کا تصور فلسفۂ رہبانیت میں پیش کیا گیا ہے بالکل خلاف فطرت ہے۔ مرد یا عورت جو بھی یہ زندگی اختیار کرے گا اس سے تربیت و اصلاح کے بجائے اس کو شدید نقصان پہنچے گا۔ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ انسان کی صلاحیتیں خاندان اور معاشرے کے سہارے پروان چڑھتی ہیں۔ اگر کسی داخلی یا خارجی سبب سے یہ سہارا اس کو حاصل نہ ہو سکے تو یہ سکڑ کر رہ جائیں گی۔ اگر مرد بیوی بچوں سے محروم ہو تو وہ ایک خانہ بدوش بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر عورت شوہر سے محروم ہو تو وہ ایک اجڑے ہوئے گھر کے مانند ہے۔ یہ حقیقت بھی یہاں پیش نظر رکھیے کہ جو چیز صرف کنبہ اور خاندان سے حاصل ہو سکتی ہے اس کا کسی مدرسہ یا خانقاہ سے حاصل ہونا ناممکن ہے۔

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ شبہ ہو کہ سیدنا یحییٰ علیہ السلام اور سیدنا مسیح علیہ السلام کے کامل العیار انسان ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی، لیکن معلوم ہے کہ ان جلیل القدر نبیوں نے عمر بھر تاہل کی زندگی اختیار نہیں کی۔ ہمارے نزدیک یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ ان بزرگ نبیوں نے یہ زندگی اپنی پسند سے، مثالی زندگی سمجھ کر، اختیار نہیں کی، بلکہ ان کے دور کے حالات ہی ایسے تھے کہ یہ زندگی ان کو اختیار کرنی پڑی۔ یہ دور وہ دور ہے جب بنی اسرائیل کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔

خود ان نبیوں کے ارشادات کے مطابق یروشلم کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا اور اس کو خطاب کر کے یہ پیشین گوئی کی جا چکی تھی کہ یہاں کوئی اینٹ بھی دوسری اینٹ پر قائم نہیں رہنے دی جائے گی۔ ایسے پر آشوب حالات میں گھر در بنانے اور بیوی بچوں کی زندگی اختیار کرنے کا شوق صرف وہی پورا کر سکتے تھے جو بالکل بے فکرے اور عاقبت سے بے پرواہوں۔ اس دور میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی زندگی اس طرح گزر رہی تھی کہ وہ یا تو جیل میں ہوتے یا بیت المقدس میں یہودی خونخواروں کے نرغے میں۔ اسی طرح سیدنا مسیح علیہ السلام شب میں جبل زیتون پر دعا اور آہ و زاری میں مصروف رہتے ہیں اور دن میں فریسیوں اور فقیہوں کے حصار میں مصروف مناظرہ۔ یہی دور ہے جس میں سیدنا مسیح علیہ السلام نے یروشلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ 'کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا۔' (انجیل متی۔ باب ۲۳: ۳۷) غور کیجیے کہ جس کا پورا گلستان عذاب کے برق خرمن سوز کی زد میں ہو وہ آشیانہ بنانا چاہے بھی تو کون سی شاخ ہے جس کو وہ اس مقصد کے لیے انتخاب کر سکتا ہے! شاید یہی صورت حال ہے جس کا اظہار سیدنا مسیح علیہ السلام نے ان دل دوز الفاظ میں فرمایا کہ:

> لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابن آدم کے لیے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں! (انجیل متی: باب ۸: ۲۰)

بہر حال گھر در بنانا اور بیوی بچوں والا بننا کوئی دنیاداری نہیں ہے، بلکہ خالق کے منشائے تخلیق، انسان کی مضمر صلاحیتوں کے ابراز اور اس کی تکمیل ذات کے لیے یہ فطرت کے بدیہی مطالبات میں سے ہے۔ جنھوں نے اس کی مخالفت کی ہے، انھوں نے فطرت سے جنگ کی ہے۔ مرد اور عورت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ دونوں مل کر ایک کنبہ کی بنیاد رکھتے ہیں جس کو انسانی معاشرہ کی تعمیر میں ایک یونٹ کی حیثیت حاصل ہے اور پھر بہت سے یونٹ مل کر ریاست کو وجود میں لاتے ہیں، جو تمام تہذیب و تمدن کی معمار بنتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ پہلی اینٹ بالکل ٹھیک رکھی جائے تا کہ پوری عمارت بالکل ٹھیک بنے۔ اگر اس میں کجی رہ جائے تو اندیشہ ہے

کہ پوری عمارت کج ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے:

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج!

اس کنبہ کی سربراہی یا قوامیت کی ذمہ داری فطرت اور شریعت نے مرد پر ڈالی ہے، اس لیے کہ مرد ہی اپنی صلاحیتوں اور مزاجی خصوصیات کے اعتبار سے اس ذمہ داری کے اٹھانے کے لیے موزوں ہے۔ قرآن حکیم میں یہ حقیقت یوں واضح فرمائی گئی ہے:

> اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط (النساء ۴: ۳۴)
>
> مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے۔

اس آیت سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ کنبہ کی پرورش اور اس کی حفاظت و مدافعت بہتر طور پر مرد ہی کر سکتا ہے، اس وجہ سے وہی موزوں ہے کہ اس پر قوامیت کا بوجھ ڈالا جائے۔ یہ مرد کی مطلق فضیلت کا بیان نہیں، بلکہ قوامیت کی ذمہ داری کے لیے، عورت کے مقابل میں، مرد کی ترجیح کا بیان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض دوسرے اعتبارات سے عورت کو مرد پر ترجیح حاصل ہو۔ مثلاً گھر گرہستی کی ذمہ داریاں جس خوبی سے عورت سنبھال سکتی ہے اور بچوں کی دیکھ بھال جس اعلیٰ پیمانہ پر وہ کر سکتی ہے کسی مرد سے متعلق اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا درآنحالیکہ کنبہ کے مقاصد میں ان چیزوں کی اہمیت بھی بنیادی ہے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھیے کہ یہ بات مردوں اور عورتوں کی مزاجی خصوصیات کے اعتبار سے بطور ایک کلیہ ارشاد ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت ایک مرد کے مقابل میں کمانے اور کنبہ کی کفالت کی زیادہ صلاحیت رکھنے والی ہو اور اس کے مقابل میں مرد اس صلاحیت سے عاری ہو، لیکن اس طرح کی انفرادی مثالوں سے کوئی کلیہ نہیں ٹوٹ جائے گا۔ اصل سوال مردوں اور عورتوں کی فطری صلاحیتوں، قوتوں اور طبعی رجحانات و میلانات کا ہے۔ کوئی انصاف پسند یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس میدان میں مرد اور عورت، دونوں یکساں صلاحیت کے مالک ہیں۔ جدید تہذیب نے عورتوں کو مرد بنانے کی کوشش پر اپنا پورا زور صرف کر ڈالا ہے، لیکن

اس کی کوشش میں اگر کوئی کامیابی حاصل ہوئی بھی ہے تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ بعض عورتیں اپنے تمام نسوانی اوصاف و فرائض سے کلیتہً دست بردار ہو جانے کے بعد کسی حد تک مردوں کی نقالی کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سودا نہ ان عورتوں کے لیے نفع بخش ہوا ہے نہ مجموعی طور پر معاشرہ اور ملک کی حکومت کے لیے۔ چند مصنوعی مردوں کے بدلہ میں بہت سی حقیقی عورتوں کو کھو بیٹھنا کوئی دانش مندی کا کام ہرگز نہیں ہے۔

قوامیت کی ذمہ داریاں اور فرائض

اب آیئے دیکھیے کہ قوامیت کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ بظاہر تو یہ مرد کے سر پر شرف کا ایک تاج ہے، لیکن اس کے ساتھ جو فرائض وابستہ ہیں ان پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تاج ہے تو سہی، لیکن کانٹوں کا تاج ہے۔ اس لیے کہ مرد اگر اس کا حق ادا نہیں کر سکے تو یہ ان کے لیے دنیا اور آخرت، دونوں میں رسوائی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہاں ہم ان فرائض اور ذمہ داریوں کا، ایک مناسب ترتیب سے ذکر کرتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ان کا مطالعہ دوسروں کے فرائض کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے فرائض کی حیثیت سے کریں گے۔

پرورش اور کفالت

بیوی بچوں سے متعلق سب سے پہلی ذمہ داری تو مرد پر ان کی پرورش اور کفالت کی عائد ہوتی ہے۔ اوپر قوامیت والی آیت جو گزری ہے اس میں بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے۔) کے الفاظ صاف دلیل ہیں کہ مرد کو عورتوں پر جو قوامیت حاصل ہوئی ہے اس کے دو سببوں میں سے ایک بڑا سبب یہی ہے کہ وہ بیوی بچوں کی کفالت کا بار اٹھاتا ہے۔ یہ بار اٹھانا مرد کی مردانگی اور فتوت کا تقاضا ہے۔ قرآن نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اپنی فتوت کی لاج رکھنے کی جگہ جگہ ہدایت فرمائی ہے۔ مثلاً مردوں کو خطاب کرکے فرمایا ہے کہ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ (البقرۃ۔۲:۲۳۷) (اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو نہ بھولو)۔ یعنی اس ترجیح کا تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہ بنے، بلکہ اس کی رجولیت کا

تقاضا ہے کہ وہ اس کو دینے والا بنے۔ چنانچہ ہر معاشرے میں وہ مرد نکھٹو سمجھا جاتا ہے جو اپنی محنت سے اپنے بیوی بچوں کی کفالت نہ کر سکے اور اس بات کا تو مجبور کن حالات کے سوا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مرد عورت کی کمائی پر تکیہ کرنے والا بنے۔

یہاں ایک نہایت اہم حقیقت یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد پر بیوی بچوں کی کفالت کی ذمہ داری تو ڈالی ہے، لیکن اس کو ان کا رزاق نہیں بنایا ہے کہ وہ ان کے مسائل پر اس پہلو سے سوچنا شروع کر دے کہ اس کے پاس کتنے بچوں کی کفالت کی گنجائش ہے، کتنے اس کی تحویل میں آ چکے ہیں اور اب کسی نووارد کے لیے اس کے ہاں جگہ ہے یا نہیں؟ اس طرح کے سوالات پر غور کرنے والے جس طرح اپنے معیار زندگی اور اپنی آمدنی کو سامنے رکھ کر اپنے گھر کے بجٹ بناتے ہیں اسی طرح بچوں کی پیدائش سے متعلق بھی پروگرام بناتے ہیں۔ اگر ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی نومولود آ کر ان کے بجٹ میں رخنہ انداز ہو سکتا ہے تو وہ اس کو روکنے کے لیے منع حمل اور اسقاط کے اسلحہ اور گولہ بارود لے کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس طرح کے بوالفضولوں کو خطاب کر کے متنبہ کیا ہے کہ کسی کنبہ کے سرپرست کو بھی اس غلط فہمی میں نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ وہ ان کا رزاق ہے۔ ان کا رزاق ہونا تو درکنار کوئی اپنا بھی رزاق نہیں۔ رزاق سب کا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

> وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (الانعام۔۶:۱۵۱)
>
> اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔

اس آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو معاشی تنگ حالی کے ڈر سے بعض اوقات اپنی اولاد، خاص طور پر لڑکیوں، کو زندہ در گور کر دیتے تھے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم صرف خدا کے بخشے ہوئے رزق کو تقسیم کرنے والے ہو، رزاق نہیں ہو کہ کسی کی زندگی یا اس کے رزق کو ختم کر دینے کا فیصلہ کرو۔ یہ فیصلہ رزاقِ حقیقی کا کام ہے جو سب کو رزق دیتا ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہے کہ آدمی وہ کام کرے جو اس کے حدود کار کے اندر اور اس کے فرائض میں شامل ہیں: کسب رزق کے لیے جدوجہد کرے، وسائل کو ترقی دے، حاصل شدہ رزق کو

کفایت شعاری اور انصاف کے ساتھ تقسیم کرے۔ اسی طرح بچوں کی پیدائش کے معاملہ میں صحت، اعتدال، احتیاط اور میانہ روی کو ملحوظ رکھے، یہ کام اس کے کرنے کے ہیں۔ رہی یہ بات کہ کتنے بچے پیدا ہوں گے اور کتنا رزق حاصل ہوگا، یہ خدا کے کرنے کے کام ہیں، ان میں مداخلت کرنے والے احمق ہیں۔

کفالت کے باب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کی ہدایت یہ بھی ہے کہ یہ کسب حلال سے ہو۔ کسب حرام سے جو کنبہ پلتا ہے وہ دنیا میں ممکن ہے کچھ چمک دمک دکھا جائے، لیکن بالآخر اس کے مقدر میں ایسی تاریکی ہے، جس سے کبھی نجات ملنے والی نہیں ہے، آخرت میں اس کے سارے افراد ایک دوسرے پر لعنت کے دوگڑے برسائیں گے۔ ایسے کنبہ سے کسی رجل رشید کے پیدا ہونے کی توقع نہیں ہوتی۔ اگر کبھی آزر کے گھر میں کوئی ابراہیم تقدیر سے پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس بت خانہ کو منہدم کر کے لازماً دوسرا مقدس تعمیر کرتا ہے، لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔

اگر کسب حرام کی وبا کسی قوم میں عام ہو جائے تو وہ لازماً عذاب الٰہی کی پکڑ میں آجاتی ہے۔ قرآن مجید میں قوم شعیب کی تباہی اس جرم میں بیان ہوئی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ یہ وبا عالم گیر ہو چکی ہے، اس وجہ سے صورت حال کچھ ایسی نظر آرہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری دنیا یک قلم تباہ ہو جائے گی۔ یہودیانہ سرمایہ داری نے کمیونزم کا ایسا سرطان پیدا کر دیا ہے جس کا علاج اسلام کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے، لیکن اسلام ملا کے ہاتھ میں اسیر ہے اور اس کے نام لیوا نہ دنیا سے واقف نظر آتے ہیں نہ دین سے۔

اس کفالت سے متعلق قرآن حکیم کی یہ ہدایت بھی یاد رکھیے کہ لازم ہے کہ اس میں نہ بخل ہو نہ تبذیر، بلکہ ہر پہلو سے یہ کفایت شعاری اور میانہ روی کا مظہر ہو۔ یہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے رزق میں کشادگی بخشتا ہے اس کے اندر دوسرے مستحقین کے حقوق بھی ہوتے ہیں جو بطور امانت اس کی تحویل میں دیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ جو فرمایا گیا ہے: وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (المعارج ۔ ۷۰: ۲۴۔۲۵) (اور وہ جن کے مالوں میں ایک معین حق ہوتا ہے سائلوں اور محروموں کا۔) اس سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حق کو حق کی حیثیت سے ادا کرنے کی توفیق وہی پا سکتا ہے جو اپنے اور اپنے

بیوی بچوں کے مصارف میں محتاط اور کفایت شعار ہوگا ورنہ وہ اپنے ہی شوق پورے نہ کر پائے گا تو دوسروں کے حقوق کا کیا خیال کرے گا جبکہ ان کی جانب سے اس کو کسی مطالبہ کا اندیشہ بھی نہ ہو کہ رزق کی کشادگی ہوتے آدمی بیوی بچوں کے ساتھ بخالت اور کنجوسی کی روش اختیار کرے؟ اللہ تعالیٰ بندے کو جب رزق کی کشادگی سے نوازے تو وہ چاہتا ہے کہ اس نعمت کا اثر اس کے دل کی شکر گزاری سے بھی ظاہر ہو اور اس کی زندگی سے بھی نمایاں ہو۔ کسی خوشحال آدمی کے بچے اگر پھٹے حال میں سامنے آئیں تو یا تو اس پر کنجوسی کا گمان ہوتا ہے یا بے سلیقگی کا اور یہ گمان پیدا ہونے کا موقع دینا ہرگز کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔

تعلیم و تربیت

دوسری بڑی ذمہ داری جو پہلی ذمہ داری سے کسی طرح کم نہیں ہے، وہ بیوی بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بچے کی اصلی اور ابتدائی تربیت گاہ ماں باپ کی آغوش ہے۔ اس دور میں جو نقوش اس کی لوح قلب پر قائم ہو جاتے ہیں، خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، وہ انمٹ ہوتے ہیں۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ما من مولود الا يولد على الفطرة. فابواه يهودانه و ينصرانه و يمجسانه. (صحیح مسلم: کتاب القدر باب ۶) (ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کے ماں باپ ہیں جو اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔) ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے۔ ایک مرد کے لیے شادی کر لینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے، لیکن یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے اپنی بالکل ابتدائی تربیت گاہ میں ایسی تربیت کس طرح پائیں کہ ان کی فطرت نہ صرف یہ کہ مسخ ہونے سے محفوظ رہے، بلکہ وہ ٹھیک اس نہج پر پروان چڑھے جو اس کا فطری نہج ہے؟

یہ مسئلہ دوسروں کے لیے کچھ اہمیت رکھنے والا ہو یا نہ ہو، لیکن مسلمانوں کے لیے یہ نہایت اہم ہے، بالخصوص اس زمانے میں جبکہ معاشرے کا مزاج بالکل فاسقانہ ہے اور تعلیم و تربیت کے تمام ادارے بلا استثناء اتنے بگڑ چکے ہیں کہ ان کی نسبت اگر یہ کہا جائے تو ذرا غلط نہیں ہے کہ وہ زیر تربیت نسل کو شرارتوں میں کچھ چالاک تو بنا دیتے ہیں لیکن دین اور اخلاق کو بالکل برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس معاشرہ کی اصلاح ہوگی یا نہیں؟ ہوگی تو کب ہوگی؟ تعلیمی اور تبلیغی نظام بدلے

گا یا نہیں؟ بدلے گا تو کب؟ ان سوالوں کا جواب دینا میرا کام نہیں ہے۔ اگر یہ بدلے گا بھی تو ابھی اس میں اتنی دیر ہے کہ:

تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود

اس وجہ سے یہ سوچنا ضروری ہے کہ فوری طور پر، ہر دردمند مسلمان اور ہر مسلمان کنبہ کے سربراہ کی ذمہ داری اس کے بیوی بچوں سے متعلق کیا ہے؟

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس بگڑے ہوئے زمانے میں کوئی شخص کچھ اور کر سکے یا نہ کر سکے، لیکن ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے امکان اور صلاحیت کے حد تک اپنے بیوی بچوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ معاشرے کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے۔ کوئی بھاگنا چاہے بھی تو آخر کہاں جائے گا؟ آب و ہوا کتنی ہی فاسد ہو چکی ہو، لیکن اسی میں جینا اور اسی میں مرنا ہے۔ موجودہ تعلیمی اور تربیتی اداروں سے بھی مفر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ادارے قائم کرنا افراد کا کام نہیں ہے، معاشرہ اور حکومت کا کام ہے اور وہ اپنے مزاج کے مطابق ہی ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہر دردمند سربراہ کنبہ ایک طرف معاشرہ کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے — جس پر اگلے باب میں بحث کروں گا — دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بیوی بچوں کو پوری دل سوزی و دردمندی کے ساتھ ان باتوں کی یاددہانی کرتا رہے، جو ایمان کو زندہ رکھنے والی ہیں، تاکہ وہ عنداللہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکے۔ اس فرض کا صحیح احساس اپنے اندر زندہ رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں پر ہر شخص کو نگاہ رکھنی چاہیے۔

گلہ کی حفاظت

پہلی یہ کہ الا! فکلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ! (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ باب ۵) (آگاہ رہو کہ تم میں سے ہر شخص چرواہا بنا دیا گیا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلہ سے متعلق پرسش ہونی ہے!) میں یہ آگاہی دی گئی ہے کہ ہر شخص کے بیوی بچے اس کی تحویل میں دیے ہوئے گلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس گلہ کا اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن اس کی نگرانی، اس کی چرواہی اور اس کی

حفاظت، اس نے سربراہ کنبہ کے سپرد کی ہے اور ایک دن — قیامت کے دن — وہ دیکھے گا کہ کس نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور کس نے ادائے فرض میں کوتاہی کی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کسی کا اپنا گلہ نہیں ہے کہ چاہے وہ اس کی دیکھ بھال کرے یا نہ کرے، بلکہ یہ خالق و مالک کا گلہ ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ پوری مستعدی سے اس کی نگرانی کی جائے اور ٹھیک ٹھیک اس کے منشاء کے مطابق کی جائے۔ اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی اور غفلت کے باعث کوئی بھیڑ کھوئی گئی یا وہ بھیڑیے کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کے لیے وہ لازماً مسئول ہوگا۔ یہ بات بھی یہاں یاد رکھیے کہ یہ معاملہ حیوانی گلہ کا نہیں، بلکہ انسانی گلہ کا ہے، جس کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے، جس سے بچنے اور بچانے کی تاکید اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ کی ہے۔ اس وجہ سے ہر سربراہ کنبہ پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے گلہ کو اس دشمن کی شب خونی سے بچانے کے لیے چوکنا رہے۔

مستقبل سے متعلق فکرمندی

دوسری یہ کہ ہر شخص کو یہ حقیقت ہر لحہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اولاد کے ساتھ محبت اور شفقت یہ نہیں ہے کہ اس کو غلط روی کے لیے ڈھیل دی جائے، بلکہ یہ ہے کہ روز اول سے اس کی ایسی باتوں پر، جو کسی غلط رجحان کی نشان دہی کرتی ہوں، نہایت شفقت اور پیار کے ساتھ ٹوکا جاتا رہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اخلاق، آداب اور شریعت کے بنیادی احکام اس کے کانوں میں نہایت شفقت کے ساتھ اس طرح ڈالے جائیں کہ وہ بار نہ محسوس کرے۔ اس کا خیال نہ کیا جائے کہ وہ ان پر عمل کرتا ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر کر کے ضروری باتیں مناسب مواقع سے برابر اس کے کانوں میں پڑتی رہیں۔ البتہ کہنے والے اس امر کا اہتمام رکھیں کہ خود ان سے ان باتوں میں سے کسی بات کی خلاف ورزی صادر نہ ہو۔ انسان کی فطرت بڑی اثر پذیر ہے۔ شفقت اور پیار کے ساتھ جو بات بتائی اور سکھائی جاتی ہے وہ ضرور اثر کرتی ہے بشرطیکہ عمل کا تسلسل جاری رہے اور تحکم و جبر سے احتراز کیا جائے۔ جو لوگ اپنی اولاد کی تربیت کے لیے یہ ریاضت کریں گے امید ہے کہ وہ اس برے زمانے میں بھی اس کو اس قابل بنا لیں گے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو وہ خوشی نصیب

کرے جس کا ذکر سورہ طور میں ہوا ہے۔ فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ (الطور۔۵۲:۲۱)

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی، ان کے ساتھ ہم ان کی اولاد کو بھی جمع کر دیں گے اور ان کے عمل میں سے ذرا بھی کمی نہیں کریں گے۔

مطلب یہ ہے کہ اونچے درجہ کے اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ یہ فضل فرمائے گا کہ ان کی باایمان اولاد کو ان کے بلند درجے میں ان کے ساتھ اکٹھا کر دے گا اگرچہ اولاد اپنے عمل کے اعتبار سے اس درجہ کی سزاوار نہ ہو۔ یہ ان لوگوں پر خاص فضل ہوگا اور اس فضل خاص کی وجہ خود انہی کی زبانی یہ بیان ہوئی ہے کہ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ مرتبہ آپ لوگوں کو کس طرح حاصل ہوا کہ آپ کی اولاد بھی آپ کے ساتھ جمع کر دی گئی؟ تو وہ جواب دیں گے:

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ○ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ○ (الطور۔۵۲:۲۶۔۲۷)

وہ کہیں گے: ہم اس سے پہلے اپنے اہل وعیال کے باب میں بڑے ہی چوکنے رہے ہیں۔ تو اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذاب دوزخ سے محفوظ رکھا۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے بیوی بچوں کی عاقبت سے کبھی بےفکر رہ کر زندگی نہیں گزاری، بلکہ ہمیشہ خود بھی چوکنے رہے اور برابر ان کو بھی چوکنے رکھنے کی کوشش کی۔ یہ اس کا صلہ ہے کہ آج ہم کو اور ہماری اولاد کو یکجا کر دیا گیا اور اس یکجائی کے لیے ہمارا درجہ نیچا نہیں کیا گیا، بلکہ رب کریم نے اپنے فضل خاص سے ان کا درجہ ہمارے برابر کر دیا۔ یہ اس کا فضل ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنے اہل وعیال کی عاقبت کی طرف سے بالکل نچنت اور لاابالیانہ زندگی گزارتے ہیں، خواہ اپنی بلادت کے سبب سے یا اپنے زعم میں یہ خیال کیے بیٹھے ہیں کہ اس عمر میں وہ ان کی آزادی اور بےفکری میں کیوں خلل انداز ہوں، وہ اپنی اولاد کے

ساتھ وہ دشمنی کر رہے ہیں جو کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکتا اور ان کے اس رویہ پر سب سے زیادہ ان پر لعنت ان کی اولاد کرے گی اگرچہ یہ سب کچھ بالکل بعد از وقت ہوگا جس کا نفع کچھ نہیں ہوگا۔

بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز راہ

تیسری یہ کہ ہر شخص کو یہ حقیقت ہر لحہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ بیوی بچے آدمی کے لیے صرف نعمت ہی نہیں، بلکہ بہت بڑی آزمائش بھی ہیں۔ ان کو پا کر جس طرح آدمی اس دنیا کی سب سے بڑی خوشی پالیتا ہے، اسی طرح وہ ان کی صورت میں آخرت کے لیے بہت بڑا خطرہ بھی مول لے لیتا ہے اگر وہ ان کے اندر گم ہو کے رہ جائے اور ان خطرات ومہالک کا صحیح اندازہ نہ کر سکے جو ان سے اس کو پہنچ سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ معاملہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ نہایت کٹھن ذمہ داری ہے۔ اس کو صحیح طور پر وہی انجام دے سکتے ہیں جن کو توفیق الٰہی کا خاص بدرقہ حاصل ہو اور جو محبت اور نفرت، دونوں کے اندر حدود الٰہی کا احترام قائم رکھنے کا علم اور حوصلہ رکھتے ہوں۔ سورہ تغابن کی یہ آیات ملاحظہ ہوں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ (التغابن۔۶۴:۱۴۔۱۵)

اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے لیے دشمن ہیں تو ان سے بچ کے رہو اور اگر تم معاف کرو گے، درگزر کرو گے اور بخشو گے تو اللہ غفور رحیم ہے۔ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے امتحان ہیں اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ بیوی بچے آدمی کے لیے نعمت ہی نعمت نہیں ہیں، بلکہ وہ دشمن اور بہت بڑا فتنہ بھی اس کے لیے ہیں۔ غور کیجیے کہ ان کے دشمن ہونے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا

صحیح جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اس کو اپنے دامِ محبت میں اس طرح گرفتار کرلیں کہ وہ ان کی دلداری میں نہ خدا کے حدود حرام و حلال کی کوئی پروا کرے نہ دوسروں کے حقوق و فرائض کا اس کو کچھ احساس رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے بیوی بچوں نے اس کو اپنے دامِ محبت میں پھنسا کر ہلاکت کی اس راہ پر ڈالا جس پر اس کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں ڈال سکتا تھا۔ پھر اس سے زیادہ نازک پہلو اس کا یہ ہے کہ اگر وہ ان کو دشمن سمجھ کر ان کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی ان کو کاٹ پھینکے، تو یہ بھی کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کا اپنا گھر اجڑتا ہے اور آدمی ایسے جال میں پھنستا ہے جس سے نہ صرف اس کی بلکہ اس کے بیوی بچوں اور عزیزوں، سب کی زندگی مستقل غم و الم کی نذر ہو کر رہ جاتی ہے: نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن! اگر بیوی بچوں کی خواہشوں کی تکمیل کرے تو مشکل اور اگر ان کو کاٹ پھینکنے کا ارادہ کرے تو مشکل! بیچ کی راہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیوی بچوں کی غلط خواہشوں کی تکمیل سے تو اسے بہر حال انکار کرنا ہے، اس لیے کہ ان کی خوشی کے لیے خدا کے غضب کو مول نہیں لیا جا سکتا۔ رہی بیوی بچوں کی بربھی تو جس حد تک ممکن ہو سکے ان سے درگزر کرے اور نباہ کرنے کی کوشش کرے، کوئی سخت قدم اس وقت تک نہ اٹھائے جب تک وہ یہ فیصلہ نہ کرلے کہ خدا اور ان کو بیک وقت راضی رکھنا ممکن نہیں رہا۔ آیات پر اچھی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کا منشاء یہی ہے کہ بندہ یہی راہ اختیار کرے، لیکن کیا یہ راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز نہیں ہے؟ لاریب یہ راہ ایسی ہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ بندہ بیوی بچوں کے معاملہ میں اس راہ پر چلنے کا امتحان پاس کرے:

ہشدار کی راہ بردم تیغ است قدم را!

یہاں ایک تفسیری نکتہ یہ بھی یاد رکھیے کہ سورہ تغابن کے بعد سورہ طلاق اور سورہ تحریم جو آئی ہیں تو ان میں بالترتیب یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ زندگی کے ناگوار حالات کے اندر بندے کو کس طرح اللہ تعالیٰ کے حدود کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے اور خوشگوار حالات میں کس طرح ان کی پابندی کرنی چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں ہی حالتیں آدمی کے لیے مزلہ قدم بنتی ہیں۔ محبت بھی آدمی

کو اندھا بنا دیتی ہے اور نفرت بھی۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان سے عہدہ برآ ہو سکے!

نصیحت اور وصیت

چوتھی یہ کہ آدمی ہر مناسب موقع پر بیوی بچوں کو نصیحت بھی کرتا رہے، اور جس کو توفیق حاصل ہو، وہ اپنے آخری لمحاتِ زندگی میں بھی ان کو وصیت کرے اور ان دونوں ہی چیزوں میں ان کی آخرت کی فکر مقدم رہے۔ نصیحت بھی رائگاں نہیں جاتی بشرطیکہ وہ باتیں ملحوظ رہیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں اور اگر اس کا کچھ فائدہ بظاہر نہ بھی ہو تو یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ بری الذمہ قرار پائے گا۔ رہی وصیت تو وہ اکثر حالات میں مؤثر ہوتی ہے۔ اولاد میں ذرا بھی سعادت مندی کی رمق ہو تو وہ باپ کی آخری لمحاتِ زندگی میں کی ہوئی وصیت کی لاج رکھتی ہے۔ تورات اور قرآن، دونوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرات انبیائے کرام اور بزرگ اسلاف میں وصیت کی روایت رہی ہے۔ قرآن مجید میں چند اہم وصیتوں کا حوالہ ہے، جن میں سے حضرت لقمان کی وصیت بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے لیے مثال کا کام دے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسٰنَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰبُنَيَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ ؕ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ۝

(لقمان۔۳۱:۱۲۔۱۹)

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کے شکر گزار رہو۔ اور جو شکر گزار رہے گا تو اپنے ہی لیے رہے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ اور (یاد کرو) جبکہ لقمان نے اپنے بیٹے سے، اس کو نصیحت کرتے ہوئے، کہا کہ اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیو۔ بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو ان کی بات نہ مانیو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو اور پیروی ان کے طریقہ کی کیجیو جو میری طرف متوجہ ہیں۔ پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے اور میں جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس سے تم کو آگاہ کروں گا۔ اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمانوں یا زمین میں ہو اللہ اس کو حاضر کر دے گا۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بین اور باخبر ہے۔ اے میرے بیٹے! نماز کا اہتمام رکھو، نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں۔ اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اکڑ نہ چل، اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ۔ بے شک سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔

یہ لقمان، جہاں تک علم ہے، کوئی نبی نہیں تھے، بلکہ یہ عرب کے حکماء میں سے ایک جلیل القدر حکیم تھے اور غالباً ان کو ان کے علاقہ میں پدرسرانہ قسم کی سرداری بھی حاصل تھی۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے محسوس فرمایا ہے کہ اب ان کی ذمہ داریاں بیٹے کی طرف منتقل ہونے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ وصیت اتنی پسند آئی کہ یہ وحی الٰہی کا ایک حصہ بن کر زندہ جاوید بن گئی۔

باب ۳۴

آدمی کا تعلق غرباء و یتامیٰ اور پڑوسیوں سے

مومن ایمان سے فیض یاب ہو کر جس جگہ بھی بیٹھتا ہے اس کا بیٹھنا اس شجرۂ طیبہ کے مانند ہوتا ہے جس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے خنک سایہ میں خلق پناہ لیتی ہے اور اس کے پھولوں اور پھلوں سے لوگ بہرہ یاب اور شاد کام ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کی تعریف اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ. (ابراہیم۔۱۴:۲۴) (جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔) کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ وہ ٹھونٹھ درخت کے مانند نہیں ہوتا جس میں نہ سایہ ہو نہ پھل، صرف بار زمین بن کے رہ گیا ہو اور نہ اس درخت کے مانند جو اپنے اردگرد زمین کی ساری صلاحیتیں ہضم کر کے موٹا تو ہو جائے، لیکن نہ اس کا سایہ خوش گوار ہو نہ اس کے پھل۔

ایک مومن کا فیض جس ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے ماحول میں بڑھتا اور پھیلتا ہے اس پر سورہ نساء کی اس آیت سے نہایت عمدہ طریقہ پر روشنی پڑتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝

(النساء۔۴:۳۶)

> اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین، قرابت مند، یتیم، مسکین، قرابت دار پڑوسی، بیگانہ پڑوسی، ہم نشین، مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت پر تدبر کیجیے تو اس سے بہت سی حقیقتیں سامنے آئیں گی، جن سے واضح ہوگا کہ ایک مومن کی زندگی پر اس کا ایمان کس نوعیت سے اثر انداز ہوتا اور درجہ بدرجہ کس طرح اس کو اردگرد کے لوگوں کے ساتھ حقوق اور فرائض کی لڑیوں میں پروتا چلا جاتا ہے۔

پہلی بات تو اس سے یہ سامنے آتی ہے کہ مومن پر سب سے بڑا حق اس کے رب کا ہے، جو اس کا خالق اور تمام مادی و روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ حق بندگی، عبادت اور اطاعت کا ہے اور اس کی لازمی شرط یہ بتائی گئی ہے کہ یہ کامل اخلاص کے ساتھ ہو، اس میں کسی دوسری ذات یا کسی دوسری شے کو شریک نہ کیا جائے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد بندے پر سب سے بڑا حق اس کے والدین کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی پیدائش و پرورش میں جس نوعیت کا دخل ان کو ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ حق صرف احسان، فرمانبرداری اور خدمت تک محدود ہے، خدا کے حق عبادت میں وہ بھی شریک نہیں کیے جاسکتے، بلکہ ان کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ اولاد کو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی تعمیل سے روک سکیں۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ والدین کے بعد قرابت داروں کا حق ہے، خواہ وہ پدری رشتہ سے قرابت دار ہوں یا مادری رشتہ سے۔ یہ بھی حسن سلوک، محبت اور صلۂ رحم کے حقدار ہیں۔

چوتھی ایک نہایت دقیق حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ قرابت داروں کے بعد اس احسان میں یتامیٰ اور مساکین بھی شامل ہیں۔ ان کا ذکر اس طرح آیت میں آیا ہے گویا یہ بھی قرابت داروں ہی کے زمرہ میں شامل ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی معاشرہ میں یتامیٰ اور مساکین کو ہر آدمی اس نگاہ سے دیکھے گویا وہ اس کے عزیز و رشتہ دار ہیں اور اسی جذبہ سے ان کی خدمت اور سرپرستی کرے۔ خاص طور پر یتامیٰ سے متعلق تو یہ تصریح بھی قرآن مجید میں آئی ہے کہ ان کے ساتھ صرف احسان کا نہیں، بلکہ اکرام کا سلوک کیا جائے۔ یعنی وہ کس مپرسی کی زندگی کے بجائے

اسلامی معاشرہ میں سب کی آنکھوں کے تارے بن کر زندگی گزاریں اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے سب بیدار اور چوکنے رہیں۔

آیت کے آخر میں پڑوسی کا ذکر آیا ہے اور یہ ذکر اس طرح آیا ہے کہ آدمی سب سے پہلے قرآن مجید کی اس آیت ہی سے یہ جانتا ہے کہ پڑوسی کا مفہوم کتنا وسیع ہے۔ جن لوگوں نے مذاہب اور معاشرتی اخلاقیات کا مطالعہ کیا ہے وہ کوشش کے بعد بھی یہ سراغ نہیں دے سکتے کہ قرآن سے پہلے کسی مذہب نے بھی پڑوسی کا یہ تصور دیا ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ معاشرتی پہلو سے غایت درجہ اہمیت رکھنے والا ہے، لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ ہمارا یہی معاشرہ جس کے ہر گوشہ میں جنگل کا قانون کارفرما ہے، جنت کے معاشرے کی مثال بن گیا ہے۔ اس وجہ سے ہم اس پر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔

پڑوسی کی تین قسمیں

عام طور پر لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ جس کا مکان ان کے مکان سے متصل اور جس کا دروازہ ان کے دروازے کے سامنے ہو وہ ان کا پڑوسی ہے، حالانکہ یہ صرف پڑوسی کی ایک قسم ہے۔ قرآن مجید نے تین قسم کے لوگوں کو آپ کے پڑوسی کا درجہ دیا ہے۔

پہلی قسم کا پڑوسی

ایک پڑوسی وہ ہے جو آپ کا پڑوسی بھی ہے اور قرابت مند بھی ہے۔ قرآن نے اس کو جار ذی القربیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ آپ کی ہمدردی اور مدد کا دوسرے پڑوسیوں سے زیادہ حق دار ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر یہ تصریح بھی ہے کہ اگر اس کے خلاف دل میں کسی سبب سے کچھ کدورت بھی ہو جب بھی اس کو نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح کے قرابت دار کے لیے جو انفاق کیا جائے گا اس کا اجر زیادہ ملے گا۔

یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن مجید نے یہ حقوق جو بیان فرمائے ہیں ان میں ترتیب الاقدم فالاقدم کی ہے اور اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو ملحوظ نہ رکھے بلکہ اپنی

خواہشات کی پاسداری میں اس کو الٹ پلٹ دے تو اندیشہ ہے کہ وہ اپنے انفاق سے کچھ اجر کمانے کے بجائے اس کو بالکل ضائع کر بیٹھے۔ فرض کیجیے، ایک شخص کو اپنے والدین کے حقوق کا تو کچھ خیال نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے پڑوسیوں کی لڑکیوں کے جہیز تیار کرانے میں بڑا فیاض ہے یا اپنے قرابت دار پڑوسی سے تو بے پرواہ ہے، لیکن دوسروں کی حمایت و ہمدردی میں بڑا سرگرم ہے تو گو اس کے یہ کام نیکی اور بھلائی کے ہیں، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی ترتیب کو بدل دینے کے سبب سے اپنا اجر کھو بیٹھے گا۔

دوسری قسم کا پڑوسی

دوسرا پڑوسی وہ ہے جو اگرچہ آپ کا قرابت دار تو نہیں ہے، لیکن پڑوسی ہے۔ قرآن مجید نے اس کو الجار الجنب (اجنبی پڑوسی) سے تعبیر کیا ہے۔ اجنبیت رشتہ اور قرابت نہ ہونے کے سبب سے بھی ہو سکتی ہے اور دینی اشتراک نہ ہونے کے باعث بھی ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے، وہ کوئی ہندو، عیسائی یا پارسی ہے اور آپ مسلمان ہیں۔ اس اجنبیت کے باوجود وہ آپ کا پڑوسی قرار پائے گا اور از روئے قرآن یہ آپ کا فرض ہوگا کہ آپ اس کے حقوق جار کا احترام ملحوظ رکھیں۔ بعض صورتوں میں دین اور قرابت کی بنیاد پر کسی کو ترجیح و تقدیم تو حاصل ہو سکتی ہے، یہ ایک فطری اور عقلی چیز ہے، لیکن یہ ترجیح و تقدیم دوسرے کے واجبی حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ہوگی، ان کو نظر انداز کر کے نہیں ہوگی۔

تیسری قسم کا پڑوسی

تیسری قسم کا پڑوسی وہ ہے جو عام مفہوم میں تو پڑوسی نہیں ہے، بلکہ ریل میں، بس میں، ہوائی جہاز میں، ہوسٹل میں، ہوٹل میں، مجلس میں، مسجد میں، عارضی اور وقتی طور پر آپ کا ہم نشین یا ساتھی بن گیا ہے۔ قرآن مجید نے اس کو الصاحب بالجنب (ہم نشین) سے تعبیر کیا ہے اور اس کے لیے بھی اسی طرح احسان اور حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے جس طرح مذکورہ بالا قسم کے پڑوسیوں کے لیے فرمائی ہے۔ حالات اور مواقع کے لحاظ سے حسن سلوک اور ہمدردی کی صورتیں مختلف ہو

جائیں گی، لیکن بہر حال آپ پر واجب ہوگا کہ آپ ہر جگہ اس کے لیے ایک شریف، کریم النفس اور قابل اعتماد ساتھی ثابت ہوں۔ اور یہ چیز صرف ایک اخلاقی فضیلت کی حیثیت سے مطلوب نہیں ہے بلکہ آگے آپ دیکھیں گے کہ یہ ایمان کا بدیہی تقاضا ہے۔

پڑوسی کے حقوق کی اہمیت

اب آیئے دیکھیے کہ پڑوسی کے حقوق کی اہمیت پر نبی کریم ﷺ نے کس طرح زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضور ﷺ کا یہ ارشاد سامنے رکھیے جس کی روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمائی ہے:

> عن عائشة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: مازال جبريل يوصيني بالجار حتى ظننت انه سيورثه. (سنن الترمذی: کتاب البر والصلۃ باب ۲۸)
>
> حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جبریلؑ نے مجھے پڑوسی کے باب میں نصیحت کرنی شروع کی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب وہ اس کو (پڑوسی کو) وراثت میں حصہ دار بنا دیں گے۔

پڑوسی کے حقوق کی عظمت و اہمیت کی اس سے زیادہ دل نشین تعبیر نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر چند وہ رحمی اور صلبی قرابت داروں کی طرح وراثت میں تو حصہ دار نہیں بنایا گیا ہے، لیکن اس کے حقوق کی اہمیت کے اعتبار سے اس کو یکے از آں جملہ سمجھنا چاہیے۔ اس کے ساتھ احسان و اکرام کا جو حکم دیا گیا ہے اس کو محض ایک فضیلت اور نیکی نہیں خیال کرنا چاہیے، بلکہ ایک حق واجب کی طرح ادا کرنا چاہیے۔

نبی ﷺ نے پڑوسی سے متعلق حقوق و فرائض کی وضاحت مثبت اور منفی، دونوں ہی پہلوؤں سے فرمائی ہے۔ یعنی یہ بھی بتایا ہے کہ اپنے آپ کو ایک اچھا پڑوسی ثابت کرنے کے لیے ایک مومن کو اپنے پڑوسی کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح کی باتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ ان سب باتوں کی تفصیل میں طوالت ہوگی، اس وجہ سے ہم تفصیل میں جانے کے بجائے دو اصولی باتیں عرض کرتے ہیں۔ امید ہے ان کی روشنی میں ہر طالب خیر خود

تفصیل کو سمجھ لے گا۔

مثبت پہلو سے اصولی ہدایت

مثبت پہلو سے نبی ﷺ نے جو ہدایت دی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین پڑوسی وہ ہے جس کا معاملہ اپنے پڑوسی کے ساتھ بہترین ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

> قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ خیر الاصحاب عند اللّٰہ خیرھم لصاحبہ وخیر الجیران عند اللّٰہ خیر ھم لجارہ۔ (سنن الترمذی: کتاب البر والصلۃ باب ۲۸)
>
> انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہترین رہا ہے اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہترین ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے بہترین ساتھی یا بہترین پڑوسی ہونے کا فیصلہ اس کے تعلقات اور روابط سے الگ کر کے نہیں ہو سکتا، بلکہ لازم ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زندگی کے مختلف مراحل میں وہ جن کا ساتھی اور پڑوسی رہا ہے ان کے ساتھ اس کا معاملہ کیسا رہا ہے اور اس کے باب میں ان کی شہادت کیا رہی ہے یا کیا ہے؟ اگر اس اعتبار سے اس کا ریکارڈ اچھا ہے تو لاریب وہ بہترین ساتھی اور بہترین پڑوسی ہے اور اگر یہ چیز موجود نہیں ہے تو اس کی مدح سرائی میں آسمان و زمین کے قلابے ملانے سے کچھ حاصل نہیں۔ آدمی اپنے تعلقات و معاملات سے پہچانا جاتا ہے۔ جو اس کسوٹی پر نہیں پرکھا گیا اس کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جو اپنوں کے حقوق ادا کرنے میں ناکام رہا، اس نے اگر دوسروں کے لیے فیض کے دریا بھی جاری کیے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھیے کہ ایک اچھے پڑوسی کے رویہ میں اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا سابقہ اچھے پڑوسیوں سے رہا ہے یا برے پڑوسیوں سے۔ اس کے پڑوسی اچھے ہوں جب بھی وہ اچھا رہتا ہے اور برے ہوں جب بھی وہ اچھا رہتا ہے۔ اس کی بہترین مثال خود

ہمارے نبی کریم ﷺ ہیں۔ مکی زندگی کے دور میں آپؐ بدترین پڑوسیوں کے نرغہ میں رہے، لیکن ان برے پڑوسیوں نے بھی آپؐ کے بہترین پڑوسی ہونے کی شہادت دی اور علی رؤوس الاشہاد اعتراف کیا کہ آپ بہترین ساتھی اور بہترین پڑوسی ہیں۔

منفی پہلو سے اصولی تلقین

اسی طرح منفی پہلو سے بھی ایسی جامع ہدایتیں اس باب میں حضور ﷺ نے دی ہیں جو ہماری رہنمائی کے لیے بالکل کافی ہیں۔ مثلاً:

> عن ابی شریح ان النبی ﷺ قال: واللّٰہ! لایؤمن. واللّٰہ! لایؤمن. واللّٰہ! لا یؤمن. قیل: ومن؟ یا رسول اللّٰہ! قال: الذی لا یامن جارہ بوائقہ.
> (صحیح البخاری: کتاب الادب باب ۲۹)
>
> حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! وہ شخص ایمان نہیں رکھتا! خدا کی قسم! وہ شخص ایمان نہیں رکھتا! خدا کی قسم! وہ شخص ایمان نہیں رکھتا! سوال کیا گیا کہ کون؟ یا رسول اللہ! ارشاد ہوا: وہ جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی مامون نہ ہو۔

سب سے پہلے اس کلام کے تیور پر غور فرمائیے۔ آپؐ ایک بار نہیں، بلکہ تین بار اعادۂ قسم کے ساتھ فرماتے ہیں کہ وہ شخص ایمان نہیں رکھتا! غور کیجیے کہ کتنی اہم اور ہولناک خبر ہے! اس کو سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے ہوں گے، لیکن آپؐ نے اس کی وضاحت اس وقت تک نہیں فرمائی جب تک لوگوں نے سوال نہیں کیا کہ ایسا محروم الایمان کون ہے؟ یارسول اللہ! جس کے ایمان کی اس شدت کے ساتھ نفی فرمائی جا رہی ہے! ظاہر ہے کہ یہ طریقہ آپؐ نے اس لیے اختیار فرمایا کہ ہر شخص اس بات کو سنے اور کان کھول کر سنے۔

اس کے بعد اس بات پر غور فرمائیے کہ آپؐ ایمان کے لیے اس تاکید کے ساتھ صرف اس شرط کو ضروری نہیں قرار دیتے کہ ایک مومن کے پڑوسی اس کی ایذا اور تعدی سے محفوظ رہیں، جیسا کہ بعض روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ اس

کے پڑوسی اس کی طرف سے ہر اندیشہ سے بالکل نچنت رہیں۔ یہ بات صرف اس شکل میں ممکن ہے جب انہوں نے ہر قسم کے نرم وگرم حالات میں تجربہ کر کے اس کی شرافت وفتوت اور اس کی کریم النفسی اور حق شناسی کا ایسا تجربہ کرلیا ہو کہ انہیں یہ پورا اطمینان ہو کہ خواہ کچھ ہی ہو جائے، لیکن اس شخص کو کوئی خوف اور کوئی طمع اس کے ادائے فرض سے روک نہیں سکتا۔ اگر کوئی امتحان پیش آ گیا تو یہ اپنی جان تو قربان کر دے گا، لیکن اپنی فتوت پر آنچ نہیں آنے دے گا۔

یہاں یہ امر بھی پیش نظر رکھیے کہ پڑوسی چونکہ ہر وقت کا ساتھی ہے، اس وجہ سے اطمینان یا بے اطمینانی پیدا کرنے میں جو حصہ اس کا ہو سکتا ہے کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ نقصان پہنچانا چاہے تو آپ کی ہر غفلت اور ہر کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر آپ کی مدد کرنا چاہے تو وہ گویا آپ کی آنکھ، آپ کا کان اور آپ کا اپنا دست وبازو ہے۔ دور والے اگرچہ کوئی بڑی سے بڑی مدد پہنچا سکنے کی پوزیشن میں بھی ہوں، لیکن وہ اچھے پڑوسی کے نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ آدمی کو بسا اوقات اپنے جان ومال سے زیادہ اپنے عزت وناموس کے لیے فکر مند ہونا پڑتا ہے اور یہ چیز ایسی ہے جس میں ایک شریف پڑوسی سے جس طرح بڑی سے بڑی مدد مل سکتی ہے اسی طرح ایک کمینہ پڑوسی سے بڑا سے بڑا خطرہ بھی پہنچ سکتا ہے۔

باب ۳۵

آدمی کا تعلق معاشرہ سے

آدمی ایک اثر پذیر ہستی ہے اور یہ اثر پذیری اس کی ایک نہایت اعلیٰ صفت ہے۔ اس کے فیض سے وہ اپنے بڑوں کے طور طریقے اور ان کے آداب وافکار اپناتا ہے اور پھر ان کو اپنے بعد والوں کی طرف منتقل کرنے والا بنتا ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی ایک پتھر بن کر رہ جائے، نہ پچھلوں سے کچھ لینے والا بن سکے نہ اگلوں کو کچھ دینے والا۔ لیکن اس خوبی کا ایک خطرناک پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کی بدولت وہ جس طرح دوسروں کے اچھے عادات واطوار کی چھاپ قبول کر لیتا ہے اسی طرح ان بری روایات اور ان کے برے آثار کے نقوش بھی قبول کر لیتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہایت خطرناک ہے۔ اس کے سبب سے اس کا پورا اندوختہ، اگر وہ اس کی برابر چھان پھٹک نہ کرتا رہے، رطب ویابس کا ایک انبار بن کر رہ جاتا ہے۔ بچپن میں تو اس چھان پھٹک کی صلاحیت نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ ماں باپ کے ڈالے ہوئے اثر قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

> ما من مولود الا یولد علی الفطرة. فابواه یهوّدانه و ینصرانه و یمجّسانه.
>
> (صحیح مسلم: کتاب القدر، باب ۶)

ہر بچہ پیدا ہوتا ہے فطرت اسلام پر، لیکن اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد آدمی کے عقلی ہستی ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اس سارے ذخیرے کا، جو اس کو آباء واجداد سے ملا ہے، جائزہ لے کر دیکھے کہ اس میں کتنا حق ہے، کتنا باطل۔ اگرچہ باپ دادا کے طریقہ سے آدمی کو نہایت گہرا انس ہوتا ہے، اس کو وہ آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر عاقل وبالغ کے لیے یہ امتحان رکھا ہے کہ وہ مجرد اس وجہ سے کسی طریقہ پر جما نہ رہے کہ وہ اس کے باپ دادا سے چلا آرہا ہے، بلکہ اس کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھے کہ وہ اس کو قبول کرتی ہے یا نہیں اور اس کے باپ دادا ہدایت پر تھے یا گمراہی پر۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ؁ (البقرۃ۔۲:۱۷۰)

اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جبکہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہ ہدایت پر رہے ہوں؟

اس سے معلوم ہوا کہ کسی طریقہ کے اچھے ہونے کی مجرد یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ باپ دادا نے اس طریقہ کو اندھی تقلید کی بنا پر اختیار کیا ہے یا سمجھ بوجھ کر۔ اگر یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ باپ دادا بڑے لکیر کے فقیر رہے ہیں اس نے ان کی پیروی کی تو اس کی مثال اس اندھے کی ہوگی جس نے دوسرے اندھے کو اپنا عصاکش یا رہنما بنالیا۔

باپ دادا کے طریقہ کے سند ہونے کی دوسری شکل یہ ہے کہ اطمینان بخش دلائل سے یہ علم ہو کہ ہمارے اسلاف میں فلاں گروہ ہدایت یافتہ گروہ رہا ہے۔ مثلاً ہم پورے اطمینان قلب کے ساتھ جانتے اور مانتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے اصحاب اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر تھے۔ اپنے اس اطمینان کی بنا پر ہم ان کے طریقہ کو سند مانتے ہیں اور بسا اوقات ان لوگوں کے طریقہ کو سند نہیں مانتے جو ان کے بعد ہوئے اگرچہ باپ دادا ہونے کے اعتبار سے وہ

پہلوں کے مقابل میں ہم سے قریب تر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ مجرد باپ دادا کا طریقہ ہونا کسی بات کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، بلکہ حق ہونے کے دلائل اس سے الگ ہیں۔ حق کے طالب کو نگاہ ان پر جمانی پڑتی ہے۔

زندگی پر معاشرے کے ان گہرے اور دیرپا اثرات کے سبب سے ہر عاقل وبالغ پر اس سے متعلق چند نہایت اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کا تقاضا انسان کی عقل بھی کرتی ہے اور ان کا حکم شریعت نے بھی دیا ہے۔ ہم یہاں بالاجمال ایک مناسب ترتیب سے ان کا ذکر کریں گے۔

مرحلۂ دعوت

پہلی ذمہ داری ہر ذی ہوش پر یہ ہے کہ وہ معاشرہ کے بناؤ اور بگاڑ سے بے تعلق نہ رہے، بلکہ جو خرابی بھی اس کے اندر سر اٹھاتی نظر آئے، اپنے امکان اور صلاحیت کے حد تک، اس کو روکنے کی کوشش کرے۔ اگر یہ خیال کر کے کہ پرائے جھگڑے میں پڑ کر اپنے لیے کیوں مصیبت خریدیے، کوئی شخص اپنا فرض ادا کرنے سے گریز کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ اس کی اس سہل انگاری کے نتیجہ میں جو برائی جڑ پکڑے گی، ہوسکتا ہے کہ وہ پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور ایک دن اس کا خمیازہ اس کو بھی اور اس کی آئندہ نسلوں کو بھی بھگتنا پڑے۔ آج تو امکان ہے کہ معمولی کوشش سے معمولی مخالفت کا مقابلہ کر کے اس فتنہ کو دبایا جاسکے، لیکن کل کو شاید سر دے کر بھی اس کو دبانا ممکن نہ رہے۔

یہ حقیقت نبی کریم ﷺ نے ایک کشتی کے مسافروں کی تمثیل سے سمجھائی ہے کہ جس طرح ایک کشتی میں کچھ لوگ اس کے اوپر کے حصہ میں سفر کرتے ہیں اور کچھ اس کے نیچے کے حصہ میں، لیکن کشتی کی سلامتی کی فکر دونوں کو کرنی پڑتی ہے۔ نہ اوپر والے نیچے والوں کے کسی غلط اقدام سے بے پروا رہ سکتے، نہ نیچے والوں کے کسی نقصان رساں فعل سے اغماض برت سکتے۔ اگر ایسا کریں تو دونوں تباہ ہوسکتے ہیں۔ فرض کیجیے، نیچے والے یہ سوچ کر کہ ان کو پانی لینے کے لیے بار بار اوپر جانے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے تو کیوں نہ وہ کشتی کے پیندے میں سوراخ کر کے اپنے لیے پانی کا انتظام کرلیں اور اوپر والے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے حصہ میں سوراخ کر رہے ہیں تو یہ پرائے

قضیہ میں کیوں مداخلت کریں؟ ان کو جو کچھ وہ چاہتے ہیں کرنے کے لیے چھوڑ دیں تو جب اس عمل کے نتیجہ میں کشتی ڈوبے گی تو اوپر اور نیچے، دونوں حصوں کے مسافروں کے ساتھ ڈوبے گی۔

یہی حال ایک معاشرہ کے افراد کا ہے۔ اگر اس کے کچھ افراد کسی برائی کی نیو ڈالیں اور دوسرے، جو ان کو سمجھانے یا روکنے کی پوزیشن میں ہیں، ان کے ہاتھ نہ پکڑیں، اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر یا کسی خوف اور مصلحت کے سبب سے، اس سے بے تعلق رہیں تو ہوسکتا ہے کہ اس سے جو شر پیدا ہو ایک دن وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور پھر اس کے آخری نتیجہ کے طور پر اگر خدا کا کوئی قہر نازل ہو تو وہ سب کو فنا کر دے۔

یہ ذمہ داری بحیثیت ایک ذمہ داری کے تو معاشرہ کے تمام افراد پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس کے ادا کرنے میں چونکہ صلاحیت بھی درکار ہے اس وجہ سے جتنی جس کے اندر صلاحیت ہوگی اسی مقدار میں اس کی ذمہ داری ہوگی۔ اگر ایک شخص برائی کو روک دینے کا اختیار رکھنے والا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس کو روکنے کے لیے اپنا اختیار استعمال کرے۔ اگر ایک شخص اختیار یا اثر تو نہیں رکھتا، لیکن زبان یا قلم سے اس کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے تو وہ اس کے خلاف زبان اور قلم سے جہاد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ صلاحیت بھی نہیں رکھتا تو ادنیٰ درجہ میں اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کو اپنے دل میں برا سمجھے اور اپنے آپ کو اس کے ہر شائبہ سے دور رکھے۔ اس آخری درجہ سے متعلق انکار منکر والی حدیث میں نبی ﷺ کے الفاظ یہ ہیں کہ ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل. (صحیح مسلم: کتاب الایمان باب ۲۰) (اور اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ رائی کے دانہ کے برابر بھی نہیں ہے)۔

یہ معاشرہ کے ہر فرد پر معاشرہ کا ایک حق ہے جس کو ادا کرنا واجب ہے۔ یہ کوئی احسان نہیں ہے کہ جی چاہا کیا، جی نہ چاہا تو ٹال دیا۔ جس طرح ہر فرد پر اس کے ماں باپ اور بیوی بچوں کے حقوق ہیں، جن کو ادا کرنے کی کوشش کرنا اس پر لازم ہے، اسی طرح معاشرہ کے بھی ہر شخص پر اس کی صلاحیت کے مطابق حقوق ہیں، جن کو ادا کیے بغیر کوئی شخص خلق اور خالق کے آگے سرخرو نہیں ہوسکتا۔ نیز یہ حقیقت بھی یاد رکھیے کہ یہ جو حقوق معاشرہ کے ہیں وہ معاشرہ ہی کو ادا کرنے سے ادا ہوں گے، دوسروں کو ادا کرنے سے ادا نہ ہوں گے۔ اگر دعوت دین کا

علم اٹھا کے آپ امریکہ اور افریقہ کے سفر کے لیے تو روز پابہ رکاب رہتے ہیں، لیکن وہ گمراہی جو آپ کی اپنی قوم کے گھر گھر میں پھیلی ہوئی ہے آپ کو نظر نہیں آتی یا اتنی سنگین نظر نہیں آتی جتنی امریکہ کی نظر آتی ہے تو آپ کی یہ حق تلفی آپ کی اس نیکی کی وجہ سے، جو آپ باہر کرتے ہیں، کچھ ہلکی نہیں ہو جائے گی۔ بلکہ آپ کی مثال اس شخص کی ہوگی جو اپنے بیرونی دوستوں کو آئے دن ہوٹلوں میں ڈنر پر بلانے اور ان کے ڈنر میں جانے کے لیے تو بڑا فیاض ہے، لیکن اس کے اپنے بیوی بچے گھر میں بھوکے ہوتے ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے کہ میرے پاس جو روٹی ہے وہ بچوں ہی کے لیے ہے، اس کو کتوں کے آگے ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔

پس داعیان دین پر یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے کہ یہ کوئی تجارت نہیں ہے کہ اس کے لیے میدان دنیوی نفع و نقصان کے پیش نظر رکھ کر تلاش کیا جائے بلکہ یہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اپنے معاشرہ سے متعلق ایک فرض ہے جو ہر اس شخص پر عائد ہوتا ہے جو معاشرہ کی کسی خدمت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس فرض کو اپنے ہی معاشرہ کے اندر ادا کرنا ہے، خواہ اس کی زمین کتنی ہی بنجر ہو۔ یہ آپ کے اوپر معاشرہ کا ایک قرض ہے جو اس کو ادا کر کے آپ اس سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ اس باب میں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت تو یہ ہے کہ انہوں نے اسی معاشرہ کو اپنی تمام دعوتی سرگرمیوں کا میدان بنایا جس کے اندر سے وہ اٹھے اور اس وقت تک اس میدان میں ڈٹے رہے جب تک ان کو وہاں سے ہٹنے کی اجازت نہ ملی۔ کسی نبی کے متعلق بھی یہ بات علم میں نہیں آئی ہے کہ اس نے اپنا معاشرہ چھوڑ کر دعوت کے لیے دوسرے جزیروں کی تلاش میں خشکی اور تری کا سفر کیا ہو۔ انہوں نے اپنے معاشرہ سے باہر قدم اسی وقت نکالا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو ہجرت کا حکم دیا ہے اور یہ حکم ان کو اس وقت دیا گیا ہے جب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اس معاشرہ کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے۔

معاشرہ کی خدمت چونکہ اس کے ایک واجب حق کی حیثیت سے کی جاتی ہے، اس وجہ سے اس کا کوئی صلہ اس سے نہیں چاہا جاتا۔ چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ اعلان ہوا ہے کہ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (الشعراء ۲۶: ۱۰۹) (اور میں اس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو عالم کے خداوند کے ذمہ ہے)۔ اسی طرح بعض

نبیوں سے یہ بھی ماثور ہے کہ ھم نے مفت پایا ھے ' مفت بانٹ رھے ھیں. داعیانِ حق کی یہی بے غرضی اس دعوت کی اصل امتیازی صفت رہی ہے اور ایسے ہی داعیوں نے دین کی خدمت کی توفیق پائی ہے نہ کہ گداؤں نے جو کشکول گدائی لیے مشرق و مغرب کے چکر لگاتے پھرتے ہیں۔

اس دعوت کے باب میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے صالح متبعین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ کسی نے ان کی بات سنی یا نہیں سنی، لیکن انہوں نے اپنی دعوت اس وقت تک جاری رکھی جب تک اس کا امکان پایا۔ یہ نہیں ہوا کہ چند دن کام کرنے کے بعد اگر اندازہ ہوا کہ یہ زمین کچھ زیادہ زرخیز نہیں ہے تو وہاں سے خیمے اکھاڑ کر کسی اور مقام پر ڈیرے ڈال دیے۔ ان کی جدوجہد کا انحصار لوگوں کے التفات پر نہیں، بلکہ اپنے ادائے فرض پر رہا۔ انہوں نے اپنا محاذ اسی وقت بدلا ہے جب ان پر واضح ہو گیا کہ اس محاذ پر اپنے فرض سے وہ سبکدوش ہو گئے۔

قرآن مجید میں ان داعیانِ اصلاح کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جو سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کی اصلاح کے لیے اٹھے تھے۔ ایک مدت کی دعوت کے بعد بھی جب ان کی بات پر کسی نے کان نہیں دھرے تو ان کے بعض ساتھیوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ جو لوگ اتنے قسی القلب ہیں کہ کوئی بات سننے کے روادار ہی نہیں، ان کے پیچھے وقت برباد کرنے سے کیا حاصل؟ یہ سوال اور اس کا جواب سورہ اعراف میں یوں نقل ہوا ہے:

> وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○ (الاعراف۔ ۷:۱۶۴)
>
> اور (یاد کرو) جبکہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جا رہے ہو جنہیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں ایک سخت عذاب دینے والا ہے؟ وہ بولے کہ یہ اس لیے کہ یہ تمہارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے اور تاکہ یہ خدا کے غضب سے بچیں۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں اپنا مشن اصلاً تو اس لیے جاری رکھنا ہے کہ ہمارا عذر عند اللہ واضح ہو جائے کہ ہم نے معاشرہ کی اصلاح سے متعلق اپنی ذمہ داری پوری کر دی، قطع نظر اس سے کہ

لوگوں نے ہماری سنی یا اپنے کان بند رکھے۔ علاوہ ازیں امکان اس کا بھی ہے کہ شاید کسی مرحلہ میں یہ کان کھولیں اور توبہ و اصلاح کر کے اپنے کو اللہ کے عذاب سے بچانے کی فکر کریں۔ ہم غیب نہیں جانتے اس وجہ سے ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنے کام میں لگے رہیں اور لوگوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑیں۔

رہا یہ سوال کہ معاشرہ کے مصلحین کے لیے کب یہ جائز ہوتا ہے کہ وہ اس سے اعلان براءت کر کے علیحدہ ہوں تو اس کا جواب قرآن حکیم کی روشنی میں یہ ہے کہ جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے ان کے لیے براءت کے اعلان کا وقت خود اللہ تعالیٰ مقرر فرماتا ہے۔ وہ اللہ ہی کی طرف سے ایک محاذ پر مامور کیے جاتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے اس وقت تک ہٹنا جائز نہیں ہے جب تک وہی ان کو اجازت نہ دے۔ قرآن مجید میں حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا ہے کہ ایک مدت تک وہ اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے، لیکن کسی نے ان کی بات نہ سنی۔ بالآخر وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے کہ جو لوگ اتنے ناقدرے ہیں کہ حق بات ان کو سننی ہی گوارا نہیں ان کے آگے حق کو پیش کر کے اس کی ناقدری کرانے سے کیا حاصل! اگرچہ حضرت یونس علیہ السلام کا یہ اقدام غیرتِ حق کے جوش میں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ اس کے نتیجہ میں ان کو ایک سخت ابتلاء سے سابقہ پیش آیا، جس سے ان کو بڑے توبہ و استغفار کے بعد رہائی ملی، پھر اس رہائی کے بعد حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم میں واپس جا کر دعوت کے کام کو از سر نو شروع کریں جس کو چھوڑ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ قوم میں واپس گئے اور ان کی اس دوبارہ دعوت سے اللہ تعالیٰ کی یہ شان ظاہر ہوئی کہ ان کی پوری قوم، ملک کے بادشاہ سمیت، ایمان سے مشرف ہو گئی۔

رسولوں کے سوا دوسرے لوگ جو رسولوں کے طریقہ پر کام کرتے ہیں ان کے لیے قرآن نے اصحاب کہف کے واقعہ میں رہنمائی دی ہے کہ ان کو اس وقت تک اپنی قوم کے اندر اپنے مشن میں لگے رہنا چاہیے جب تک وہ اس کو جاری رکھنے کا امکان پائیں۔ جب وہ یہ دیکھیں کہ دشمنوں نے ان کے لیے تمام راستے بند کر دیے ہیں اور اب اگر ایک قدم بھی ان کی مرضی کے خلاف اٹھایا گیا تو اندیشہ ہے کہ ان کی زندگی اور ان کی دعوت دونوں آخری خطرہ سے دوچار ہو جائیں تب ان کے لیے جائز ہوتا ہے کہ جدھر بھی ان کو کوئی راہ نظر آئے اُدھر کے لیے اللہ کے بھروسا پر، اٹھ کھڑے

ہوں۔ یہاں تک کہ اگر کسی غار میں پناہ لینی پڑ جائے تو یہ بھی کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں بھی ان کے لیے روشنی اور اسباب زندگی مہیا کرے گا۔ یہ بات یاد رکھیے کہ قرآن مجید میں یہ تصریح موجود ہے کہ اصحاب کہف نے غار میں پناہ اس وقت لی ہے جب ان کی قوم نے ان کو یہ آخری دھمکی دے دی ہے کہ اب یا تو اپنے باپ دادا کے دین پر واپس آجاؤ، ورنہ ہم تمہیں سنگ سار کر دیں گے!

مرحلۂ ہجرت

اس زمانے میں جو لوگ دعوت دین کے دعوے کے ساتھ اٹھتے ہیں وہ پیدا ہوتے ہی لوگوں سے ہجرت اور جہاد کی بیعت لینی شروع کر دیتے ہیں۔ غلبۂ اسلام کا موضوع ایک عوام پسند موضوع ہے، اس وجہ سے وہ پہلا ہی قدم آخری منزل کے لیے اٹھاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لوگ غلبۂ اسلام کے لیے انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہیں، اب ان کو مزید انتظار کی زحمت نہیں دینی چاہیے۔ ان بے خبر جلد بازوں کو کون بتائے کہ ان کی جلد بازی کی وجہ سے راہ کے عقبات اور مراحل طے نہیں ہو جائیں گے۔ ہوگا یہ کہ یہ اپنی بے علمی اور حماقت کی وجہ سے ان ناکامیوں کی فہرست میں ایک اور عبرت انگیز اضافہ کریں گے جو پہلے ہی سے کافی طویل ہے۔

ہجرت سے متعلق پہلی بات تو یہ یاد رکھیے کہ یہ ہر دعوت کے لوازم و واجبات میں سے نہیں ہے کہ پہلے ہی دن سے اس کے لیے بیعت لینا ضروری ہو۔ اول تو، جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا، اس کا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب داعی اپنے فرض دعوت سے سبکدوش ہو چکا ہو، دوسرے یہ کہ ہر داعی کے لیے اس مرحلہ کا پیش آنا ضروری نہیں ہے۔ حضرات انبیا علیہم السلام میں سے جو صرف نبی تھے، رسول نہیں تھے، ان میں سے کسی کے متعلق بھی معلوم نہیں ہے کہ ان کو یہ مرحلہ پیش آیا ہو۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض کو مقدس کے عین منبر و محراب کے درمیان قتل کر دیا گیا، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ ان کی جان خطرے میں ہے انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ البتہ رسولوں کو یہ مرحلہ پیش آیا ہے، لیکن ان میں سے بھی ہر ایک کے متعلق دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو اس مرحلہ سے گزرنا پڑا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس سیدنا یونس علیہ السلام کے واقعہ سے، جو اوپر ہم نے بیان کیا ہے،

یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہجرت کو ناپسند فرمایا اور اس دعوت سے ان کی پوری قوم مسلمان ہو گئی۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کو رسولوں کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

دوسری بات یہ یاد رکھیے کہ ہر نقل مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت صرف وہی ہے جب کوئی شخص دعوت کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد اپنے دین و ایمان کے بچانے کے لیے اپنا گھر در اور اپنی قوم کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کرے جہاں اس کو توقع ہو کہ وہ اپنے مشن کے ساتھ زندگی بسر کر سکے گا۔ ایک مہاجر اور ایک پناہ گزیں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ پناہ گزیں کا معاملہ آسان ہے۔ وہ صرف اپنی جان اور ناموس کا تحفظ چاہتا ہے، اس وجہ سے اس کو پناہ دینے والوں پر کوئی بڑی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ایک مہاجر جہاں بھی بیٹھتا ہے اپنے مشن کے ساتھ بیٹھتا ہے، اس وجہ سے جو اس کی پذیرائی کا شرف حاصل کرتے ہیں ان کو بالواسطہ اس کے مشن کا بھی خیر مقدم کرنا پڑتا ہے اور یہ جانتے ہوئے کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی مرحلہ میں بھی اپنے مشن کے باب میں کسی سمجھوتہ پر راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اگر یہ کسی مداہنت پر راضی ہونے والا ہوتا تو اپنا گھر در کیوں چھوڑتا، پھر تو کچھ نرم گرم معاملہ کر کے وہیں گزر بسر کرتا؟ لیکن جب مشن ہی کے لیے اس نے سب کو چھوڑا ہے تو اس کی خاطر تو وہ سب کو چھوڑ سکتا ہے، لیکن مشن سے دستبردار ہونے کی توقع تو اس سے نہیں کی جا سکتی۔ اس کو مختصر لفظوں میں یوں سمجھیے کہ مہاجر کی ہجرت اپنے رب کی طرف ہوتی ہے، جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہے: اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ط (العنکبوت ۲۹:۲۶) (میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔) اس وجہ سے اس کو صرف اسی کی پروا ہوتی ہے۔ لوگوں کی طرف اس کی ہجرت نہیں ہوتی کہ وہ ان کے رویہ کو کچھ زیادہ اہمیت دے۔

مرحلۂ جہاد

دعوت اور ہجرت کے مراحل سے گزرنے کے بعد جہاد اور جنگ کا مرحلہ آتا ہے۔ اس وقت ایک طرف تو قوم پر حجت تمام ہو جاتی ہے، اس کے اندر جتنا کھن ہوتا ہے وہ الگ ہو چکا ہوتا ہے،

صرف چھاچھ رہ جاتا ہے، دوسری طرف داعی کو یہ ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب تک کی جدوجہد سے دعوت کی راہ میں جان کی بازی کھیلنے والی کتنی سعید روحیں اس کے اردگرد اکٹھی ہوئی ہیں، ان کے اوپر کس حد تک بھروسا کیا جا سکتا ہے اور ان کی مجموعی طاقت کے بل پر آگے کیا قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایک داعی جب تک صرف وعظ کرتا ہے اس وقت تک تو اس کو صرف زبان کی قوت، کسی مسجد کا منبر اور سامعین کی ایک منتشر بھیڑ کافی ہے، لیکن اگر وہ جہاد کے لیے اٹھنے کا حوصلہ کرتا ہے تو چند اور چیزیں بھی درکار ہیں: ایک آزاد علاقہ جس میں وہ با اختیار ہو اور ایک آزاد اور منظم جماعت جس پر اس کا اقتدار حاکمانہ ہو اور جس کو وہ اس قسم کی فوجی ٹریننگ دینے کا اہتمام کر سکتا ہو جو اس زمانے میں کارآمد ہو سکے۔ جہاد سے مراد وہ ہڑبونگ نہیں جس کا منصوبہ آجکل بعض جہادی پمفلٹوں میں پیش کیا جاتا ہے کہ سمع وطاعت کے پابند مریدوں کو حکم دیا جائے گا اور وہ بیلچوں اور لٹھوں سے مسلح ہو کر کسی بنک یا سنیما یا ہوٹل پر چڑھ دوڑیں گے۔ ان طالع آزماؤں کو اس طرح کے جہاد کا موقع شاید ایک آدھ بار مل جائے، لیکن اس کے نتائج ان طفلانہ حرکتوں کے نتائج سے مختلف نہیں ہو سکتے جو ماضی قریب میں کی گئیں اور آج بھی درس آموزی کے لیے کافی ہیں۔ ہم یہاں اپنی ایک تحریر کا اقتباس (دعوت دین اور اس کا طریق کار: باب ۱۴) شرائط جہاد سے متعلق پیش کرتے ہیں تاکہ جو لوگ جہاد کو بچوں کا کھیل سمجھے ہوئے ہیں وہ چاہیں تو اپنی اصلاح کر لیں:

دعوت حق کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت اس وقت آتی ہے جب تبلیغ اور شہادت علی الناس اور ہجرت کے مرحلے گزر چکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی جنگ کے لیے چند ضروری شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہو لیں اہل حق کے لیے تلوار اٹھانا اور زمین میں خون ریزی کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر وہ جلد بازی سے ایسا کر بیٹھیں تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہو گا جس پر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر وثواب پانا تو الگ رہا الٹا اندیشہ اس بات کا ہے کہ ان سے مواخذہ ہو جائے اور فساد فی الارض کے مجرم قرار پائیں۔

یہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے ان پر پہلے پوری طرح حق

کی تبلیغ کر دی جائے۔ اس تبلیغ کے بغیر کسی قوم کے خلاف اعلان جنگ ناجائز ہے۔ اس کلیہ سے صرف وہ جنگ مستثنیٰ ہے جو مدافعت وحفاظت میں ہو۔ دفاعی جنگ، ہر حالت میں لڑی جا سکتی ہے۔ اس کو افراد بھی لڑ سکتے ہیں اور جماعتیں بھی لڑ سکتی ہیں۔ یہ جنگ تبلیغ کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ جب بھی کسی کے جان ومال اور عزت پر کوئی حملہ ہو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی حفاظت میں جو قوت بھی اس کے پاس بروقت بہم ہو اس کو استعمال کرے۔ اس راہ میں اگر وہ مارا جائے گا تو اس کو شہادت حاصل ہو گی اور اگر حملہ آور حریف مارا جائے گا تو اس پر دوہرا گناہ ہو گا۔ ایک اس بات کا کہ اس نے اپنی جان ایک معصیت اور حق تلفی کی راہ میں ہلاک کی، دوسرا اس بات کا کہ اس نے ایک صاحب حق کی تلوار خون سے آلودہ کرائی۔ باقی رہی جارحانہ جنگ تو وہ اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک مقدم الذکر شرط تبلیغ پوری نہ ہو لے۔ لیکن اس تبلیغ کی دو صورتیں ہیں اور ان دونوں صورتوں میں جنگ کے احکام کی نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے:

۱۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ تبلیغ رسول کے ذریعہ سے ہو۔ رسول تبلیغ اور اتمام حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اتمام حجت کی تمام شرطیں کمال درجہ پوری ہو جاتی ہیں۔ اس عالم اسباب میں عقل انسانی کو مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ ممکن ہے وہ بہتر سے بہتر طریق پر ایک رسول پورا کر دیتا ہے اور اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ اس کو تمام اسباب و وسائل سے مسلح کر کے بھیجتا ہے۔ وہ قوم کے اندر کا بہترین شخص ہوتا ہے، اعلیٰ ترین حسب ونسب کے ساتھ اٹھتا ہے، وہ نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی پاکیزہ ترین اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جھوٹ، بہتان، مکاری، بدمعاملگی، ادعائے برتری اور خواہش تفوق کی آلودگیوں سے اس کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے اور اس کی ان خوبیوں کی شہادت جس طرح اس کے دوست دیتے ہیں اسی طرح اس کے دشمنوں کو بھی اس کے ان فضائل سے انکار کی مجال نہیں ہوتی۔ وہ بہترین، عام فہم زبان میں اپنی دعوت پیش کرتا ہے اور اس دعوت کو قوم کے بچے بچے تک پہنچا دینے کے لیے اپنے رات دن ایک کر دیتا ہے۔ اس

کی تعلیم عقلی استدلال کے اعتبار سے اتنی محکم اور مضبوط ہوتی ہے کہ مخالفوں سے اس کا جواب بن نہیں آتا، اس کے فیضِ تعلیم وصحبت سے لوگوں کی زندگیاں یکسر بدل جاتی ہیں۔ ظالم اور مفسد، حق شناس اور عدل پسند ہو جاتے ہیں، ڈاکو اور راہزن نیکوکار اور امن پسند بن جاتے ہیں، زانی اور بدمعاش عفیف اور پاک دامن بن جاتے ہیں، شرابی اور جواری، پاکیزہ اخلاق اور خدا ترس ہو جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو خود کر کے دکھاتا ہے اور جس قانون ونظام کا داعی ہوتا ہے اس کا سب سے زیادہ پابند ومطیع وہ خود ہوتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی حقیقت کا اپنے ساتھیوں کی زندگی میں بھی مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ، لوگوں کے مطالبہ پر، معجزے بھی دکھاتا ہے۔ ان تمام وجوہ سے ایک رسول کی تبلیغ اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہے اور جب کسی قوم پر رسول کے ذریعہ سے اتمام حجت ہو چکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بعد کسی قوم کے منکرین حق کو جینے کی مہلت نہیں دیا کرتا، بلکہ لازمی طور پر دو باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ہو کے رہتی ہے: اگر حق کو قبول کرنے والے تعداد میں تھوڑے ہوتے ہیں اور قوم کا بڑا حصہ منکر ومخالف رہ جاتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو الگ کر لیتا ہے اور منکرین ومخالفین کو کوئی ارضی وسماوی عذاب بھیج کر فنا کر دیتا ہے۔ حضرت نوح، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کی قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور اگر منکرین کی طرح مومنین کی تعداد بھی متعد بہ اور معقول ہوتی ہے تو اس صورت میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ منکرین کے خلاف اعلانِ جنگ کریں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک یہ منکرین توبہ کر کے خدا کے دین کو قبول نہ کر لیں یا ان کی نجاست سے خدا کی زمین پاک نہ ہو جائے۔ آنحضرت ﷺ کو اتمام حجت کے بعد بنی اسماعیل کے خلاف اسی قسم کی جنگ کے اعلان کا حکم دیا گیا۔

یہ قانون جس اصل پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے رسول اس کے قانون مکافات کے مظہر ہوتے ہیں، وہ زمین میں خدا کی عدالت بن کر آتے ہیں اور ان

کی بعثت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حق و باطل میں فیصلہ ہو جائے — اہل حق کامیاب وفائز المرام ہوں اور اہل باطل ناکام و نامراد ہوں۔ اور چونکہ اس طرح کی جزا وسزا کے لیے ضروری ہے کہ سزا پانے والوں پر خدا کی حجت پوری طرح تمام کر دی جائے اس وجہ سے رسول اتمام حجت کے شرائط کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں۔ یہ شرطیں جب پوری ہو جاتی ہیں تو خدا کا قانون ان لوگوں کو جینے کی مہلت نہیں دیتا جو نری ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کا انکار کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سزا چونکہ اس اتمام حجت کے بعد دی جاتی ہے جس کے بعد اس دنیا میں اتمام حجت کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا اس وجہ سے اس کو جبر واکراہ نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ یہ عدل وانصاف کا عین مقتضیٰ ہے۔ رسولوں کے ذریعہ سے اتمام حجت ہو چکنے کے بعد بھی جو لوگ اللہ کے دین کو قبول نہیں کرتے اور ان کے لیے اگر کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ غیب کے پردے اٹھا دیے جائیں اور ان کو تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا جائے، لیکن اس طرح کا کشفِ حجاب اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے خلاف ہے جو اس دنیا میں جاری ہے۔ اس دنیا میں ہم سے ایمان واسلام کا مطالبہ عقل و استدلال کی بنا پر کیا گیا ہے، نہ کہ مشاہدہ اور معائنہ کی بنا پر۔ اس وجہ سے عقل و استدلال کے لیے جو کچھ مطلوب ہے، جب رسولوں کے واسطے سے وہ مل چکتا ہے تو اس کے بعد مہلت ملنے کے کوئی معنی نہیں اور اس کے بعد سزا دینے میں جبر کا بھی کوئی پہلو نہیں ہے۔

ب۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ تبلیغ صالحین کے ذریعہ سے ہو۔ صالحین کے ذریعہ سے اس درجہ کا اتمام حجت ممکن نہیں ہے جس درجہ کا اتمام حجت رسولوں کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ نہ یہ ان اسباب ووسائل ہی سے پوری طرح بہرہ مند ہوتے جو رسولوں کے پاس ہوتے ہیں اور نہ ان کی ذہنی اور قلبی حالتیں ہی وہ ہو سکتی ہیں جو اللہ کے رسولوں کی خصوصیات میں سے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا شبہات اور بدگمانیوں سے اس درجہ

بالاتر ہونا بھی ناممکن ہے۔جس طرح اللہ کے یہ معصوم رسول ان چیزوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔اس وجہ سے یہ منکرین حق کے خلاف جو جنگ کرتے ہیں اس کی غایت صرف عدل اور امن کا قیام ہے۔ان کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو قبول نہ کریں ان سے جنگ کرکے ان کے ہاتھوں سے اس سیاسی طاقت کو چھین لیں جو ان کی بیماریوں کو دوسرے بندگان خدا تک متعدی کرسکتی ہے اور جتنے سے ان کا یہ مقصد پورا ہو جائے اسی حد پر ان کو رک جانا چاہیے۔اس حد سے آگے بڑھنے کی ان کو اجازت نہیں ہے۔اگر اس حدِ متعین سے ایک قدم بھی وہ تجاوز کر جائیں تو اس پر خدا کے ہاں وہ باز پرس کے مستحق ہوں گے۔اسی طرح کی جنگیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانوں میں ہوئیں۔صحابہؓ اپنی مخالف قوموں کے سامنے تین متبادل چیزیں پیش کیا کرتے تھے:ایک یہ کہ اسلام لاؤ اور اسلام لاکر ہر چیز میں ہمارے برابر کے شریک و سہیم بن جاؤ،دوسری یہ کہ اسلامی حکومت کی رعایا بن جاؤ اور ایک متعین ٹیکس ادا کرکے اپنے پرسنل لاء کے سوا تمام امور میں ہمارے نظم کی اطاعت کرو،تیسری یہ کہ ہمارے اعلان جنگ کو قبول کرو۔اس صورت میں اگرچہ یہ گمان ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی یہ تبلیغ نہایت اجمالی تھی اور وہ اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ دین حق کو لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرتے تھے جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ آنحضرت ﷺ نے پیش کیا تھا یا جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ اس کو اچھی طرح دل نشین کرنے کے لیے پیش کرنا ضروری ہے،لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔اصل یہ ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ میں ایک نظام حق عملاً قائم ہو چکا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے عہد دعوت میں موجود نہیں تھا اس وجہ سے صحابہؓ اسلام کی تفہیم کے لیے کسی تفصیلی تبلیغ سے مستغنی تھے۔ان کا قائم شدہ نظام حق خود اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور وہ بندگان خدا سے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔اس عملی نظام کی وجہ سے ہر حقیقت ان کے زمانہ میں نمایاں اور ہر بات واضح تھی۔عقیدہ ہو یا عمل،معاشرت ہو یا سیاست،ہر چیز ایک مکمل حیات

اجتماعی کے پیکر میں دنیا کی نگاہوں کے سامنے موجود تھی اور ہر شخص اس کو آنکھوں سے دیکھ کر یہ معلوم کرسکتا تھا کہ اسلام کا ظاہر و باطن کیا ہے اور وہ کن اعتبارات سے دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت رکھتا ہے اور کیوں اس کو حق حاصل ہے کہ وہ باقی رہے اور اس کے سوا دنیا کے سارے نظام مٹ جائیں۔اس طرح کا نظام جب بھی دنیا میں قائم و موجود ہو تو وہ اہل حق کو تفصیلی دعوت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دے گا اور مجرد اس کے قیام کی وجہ سے اہل حق کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ لوگوں سے اس کی اطاعت کا مطالبہ کریں اور اگر لوگ اس مطالبہ سے انکار کریں تو وہ ان سے جنگ کرکے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کریں۔اسلام،عدم اتمام حجت کی صورت میں،جو غیر رسل کی دعوت میں متصور ہے،لوگوں کے اس انفرادی حق کو تو تسلیم کرتا ہے کہ وہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں،لیکن وہ کسی گروہ کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کسی غیر عادلانہ نظام حیات کو لوگوں پر بجبر مسلط کرے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ جنگ صالحین کے ذریعہ سے لڑی جائے۔کیونکہ اسلامی جہاد دنیا کو فساد سے پاک کرنے کے لیے ہے،اس وجہ سے ان لوگوں کا جہاد کے لیے اٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا جو خود فساد سے آلودہ ہوں۔یہ کام صرف انہی لوگوں کے کرنے کا ہے اور وہی لوگ اس کو کرسکتے ہیں جو سو فی صد اس مقصد پر ایمان رکھتے ہوں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ایسے ہی لوگوں کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ تلوار اٹھائیں اور ان ہی لوگوں کی جنگ جهاد فی سبیل الله کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے۔یہ لوگ اگر اس راہ میں مارے جائیں تو شہید ہوتے ہیں اور اگر زندہ رہتے ہیں تو غازی اور مجاهد فی سبیل الله کے لقب کے مستحق ہیں۔جو لوگ اس حق و عدل پر ایمان نہ رکھتے ہوں،جس کے قیام کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے،ان کو اسلام ہرگز یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی ایک متنفس کا بھی خون بہائیں اور اگر وہ بہائیں گے تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا اور اس پر ان سے مواخذہ ہوگا۔اسلامی فوج کرایہ کے آدمیوں سے نہیں بنتی،بلکہ وہ ایسے لوگوں سے مرتب ہوتی ہے جو اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کی خاطر لڑتے مرتے ہیں۔

اسلامی نظام کی یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ صرف اپنے معتقدین ہی کے ذریعہ سے برپا ہو اور وہی لوگ اس کے برپا کرنے میں ساعی ہوں جو یہ سعی محض رضائے الٰہی کے حصول اور اقامتِ حق کی خاطر کریں، نہ کہ کسی دنیوی مفاد کی خاطر۔ اگر ان کی سعی میں حصول رضائے الٰہی اور اقامتِ حق کے پاک جذبہ کے سوا کوئی اور جذبہ شامل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ ان کی سعی کی اسلام کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ جو خون بھی اس سلسلہ میں انہوں نے بہایا ہے اس کا وبال ان کی گردن پر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں نے جہاد کے اعلان سے پہلے اس فرض کے لیے صالحین کی جماعت بنائی، کرایہ کے آدمیوں کی کوئی فوج نہیں مرتب کی۔ آنحضرت ﷺ کے غزوات کے سلسلہ میں بعض ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ ایسے لوگوں نے مسلمانوں کی حمایت میں لڑنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں، جو اسلام پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور محض قومی عصبیت کے تحت آنحضرت ﷺ کی امداد کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ نے ان کی پیشکش قبول نہیں فرمائی اور صاف فرما دیا کہ میں اس کام میں ان لوگوں کی مدد سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو اس مقصد پر ایمان نہ رکھتے ہوں جس مقصد کے لیے یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام نے جو غزوات کیے وہ تمام تر مومنین صالحین کے ذریعہ سے کیے۔

یہی بات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے کہ ان کے زمانوں میں جتنے بھی غزوات ہوئے، سب انہی لوگوں کے ذریعہ ہوئے جو اعتقاداً اور عملاً اس چیز کو تسلیم کرتے تھے جس کو برپا کرنے کے لیے انہوں نے تلوار اٹھائی تھی اور باوجودیکہ ان کے اثرات بہت وسیع تھے اور وہ چاہتے تو آسانی سے کرایہ کی فوج جمع کر لیتے، لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے کرایہ کی فوج نہیں بھرتی کی، بلکہ خود اپنی بھی کوئی تنخواہ دار مستقل فوج نہیں قائم کی۔ جب جنگ کی حالت پیش آجاتی تو ہر شخص اپنا توشہ اور اپنی سواری لے کر نکلتا اور محض اقامت دین کی خاطر جہاد کرتا اور احتیاط اور تقویٰ کی شان یہ تھی کہ عین اس وقت جبکہ دشمن سے رد و بدل ہو رہی ہوتی اگر کسی کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر جاتا کہ اس وقت حصول رضائے الٰہی کے جذبہ کے سوا کسی اور نفسانی جذبہ سے وہ مغلوب ہو گیا ہے تو فوراً ہی اپنی کھنچی ہوئی تلوار میان میں کر لیتا کہ مبادا یہ کسی انسان کا خون محض نفس کو خوش کرنے کے لیے بہا دے۔ اسلامی

حکومت کی غیر مسلم رعایا بعض حالات میں اسلامی جنگ میں حصہ لے سکتی ہے۔ لیکن اس کے شرائط و حالات بالکل خاص ہیں۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب اسلامی ریاست میں کی ہے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ ایک بااختیار اور بااقتدار امیر کی قیادت و امارت میں لڑی جائے۔ بااختیار و بااقتدار امیر سے مطلب یہ ہے کہ اس کا اقتدار اپنی جماعت پر بزورِ قوت قائم ہو، وہ لوگوں پر شریعت کے احکام نافذ کر کے اس کی اطاعت پر لوگوں کو مجبور کر سکتا ہو اور خدا کے سوا کسی اور بالاتر اقتدار کا وہ محکوم نہ ہو۔ اس شرط کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ انبیائے کرام میں سے کسی نے بھی اس وقت جہاد کا اعلان نہیں کیا جب تک انہوں نے ہجرت کر کے اپنی جماعت کو کسی آزاد علاقہ میں منظم نہیں کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے بھی اس چیز کا ثبوت ملتا ہے اور آنحضرت ﷺ کی زندگی سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے۔ بعد کے زمانوں میں بھی جن لوگوں نے انبیاء کے طریقہ پر یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی، مثلاً حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ، انہوں نے بھی اس امر کو پیش نظر رکھا اور ایک آزاد علاقہ میں پہنچ کر پہلے اپنی ایک بااختیار امارت بھی قائم کی اور اپنی جماعت کی تنظیم کر کے اس کے اندر شریعت کے تمام احکام و قوانین کا نفاذ بھی کیا۔

اس شرط کی دو وجہیں ہیں:

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی باطل نظام کے اختلال و انتشار کو بھی اس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک اس بات کا امکان نہ ہو کہ جو لوگ اس باطل نظام کو درہم برہم کر رہے ہیں وہ اس کی جگہ پر کوئی نظامِ حق قائم بھی کر سکیں گے۔ انارکی اور بے نظمی کی حالت ایک غیر فطری حالت ہے، بلکہ انسانی فطرت سے اس قدر بعید ہے کہ ایک غیر عادلانہ نظام بھی اس کے مقابل میں قابل ترجیح ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی جماعت کو جنگ چھیڑنے کا اختیار نہیں دیا ہے جو بالکل مبہم اور مجہول ہو، جس کی قوت و استطاعت غیر معلوم اور مشتبہ ہو، جس پر کسی ایک بااختیار امیر کا اقتدار قائم نہ ہو، جس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان نہ ہوا ہو، جس

کے افراد منتشر اور پراگندہ ہوں، جو کسی نظام کو درہم برہم تو کر سکتے ہوں، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت انہوں نے بہم نہ پہنچایا ہو کہ وہ کسی انتشار کو مجتمع بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اعتماد صرف ایک ایسی جماعت ہی پر کیا جا سکتا ہے جس نے بالفعل ایک سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر لی ہو اور جو اپنے دائرہ کے اندر ایک ایسا ضبط و نظم رکھتی ہو کہ اس پر الجماعت کا اطلاق ہو سکے۔ اس حیثیت کے حاصل ہونے سے پہلے کسی جماعت کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ الجماعت بننے کے لیے جدوجہد کرے اور اس کی یہ جدوجہد جہاد ہی کے حکم میں ہوگی، لیکن اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عملاً جہاد بالسیف اور قتال کے لیے اقدام شروع کر دے۔

ب۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی جنگ کرنے والی جماعت کو انسانوں کے جان و مال پر جو اختیار حاصل ہو جایا کرتا ہے وہ ایسا غیر معمولی اور اہم ہے کہ کوئی ایسی جماعت اس کو سنبھال ہی نہیں سکتی جس کے لیڈر کا اقتدار اس کے اوپر محض اخلاقی قسم کا ہو۔ اخلاقی اقتدار اس امر کی کافی ضمانت نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے فساد فی الارض کو روک سکے۔ اس وجہ سے مجرد اخلاقی اقتدار کے اعتماد پر کسی اسلامی لیڈر کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دے دے، ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ جب ایک مرتبہ ان کی تلوار چمک جائے گی تو وہ حلال و حرام کی حدود کی پابند نہیں رہے گی اور ان کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہو جائے گا جس کے مٹانے ہی کے لیے اس نے تلوار اٹھائی ہے۔ عام انقلابی جماعتیں، جو مجرد ایک انقلاب برپا کرنا چاہتی ہیں اور جن کا مطمحِ نظر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ قائم شدہ نظام کو درہم برہم کر کے برسر اقتدار پارٹی کے اقتدار کو مٹائیں اور اس کی جگہ اپنا اقتدار جمائیں، اس قسم کی بازیاں کھیلتی ہیں اور کھیل سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک، نہ کسی نظم کا اختلال کوئی حادثہ ہے نہ کسی ظلم کا ارتکاب کوئی معصیت، اس وجہ سے ان کے لیے سب کچھ مباح ہے۔ لیکن ایک عادل اور حق پسند جماعت کے لیڈروں کو لازماً یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ جس نظم سے وہ خدا کے بندوں کو محروم کر رہے ہیں اس سے بہتر نظم ان کے واسطے مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں اور جس ظلم کے

مٹانے کے وہ درپے ہیں اس قسم کے مظالم سے اپنے آدمیوں کو بھی روکنے پر وہ پوری طرح قادر ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ محض اتفاقات کے اعتماد پر وہ لوگوں کے جان و مال کے ساتھ بازیاں کھیلیں اور جس فساد کو مٹانے کے لیے اٹھے ہیں اس سے بڑا فساد خود برپا کرا دیں۔

(۴) چوتھی شرط حصول قوت ہے۔ لیکن صالحین کی جماعت کو اس کے لیے کوئی علیحدہ اہتمام کرنا نہیں پڑتا۔ اوپر جو تین شرطیں بیان ہوئی ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک پورے کر دینے سے ضروری قوت خود بخود بہم ہو جاتی ہے۔ ایک صحیح دعوت ہر قوت و استعداد کے آدمیوں کو اپنے ارد گرد مجتمع کر لیتی ہے اور ان کے واسطے سے سرمایہ بھی بہم ہو جاتا ہے اور ضروری وسائل کار یا ان کے پیدا کرنے کی قابلیتیں بھی فراہم ہو جاتی ہیں۔ پھر جب یہ جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک آزاد ماحول میں اپنے آپ کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ایک بااقتدار امیر کی اطاعت پر جمع کر لیتے ہیں تو ان کی اخلاقی اور معنوی قوت بھی دو چند ہو جاتی ہے اور مادی وسائل کے فراہم کرنے اور پیدا کرنے کے امکانات بھی وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ پس جہاں تک حصول طاقت کی سعی کا تعلق ہے وہ فی الحقیقت ان شرائط کی تکمیل کے اندر ہی مضمر ہے۔ اس سے علیحدہ اس کے لیے کسی خاص مہم کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاہم جارحانہ جنگ کے لیے قوت کی فراہمی بھی ایک ضروری شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی جماعت جنگ کا اعلان کر دے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی مجرم ہوگی۔

ان تمام شرائط کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ کسی دعوت حق کے سلسلہ میں جنگ کا مرحلہ شہادت علی الناس اور ہجرت کے بعد کیوں آتا ہے۔ درحقیقت ان دونوں مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی وہ لوگ متعین ہو کر سامنے آتے ہیں جن سے اسلام میں جنگ جائز ہے اور ان مراحل سے گزر چکنے کے بعد ہی وہ جماعت بھی صحیح معنوں میں وجود میں آتی ہے جس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ تلوار کے زور سے امن و عدل کرے۔ جو لوگ انبیائے کرام کی اس ترتیب کار سے واقف نہیں ہیں اور صرف عام انقلابی جماعتوں کے طریق کار ہی سے متاثر ہیں ان کو ان تمام مراحل کے فوائد اور نتائج پر غور کرنا چاہیے۔

باب ۳۶

آدمی کا تعلق ریاست سے

انسان کو جو برکتیں معاشرہ سے حاصل ہوتی ہیں ان میں سے ایک بہت بڑی برکت یہ ہے کہ معاشرہ اپنی اجتماعی تنظیم کی قوت اور اس کے زور واثر سے اس کو باہمی تعدیوں سے بھی محفوظ رکھتا ہے اور باہر سے کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو اس سے بھی اس کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیز انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ تحفظ اس کو حاصل نہ ہوتو وہ ہروقت اندرونی اور بیرونی خطروں میں گھرا رہے گا جس سے اس کی معاش ومعیشت اور تعمیر وتمدن کی رہنما اعلیٰ صلاحیتیں دب دبا کر ختم ہو جائیں گی جو اس کے اندر ودیعت ہیں۔

انسان نے اپنی اس فطری ضرورت کے تقاضوں سے، شروع ہی سے جب سے اس کی تاریخ کا کچھ سراغ ملتا ہے، جس طرح ایک اجتماعیت پسند حیوان (SOCIAL ANIMAL) کی زندگی پسند کی ہے اسی طرح ایک سیاسی مخلوق (POLITICAL BEING) کی زندگی کا بھی پورا التزام رکھا ہے۔ اس کی تاریخ کا کوئی دور بھی ایسا نظر نہیں آتا ہے جب وہ حکومت سے بالکل بے نیاز رہا ہو، عام اس سے کہ یہ حکومت پدرسرانہ قسم کی رہی ہے یا قبائلی نوعیت کی، آمرانہ طرز کی رہی ہے یا رضا کارانہ مزاج کی، بہرحال کسی نہ کسی کا سیاسی نظام اس نے ضرور اختیار کیا ہے، اس کو اپنے قیام و بقا اور تعمیر وترقی کے لیے ضروری ولازمی جانا ہے اور اس کے فوائد سے بہرہ مند ہوتے رہنے کے لیے جن قربانیوں کا حالات نے مطالبہ کیا ہے وہ بھی اس نے بڑی فیاضی سے پیش کی ہیں۔

اس وقت ہم حکومت کے فلسفہ اور اس کے نظام پر کوئی گفتگو کرنی نہیں چاہتے، خاص اس موضوع پر اسلامی ریاست کے عنوان سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ یہاں ہمارے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ ایک مسلم کی حیثیت سے ہمارا تعلق اس ریاست سے کس نوعیت کا ہونا چاہیے جس کے ہم شہری ہیں؟

حکومت کی مختلف قسمیں اوران کے احکام

اس سوال کے صحیح جواب کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیجیے کہ اس دور میں کس نوعیت کی حکومتوں سے آپ کو سابقہ پیش آسکتا ہے۔ اس کے بعد یہ معین کرنے میں آسانی ہوگی کہ ایک مسلم کی حیثیت سے ان میں سے کس کے ساتھ، آپ کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

ایک شکل تو یہ ہوسکتی ہے کہ حکومت غیر مسلموں کی ہو۔ آئین اور قانون غیر اسلامی ہو، لیکن پرسنل لاء کے حد تک، ایک اقلیت کی حیثیت سے آپ کے حقوق محفوظ ہوں، دین کی تبلیغ ودعوت کی اجازت ہو اور اگر کوئی شخص آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر اس کو قبول کر لے تو اس کو ظلم وستم کا نشانہ نہ بنایا جاتا ہو۔

دوسری شکل یہ ہے کہ حکومت غیر مسلموں کی یا نام نہاد مسلمانوں کی ہو، لیکن اس میں ایک خاص غیر اسلامی نظریہ حیات کے سوا کسی اور نظریہ یا عقیدہ کی دعوت واشاعت ممنوع ہو اور اگر کوئی اس کی جرأت کرے تو اس کو مستحق سزا سمجھا جاتا ہو۔

تیسری شکل یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی ہو، لیکن آئین وقانون جاہلیت اور اسلام دونوں کا مغلوبہ ہو، زبانوں پر نعرہ اسلام کا ہو لیکن عمل میں ایک قدم اسلام کی طرف اٹھتا ہو تو دوسرا قدم جاہلیت کی طرف بھی بڑھتا ہو۔

چوتھی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ حکومت ظاہر اور باطن دونوں میں اسلامی ہو، آئین وقانون کتاب وسنت پر مبنی ہو، حکومت کے چلانے والے قولاً وعملاً مسلمان ہوں اگرچہ اشخاص اور نظام دونوں میں بعض اعتبارات سے خامیاں بھی ہوں۔

ان چاروں قسموں کی حکومتوں کے معاملہ میں آپ کا رویہ اگر کلیتہً نہیں تو فی الجملہ الگ الگ

ہوگا۔ اب ہم اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلی قسم کی حکومت

پہلی قسم کی حکومت ایک غیر مسلم حکومت ہونے کے پہلو سے اگرچہ ایک مسلمان کے عقیدہ اور مسلک سے متصادم ہے اس وجہ سے جو مسلمان اس کے اقتدار کے زیر اثر زندگی بسر کریں گے ان کے لیے اپنے عقیدہ و مسلک اور اپنی تہذیب و روایات کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ صرف مذہب اور روایات ہی کے پہلو سے بھی یہ صورت کسی طرح ان کے لیے سازگار نہیں ہے۔ یہ چیز جب بھی گوارا کی جائے گی بدرجہ مجبوری ہی گوارا کی جائے گی۔ بس اتنی بات غنیمت ہے کہ سیکولر ہونے کے سبب سے توقع ہے کہ کم از کم ذاتی عقیدہ و مذہب کے معاملہ میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اگر یہ چیز حاصل ہو تو ایک مسلمان ایسی غیر مسلم حکومت کا وفادار شہری رہ سکتا ہے۔ اس کی وفاداری کی مثال ویسی ہی ہوگی جس کا ذکر ہم پیچھے ماں باپ کے حقوق والے باب میں کر چکے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص خود مسلمان ہو، لیکن اس کے ماں باپ غیر مسلم ہوں تو وہ دنیوی معاملات کے حد تک ان کا وفادار رہے گا، البتہ اپنے دین کے معاملہ میں ان کی مداخلت گوارا نہیں کرے گا۔

اس زمانے کی ترقی یافتہ جمہوری حکومتوں میں بالعموم آدمی کو اپنے دین و عقیدہ کی تبلیغ و دعوت کی بھی آزادی ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس کی دعوت قبول کر کے دین و عقیدہ میں اس کا شریک بن جاتا ہے تو اس کی راہ میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی۔ اگر یہ آزادی کسی ریاست میں حاصل ہے تو ایک مسلمان اس کے اندر اپنا دینی فریضہ شہادت حق ادا کر سکتا ہے اور اس طرح کے ماحول میں اس کے اوپر دین کی اس سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

یہ بات یہاں یاد رکھیے کہ ایک مسلمان سے اسلام کا اصل مطالبہ صرف یہی ہے کہ وہ جہاں رہے حق کی شہادت دیتا رہے۔ اگر یہ کام وہ کر رہا ہے تو وہ اپنا اصل ملی فریضہ جو اس پر وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ۔۲:۱۴۳) (اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی

دینے والے ہو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔) کی رو سے عائد ہوتا ہے، ادا کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ اسلام نے اس کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔

اس زمانے میں دین سے بعض بے خبر مدعیوں نے اسلامی حکومت کے قیام کے جوش میں منتشر افراد اور ایک منظم معاشرہ کی ذمہ داریوں میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ متفرق افراد سے انہوں نے اسلامی حکومت قائم کرنے کا عہد لینا شروع کر دیا حالانکہ متفرق افراد اپنے دائرہ میں صرف دعوت دین اور شہادت حق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر یہ کام وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق کر رہے ہیں تو وہ عنداللہ اس امر کے لیے مسئول نہیں ہوں گے کہ انہوں نے حکومتِ اسلامیہ کا نعرہ لگانے والوں کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ اسلامی حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری اس منظم معاشرہ پر عائد ہوتی ہے جو کسی خطہ میں یہ پوزیشن حاصل کر چکا ہو کہ اس میں، اپنی صواب دید کے مطابق، قانون نافذ کر سکے۔ سورہ حج میں ایک منظم اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

> اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (الحج۔۲۲:۴۱)
>
> یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

مسلمانوں کے سامنے یہ پروگرام اس وقت رکھا گیا ہے جب فتح مکہ کی منزل نظر آنے لگی ہے۔ اس سے پہلے کی زندگی میں ان کو جن مراحل سے گزرنا پڑا ان کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے، لیکن ہمارے اس دور کے غازیوں کو اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو جن لوگوں کو بے وقوف بنانا ہے ان کے لیے اس خشک اور صبر آزما پروگرام میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔ وہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ پہلا ہی قدم یا تو بیعت رضوان سے اٹھاتے ہیں یا فتح مکہ سے!

جن لوگوں کو اجتماعیات کا کچھ تجربہ ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ جو جماعت قوم کی اجتماعی اصلاح کے منصوبہ کے ساتھ اٹھے اس کی کامیابی کے لیے سب سے مقدم شے یہ ہے کہ اس کا عملی پروگرام اس کی جماعتی قوت وصلاحیت کے بالکل ہم وزن ہو۔ جس کی قوت صرف سیر بھر بوجھ اٹھا سکتی ہو اس کے اوپر من بھر بوجھ لاد دینا پرلے سرے کی حماقت ہے۔ جو لوگ دین اور دیانت دونوں سے عاری ہوتے ہیں، ممکن ہے اس طرح وہ اپنے بعض ذاتی مقاصد پورے کر لیتے ہوں، لیکن اس قسم کے اصحاب الاغراض کے ہاتھوں اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔

دوسری قسم کی حکومت

دوسری قسم کی حکومت، خواہ غیر مسلموں کی ہو یا نام نہاد مسلمانوں کی، ایک مسلمان کے دین و ایمان کے لیے اس عہد کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس نظام کے بانیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ان کے نظام کے قیام واستحکام کے لیے ہر قسم کے دین کی بیخ کنی لازمی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ تجزیہ بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ اشتراکیت کے ساتھ دہریت کے سوا اور کسی دین کا جوڑ نہیں ہے۔ اب اگرچہ یہ نمائش کرنے کی سعی کی جا رہی ہے کہ دنیا کی دوسری حکومتوں کی طرح ان کی حکومت میں بھی ہر شخص کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت ہے، لیکن وہ جو ذہنی تطہیر (BRAIN WASHING) کرتے ہیں اس کے بعد آدمی کے اندر اتنی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی کہ رسوم کی ادائیگی اس کے لیے کچھ نافع ہو سکے۔

سب سے زیادہ غم اور افسوس یہ ہے کہ جن نام نہاد مسلمانوں نے اس نئے دین کو اختیار کر لیا ہے ان کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دین کے اس کے اصل بانیوں سے بھی زیادہ وفادار ہیں۔ انہوں نے اس کی خاطر خود اپنے بھائیوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں شاید دوسرے اس سے زیادہ ظلم نہ ڈھا سکتے۔ اب ان کے ظلم سے بچنے کی بظاہر واحد راہ یہی باقی رہ گئی ہے کہ آدمی اپنا گھر در چھوڑ کر کسی دوسرے علاقہ کو ہجرت کر جائے، لیکن اس کڑے امتحان سے گزرنے کا کوئی حوصلہ کر بھی لے تو اس زمانے میں اس سے بھی زیادہ مشکل سوال یہ ہے کہ:

جو ہجرت کر کے بھی جائیں　　تو شبلی اب کہاں جائیں

تاہم جو ممالک اب اشتراکیت کے نرغے میں آ چکے ہیں ان کے اندر کے مسلمانوں کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ گئی ہیں: یا تو ارتداد کی راہ اختیار کریں یا جہاد اور ہجرت کی۔ پہلی راہ اختیار کرنے کا مشورہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو نہیں دے سکتا۔ زندگی کتنی ہی عزیز سہی، لیکن ایمان سے زیادہ عزیز نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی مسلمان کے سامنے یہ سوال آ جائے کہ وہ ایمان اور زندگی میں سے کس کو اختیار کرے اور کس کو چھوڑے تو اس کی سعادت دارین اس میں ہے کہ وہ زندگی کو قربان کر کے اپنے ایمان کو بچائے۔ رہا ہجرت اور جہاد کا معاملہ تو اس کا تعلق حالات اور مواقع سے ہے اور اس پر غور کرنا، رہنمائی دینا اور اس کے اسباب ووسائل فراہم کرنا ان مسلمان حکومتوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اشتراکیت کی یلغار سے محفوظ ہیں۔ ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ باہمی تعاون سے اس مسئلہ کا حل سوچیں اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے جرأت کے ساتھ اقدام کریں۔ اب اس میں تغافل کی پالیسی مہلک اور تاخیر خودکشی ہوگی۔ اشتراکیت کے زیر اقتدار پھنسے ہوئے مسلمانوں کا معاملہ اگر انہی پر چھوڑ دیا گیا، اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کی طرف سے ان کو کوئی سہارا ملنے کی توقع نہ ہوئی تو پھر وہ اس ماحول میں یا تو تحلیل ہو جائیں گے یا گھٹ کر فنا ہو جائیں گے اور اس پالیسی کا انجام بالآخر یہ ہوگا کہ بہت جلد وہ علاقے بھی اس سیلاب کی زد میں آ جائیں گے جو بظاہر ابھی محفوظ ہیں۔

تیسری قسم کی حکومت

تیسری قسم کی حکومت کی سب سے نمایاں مثال خود ہمارے ملک کی حکومت ہے۔ اس اعتبار سے تو یہ بساغنیمت ہے کہ اس کا آغاز اسلام کے نعرہ سے ہوا ہے اور یہ نعرہ ابتدا سے لے کر اب تک برابر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ جتنی پارٹیاں اور جتنے لیڈر اس کی سیاست کے میدان میں اترے ہیں سب نے کسی نہ کسی نوعیت سے اس نعرے کا سہارا ضرور لیا ہے۔ اس کے بغیر کسی نے میدان میں اترنے کا حوصلہ نہیں کیا ہے۔

اس ملک کی تاریخ کا یہ پہلو ان لوگوں کے لیے بہت ہی حوصلہ افزا ہے جو اس کو ایک حقیقی اسلامی ریاست کی شکل میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اس تمنا کے بروئے کار آنے کے لیے ضروری

ہے کہ اس راہ میں جو مشکلات حائل ہیں ان کا صحیح صحیح اندازہ کرلیا جائے تاکہ اس کے لیے اس نہج پر کوشش کی جائے جو نتیجہ خیز ہو۔

ہم یہاں چند حقائق کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو اگر چہ بعض لوگوں کو تلخ محسوس ہوں گے، لیکن ان کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا گیا تو اندیشہ ہے کہ جس طرح یہ نعرہ اب تک صرف ایک نعرہ ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وہ اس طرح ممکن ہے کہ کچھ دنوں اور بھی باقی رہے، لیکن بالآخر یہ بالکل بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہماری قوم کی زبان پر اسلام، اسلام کی رٹ تو بہت ہے، لیکن اسلام کا شعور بالکل نہیں ہے۔ اس معاملہ میں عوام اور خواص سب یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈر، جو بڑی بلند آہنگی سے اسلام کا نعرہ بھی بلند کرتے رہے ہیں، صاف صاف کہتے ہیں کہ ہم اور ہمارے باپ دادا صدیوں سے اسلام پر چلے آرہے ہیں۔ اب اس طریقہ کے سوا اسلام اور کیا ہے جو اس ملک میں لایا جارہا ہے۔ یہ لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ یہ مسلمان ہیں اس وجہ سے یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ سے آپ اسلامی بن جاتا ہے، اس کے اسلامی ہونے کے لیے کسی اور سند کی ضرورت نہیں ہے:

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

ان لوگوں کو یہ گھمنڈ بھی ہے کہ انہی کے آباء و اجداد کے واسطہ سے اس ملک کے لوگوں کو دین ملا ہے تو ان کے سوا کوئی دوسرا اس بات کا اہل کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کو دین سکھانے کے لیے اٹھے!

ارباب اقتدار کی طرف سے اسلامائزیشن کے پروگرام نے اس زمانے میں ایک اور غلط فہمی، شدید قسم کی، خاص طور پر ان کے سیاسی حریفوں کے اندر، یہ بھی پیدا کر دی ہے کہ اسلام، اسلام کا نعرہ محض اپنے اقتدار کے تحفظ اور عوام فریبی کے لیے لگایا جارہا ہے، اس کے اندر اخلاص اور صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس خیال نے اس زمانے میں بہت سے لوگوں کے

اندر دین بیزاری کی ایک کیفیت پیدا کر دی ہے جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی گئی تھی۔

جہاں تک ملک کے عوام کا تعلق ہے، ان کے دینی جوش کے بعض وقتی مظاہروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ فی الواقع یہ کسی حقیقی دینی محرک ہی کے تحت ظہور میں آئے، بلکہ ان کا صحیح طور پر تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی دین سے زیادہ دوسرے عوامل کا دخل رہا ہے، لیکن ان کو پس پردہ ہی رکھنے میں مصلحت سمجھی گئی۔ اول تو عوام کی اکثریت اپنے پیٹ اور تن کے مسائل میں اس طرح الجھی ہوئی ہے کہ اس کو کسی سیاسی یا مذہبی مسئلہ پر غور کرنے یا اس میں حصہ لینے کی سرے سے فرصت ہی نہیں ہے اور اگر کچھ لوگوں کے اندر کچھ مذہبی رمق ہے تو وہ یا تو اپنے فرقہ کے مولویوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں یا اپنے حلقہ کے کسی پیر سے وابستہ ہیں۔ وہ اپنے دینی معاملات میں انہی کی آنکھوں سے دیکھتے اور انہی کے کانوں سے سنتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچ یا سمجھ سکیں۔

جنہوں نے کچھ تعلیم پائی ہے، عام اس سے کہ یہ تعلیم مذہبی ہے یا جدید دنیوی، ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان سے کسی خیر کی امید بظاہر ایک امید موہوم ہی ہے۔ مذہبی تعلیم پانے والوں کے متعلق اگر ہم یہ کہیں تو غالباً بے جانہ ہو کہ انہوں نے اسلام کی نہیں، بلکہ اپنے فرقہ کے دین کی تعلیم پائی ہے اور اسی کو وہ کفر اور اسلام کی کسوٹی بنائے ہوئے ہیں۔ اس سے الگ ہو کر ان کے لیے کچھ سوچنا ناممکن اور اس کو اختیار کرنا محال ہے۔ ان سے یہ اپیل کرنا کہ وہ اختلافی امور کو چھوڑ کر صرف مشترک امور پر تقریریں کریں اور خطبے دیں اپیل کرنے والوں کی بے خبری پر دلیل ہے۔ ان کے درمیان اشتراک اگر ہے تو چند اسماء میں ہے ان کے مسمی ان میں سے ہر ایک کے نزدیک بالکل الگ الگ ہیں۔ توحید، آخرت اور رسالت جیسے بنیادی مسائل میں بھی ایسے ایسے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں کہ ممکن نہیں رہا کہ مختلف فرقوں کے لوگ کسی ایک مسجد میں، ایک امام کے پیچھے، نماز پڑھ سکیں۔

ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ اس نے تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری کرنا سمجھ رکھا ہے اور وہ یہ کام نہایت وفاداری کے ساتھ کر رہی ہے۔ یہ نظام تعلیم انگریزوں نے اس مقصد سے قائم کیا تھا اور اب تک یہ، بلا کسی بنیادی ترمیم و اصلاح کے، اس مقصد کے لیے قائم

ہے، اس وجہ سے ان لوگوں کو ملامت نہیں کی جا سکتی جو اس مقصد کو وفاداری کے ساتھ پورا کر رہے ہیں۔ جب ان کو ایک آزاد قوم کی ذمہ داریوں، ایک امت مسلمہ کے فرائض اور شہداء اللہ علی الناس اور خلفاء اللہ فی الارض کا کوئی تصور سرے سے دیا ہی نہیں گیا تو آخر ان کے تقاضوں اور مطالبوں کا شعور ان کے اندر کہاں سے ابھرتا!

اس گروہ کے اندر جو لوگ ذہنی اعتبار سے ذرا اونچے ہوئے اور انہوں نے قوم کی صلاح اور فلاح کے کاموں میں کچھ حصہ لیا، چونکہ اسلام کے فکر و فلسفہ سے وہ بالکل محروم اور انگریزوں کی تہذیب و تعلیم سے نہایت مرعوب تھے، اس وجہ سے انہوں نے کھلم کھلا ہر شعبۂ زندگی میں انہی کے طور طریقے کی پیروی کی دعوت دی اور اگر یہ جرأت نہ کر سکے، بلکہ کچھ اسلام کی بھی لاج رکھنی چاہی، تو ان کی پھیلائی ہوئی ساری ضلالتوں کو اسلام کے نام سے قوم پر لاد دینے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اگر یہ کہا جائے کہ انگریزوں کے دور حکومت میں ہماری قوم ان کے سانچے میں اتنی نہیں ڈھلی تھی جتنی اب ڈھل گئی ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ اب جو صورتحال ہے اس کو پیش نظر رکھ کر بے تکلف یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے جب اقدار اور پیمانے اس طرح تبدیل ہو جائیں گے کہ ہمارے ملک کی اسمبلیوں کے انتخابات میں ہمارے بڑے بڑے علماء اور مشائخ اداکاروں اور اداکاراؤں سے شکست کھا جائیں گے اور اس قوم میں ایک شخص بھی ان پر ترس کھانے والا نہ ہوگا!

یہ ہم نے نہایت مختصر لفظوں میں اس معاشرے کی جو تصویر کھینچی ہے، اگر آپ بغیر کسی تعصب کے اس پر غور کریں گے تو ان شاء اللہ اس کو بالکل صحیح پائیں گے۔ اب آپ اس ملک کے ایک مسلمان اور فرض شناس شہری کی حیثیت سے غور کیجیے کہ آپ پر اس کو خطرات سے بچانے اور صحیح سمت میں اس کو آگے بڑھانے میں کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس سوال پر غور کرنے کی دعوت ہم اس وجہ سے دے رہے ہیں کہ بحیثیت ایک مسلمان کے آپ پر یہ فرض ہے کہ آپ اس سوال کا جواب معلوم کریں اور اس پر عمل کریں ورنہ آپ اپنے فرض سے تغافل برتنے والے ٹھہریں گے۔

اس سوال پر غور کرنے کی ذمہ داری ہر شخص پر ہے، خواہ وہ ملک کا ایک عام شہری ہے یا ایک با اقتدار و با اختیار حکمران۔ بلکہ ایک با اقتدار کے لیے دوسروں کی نسبت زیادہ ضروری ہے کہ وہ کوئی

قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچے کہ اس کے اقدام کے نتائج کیا کچھ ہو سکتے ہیں۔ ایک عام آدمی کی استطاعت محدود ہوتی ہے، اس وجہ سے اس کے کسی قول و فعل کے نتائج بھی محدود ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ایک با اقتدار اگر کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کے نتائج بہت دور رس ہو سکتے ہیں اگر خدانخواستہ اقدام غلط سمت میں ہے۔

ہمارے معاشرے کے متعلق اگر کوئی شخص یہ رائے قائم کرے کہ یہ اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے بالکل ہموار ہے تو میرے نزدیک اس سے زیادہ غلط رائے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اسلام کا نام تو بے شک اس قوم کو بہت محبوب ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کا اسلام ایک دوسرے کے اسلام سے اتنا مختلف ہو گیا ہے کہ ان کو ایک اسلام پر متفق کرنے میں ایک عظیم جدوجہد، بلکہ ایک عظیم جہاد کے مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ اس جہاد سے گزرے بغیر اگر زندگی کے بعض گوشوں میں کچھ قوانین شریعت — از قسم حدود و تعزیرات — نافذ کر دیے گئے تو ان کی مثال ان بدقسمت بیجوں کی ہوگی جو کسی شور اور ناہموار زمین میں پھینک دیے گئے ہوں۔ وہ ضائع تو بہرحال ہوں گے، لیکن ان کے ضائع ہونے سے بھی بڑا حادثہ ہوگا کہ اس سے اسلامی شریعت کے متعلق شدید قسم کی غلط فہمی پیدا ہوگی، بلکہ آئندہ کے لیے شاید اس کے نفاذ کا راستہ بھی مسدود ہو جائے۔

اس وقت کرنے کا اصلی کام یہ ہے کہ معاشرہ کی فکری ناہمواریوں کو دور کرنے کے لیے اس نصب العین کو سامنے رکھ کر ایک مہم چلائی جائے کہ اس کے اندر ایک امت مسلمہ بننے کا شعور بیدار ہو۔ یہ شعور بیدار کرنے کے لیے بڑی انقلابی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے ملک کے ہر شہری کو یہ بتانا اور سکھانا پڑے گا کہ ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے سوا اور کسی چیز کے پابند نہیں ہیں، ہمارے نزدیک حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی یہی ہیں، ان پر پرکھے بغیر کسی چیز کو اختیار کرنا ہمارے لیے جائز نہیں۔ قرآن کے متعلق لوگوں کی یہ عام غلط فہمی دور کرنی پڑے گی کہ یہ محض بطور تبرک تلاوت یا ایصال ثواب کی چیز ہے اور اس کے معانی و مطالب سے متعلق جو کچھ تفسیر کی مشہور کتابوں میں ہے بس وہی کافی ہے، اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی جگہ ذہنوں میں یہ عقیدہ راسخ کرنا پڑے گا کہ قرآن قیامت تک کے لیے، ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کرنے والا صحیفہ ہے اور اس کے

اندر حکمت و فلسفہ کے جو خزانے بند ہیں وہ کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ اس طرح لوگوں کو فرقہ وارانہ اور گروہی تعصبات سے آزاد کرنے کے لیے ان کو یہ سکھانا پڑے گا کہ ہماری فقہ کے تمام ائمہ ہم سب کے مشترک امام ہیں اور ان کے فقہی اجتہادات سب، بلا امتیاز و تفریق، ہمارا مشترک سرمایہ ہیں۔ ہمارے اصحاب علم کا فرض ہے کہ وہ اس پورے ذخیرہ کا بغیر کسی تعصب و تنگ نظری کے جائزہ لیں اور ان کے جن اجتہادات کو کتاب و سنت اور عقل و مصلحت سے اوفق پائیں ان کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے اختیار کریں اور دوسروں کو اختیار کرنے کا مشورہ دیں۔

ظاہر ہے کہ اس نصب العین کے حصول کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے تعلیمی اور تبلیغی نظام کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ موجودہ مدارس کو، خواہ وہ جدید ہیں یا قدیم، بالکل نئی بنیادوں پر استوار کیے بغیر اس راہ میں کوئی نتیجہ خیز کوشش نہیں ہوگی۔ ان اداروں کو نیا نصب العین بھی دینا ہوگا، ان کے لیے مقصد کے مطابق نیا مواد تعلیم اور جدید نظام تربیت بھی فراہم کرنا ہوگا اور معلموں اور مربیوں کو نئے تصور تعلیم و تربیت سے آشنا اور مانوس بھی کرنا ہوگا اور ان سب کاموں سے کٹھن کام یہ ہوگا کہ اس کی مزاحمت کے لیے جو عناصر سر اٹھائیں گے، خواہ اندر کے ہوں یا باہر کے، ان سے بہر حال نمٹنا ہوگا، تدبر اور تدبیر سے بھی اور حالات مجبور کر دیں تو طاقت سے بھی۔

یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم و تربیت کے نظام میں جو دو عملی، بلکہ صحیح لفظوں میں جو بد عملی پائی جاتی ہے وہ یک قلم ختم کر دی جائے۔ صرف ایک نظام تعلیم ہو جو شهداء الله فی الارض کی ایک امت تیار کرنے کے نصب العین کو سامنے رکھ کر ہر شعبہ تعلیم کی نگرانی کرے۔ جدید دور کے تمام اعلیٰ علوم کے ساتھ اعلیٰ عربی زبان اور قرآن و حدیث اور اسلامی فقہ اور قرآنی حکمت و فلسفہ کی تعلیم کا ایسا بندوبست کیا جائے کہ ہمارے نوجوان نہ دنیا کے علوم میں کسی احساس کمتری کا شکار ہوں نہ اپنے دین کے معاملہ میں۔

ٹی وی کو اگر تعلیم و تبلیغ کے لیے خاص کیا جا سکے تو اس کی بڑی افادیت ہے۔ لیکن اگر یہ ناممکن ہے کہ اس کی اصلاح ہو سکے تو پھر بہتر ہے کہ اسلام کا نام نہ لیا جائے۔ اس کے موجودہ شکل میں ہوتے ہوئے ناممکن ہے کہ کوئی اسلامی جدوجہد کامیاب ہو سکے۔

ہمارے اخبارات، بالخصوص اردو اخبارات، کا حال بھی نہایت مایوس کن ہے۔ لیکن ان کی

اصلاح ناممکن نہیں ہے۔ اگر حکومت چاہے تو ایک دن میں ان کو شریفانہ روش اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ کسی جبر کے بغیر ہی درست ہو جائیں بشرطیکہ جو لوگ معاملات کے سربراہ کار ہیں وہ اپنے مذاق درست کر لیں۔

مساجد کے ائمہ کے ذریعہ سے جو فتنے لوگوں کے اندر پھیلتے ہیں ان کا سد باب فی الحال مشکل ہے۔ اس میں بے علمی کو بھی دخل ہے اور ان گروہی تعصبات کو بھی، جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ تعلیمی نظام کی اصلاح سے یہ خرابی دور ہو سکے گی۔

یہ ہم نے چند اصولی باتوں کی طرف اجمال کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ جو لوگ اس قوم اور حکومت کی خدمت سے متعلق اپنا فرض ادا کرنا چاہتے ہوں، خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہوں، وہ ان مقاصد کو لوگوں کے ذہنوں سے قریب لانے کے لیے جو کوشش بھی کریں گے وہ ان شاء اللہ اس کا اجر پائیں گے۔

چوتھی قسم کی حکومت

چوتھی قسم کی حکومت اصل آئیڈیل اسلامی حکومت ہے۔ یہی ہر مسلمان کا مطلوب و مقصود ہونی چاہیے۔ یہ اگر حاصل ہو تو اس کی خدمت و حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا مسلمان کے لیے سعادت دارین ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ نہ یہ کہیں بنی بنائی موجود ہے اور نہ آسانی سے بن سکتی ہے۔ تاہم یہ کوئی خیالی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ عملاً اس دنیا میں وجود پذیر ہو چکی ہے۔ صحیح نہج سے جدوجہد کی جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں ہے کہ وہ پھر اس کا جلوہ دکھا دے اور فرض کیجیے، یہ سعادت نہ بھی حاصل ہو سکے تو اس کے حصول کے لیے جدوجہد کی راہ اب بھی کھلی ہوئی ہے۔ ہم اس مبارک مقصد کے لیے جدوجہد کر کے اپنی پاکیزہ نیت کا ثواب تو حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ امر واضح رہے کہ اس مقصد کے لیے جدوجہد کا طریقہ بعینہٖ وہی ہے جو اس ریاست سے متعلق ہم نے بیان کیا ہے۔